NTA-NET/JRF

II Paper

نئے نصاب کے عین مطابق اپنی نوعیت کی منفرد اور پہلی کتاب

ضیائے اردو

ضیاء المصطفیٰ مصباحی

ناشر

آسی بک سینٹر، سیوان

پیش لفظ

'منار اردو' کی بے پناہ مقبولیت کے بعد نیٹ کے جدید نصاب کے عین مطابق دوسری نئی کتاب بنام ضیائے اردو قارئین کی بصارتوں کی نذر کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے اور یہ امید کرتا ہوں کہ اسے قارئین منار اردو سے زیادہ شرف قبولیت بخشیں گے اور نیٹ کی تیاری میں یہ کتاب ان کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوگی۔

'ضیائے اردو' نیٹ کے جدید نصاب کے مطابق دس یونٹ پر مشتمل ہے۔ پہلا یونٹ تاریخ زبان اردو کے شاہ سرخی کے ساتھ ہے جس کے تحت اس سرخی سے متعلق داخل نصاب موضوعات کی کئی ذیلی سرخیاں قائم کر کے ان پر مکمل مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے ہند آریائی کی مختصر تاریخ، پراکرت، اپ بھرنش، کھڑی بولی کے اوصاف، اردو کے بارے میں مختلف نظریات، اردو ساخت کی بنیادی عناصر اردو کی لسانی انفرادیت، اردو اور اس کی اہم بولیاں، دکنی اردو کی لسانی خصوصیات، لسانیات اور لسانیات کی شاخیں، صوتیات صرفیات، نحویات اور معنیات وغیرہ۔

دوسرا یونٹ 'اردو کی شعری اصناف' کے شاہ سرخی کے ساتھ ہے۔ اس کے تحت قصیدہ، مثنوی اور مرثیے کے فن اور ان کے آغاز و ارتقا کے تمام اہم نکات کو اجاگر کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ساتھ ہی اردو کے داخل نصاب اہم قصیدہ، مرثیہ اور مثنوی نگاروں کے حالات اور ان کے متعلق مختلف آرا و خیالات اور ان کے داخل نصاب قصائد، مراثی کے اصل متون اور مثنویوں کے تعارف، خلاصے اور

کرداروں کی وضاحت کی گئی ہے۔

تیسرے یونٹ کا عنوان اردو غزل ہے۔اس کے تحت غزل کے فن، اس کے آغاز اور ارتقا، اردو کے داخل نصاب اہم غزلوں کے حالات، ان کے متعلق ادبا کے خیالات اور ان کی داخل نصاب غزلوں کے اصل متون پیش کیے گئے ہیں۔

چوتھے یونٹ کا عنوان اردو نظم ہے اس میں نظم کی صنفی شناخت، اردو نظم نگاری کا آغاز و ارتقا، اردو کے اہم نظم نگاروں کے حالات اور ان کی داخل نصاب نظمیں دی گئی ہیں۔

پانچواں یونٹ اردو داستان اور ڈراما کے شاہ سرخی کے ساتھ ہے۔اس میں داستان اور ڈرامے کے فن اور ان کے آغاز و ارتقا، اردو کے اہم داستان اور ڈرامہ نگاروں کے حالات اور ان کے داخل نصاب داستانوں اور ڈراموں کے تعارف، خلاصہ اور کرداروں کی وضاحت کی گئی ہے۔

چھٹا یونٹ ناول اور افسانے پر مشتمل ہے۔اس میں ناول اور افسانے کا فن، ان کے آغاز و ارتقا، اردو کے اہم ناول اور افسانہ نگاروں کے حالات، ان کے متعلق اہم اقوال اور ان کے اہم اقوال اور داخل نصاب ناول اور افسانوں کے تعارف، خلاصہ اور کردار پیش کیے گئے ہیں۔

ساتواں یونٹ تنقید و تحقیق سے متعلق ہے۔اس میں تنقید و تحقیق کی تعریف اور ان کے متعلق اقوال، تذکروں کی تنقیدی اہمیت، مشرقی تصور تنقید، مغربی تصور نقد اور دبستان تنقید کے تمام اہم گوشوں کو روشن کرنے کی سعی کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، سنسکرت اور اردو کے داخل نصاب اہم ناقدین اور محققین کے حالات اور تنقیدی نظریات سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہے۔

آٹھواں یونٹ غیر افسانوی نثر کی سرخی کے ساتھ ہے۔ اس میں سوانح، خودنوشت، مکتوب، انشائیے، خاکے اور سفرنامے کے فن اور ان کے آغاز و ارتقا کے ساتھ ان اصناف کے اہم ادیبوں کے حالات اور ان کے داخل نصاب کاوشوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔علاوہ ازیں داخل نصاب انشائیے اور خاکے بھی شامل کتاب کیے گئے ہیں۔

یونٹ نمبر 9 میں اردو کے ادبی دبستان، ادارے اور تحریکات و رجحانات کا تعارف بالتفصیل قلم بند کیا گیا ہے۔

یونٹ نمبر 10 اردو کی دیگر شعری اور نثری اصناف اور ہیئتیں، ذرائع ابلاغ اور صنائع بدائع پر

مشتمل ہے۔

اس کتاب کی تکمیل پر تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے جس نے مجھ جیسے بے علم کو ایسے صبر آزما مہم کو سرانجام دینے کی توفیق بخشی اور ثابت قدم رکھا۔ اس کے بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام اساتذہ کا ممنون و مشکور ہوں خصوصاً صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہزاد انجم کا جو بروقت ہمیشہ صحیح رہنمائی فرماتے ہیں اور ہر مشکل گھڑی میں والدین کی طرح کھڑے رہتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی بھی تیاری میں نہ صرف اپنی ذاتی لائبریری سے کتابیں عطا کیں بلکہ ''ضیائے اردو'' سے متعلق سن کر خوشی کا اظہار فرمایا اور حوصلہ افزائی کی۔ اپنے پی ایچ۔ ڈی کے نگراں ماہر لسانیات پروفیسر عبدالرشید کا بے حد مشکور ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری میں نہ صرف لسانیات کے بنیادی مباحث سے آگاہ کیا بلکہ لسانیات سے متعلق مواد بھی فراہم کرایا۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر اس مقام پر میں اپنے دو اساتذہ پروفیسر احمد محفوظ اور پروفیسر کوثر مظہری کو فراموش کردوں۔ کیوں کہ کتاب کی ترتیب کے دوران کسی بھی موضوع کے متعلق راقم الحروف کو جو شکوک و شبہات ہوئے ان کا ازالہ انھیں اساتذہ نے کیا اور موضوع کے متعلق کتابوں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی لائبریریوں سے کتابیں بھی عطا کیں۔

یہاں دو اور اساتذہ کا ذکر نہایت ضروری ہے۔ پروفیسر عبدالستار لوک مہاودھیالے چھپرہ کا بھی ممنون و مشکور ہوں جن کی شفقتیں اور محبتیں بی۔ اے کے زمانے سے آج تک مجھ پر قائم ہے۔ ڈاکٹر سرورالہدیٰ کا جن کی توجہ، محنت، محبت اور ڈانٹ نے شعر فہمی اور کچھ پڑھنے لکھنے کا سلیقہ عطا کیا۔ استاد محترم ڈاکٹر ندیم احمد اور ڈاکٹر سید تنویر حسین کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تیاری کے دوران اپنے مضامین اور کتابوں سے نوازا۔ ان کے علاوہ شعبہ کے دیگر اساتذہ پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر شہپر رسول، ڈاکٹر خالد جاوید، ڈاکٹر عمران احمد عندلیب، ڈاکٹر خالد مبشر اور ڈاکٹر مشیر احمد کا شکریہ بھی واجب ہے کہ انھوں نے کسی نہ کسی طرح ہماری معاونت کی۔ خدا بخش لائبریری کے ڈاکٹر مسعود حسن، سینئر ساتھی معاذ احمد اور جامعہ اشرفیہ کے محتشم اور سرفراز مصباحی کی معاونت کا اعتراف بھی ضروری ہے جنھوں نے مواد کی فراہمی اور پروف ریڈنگ کا جاں گسل کام انجام دیا۔

ان کے علاوہ محمد اکرم، محمد حسنین مصباحی، دسیم علیمی، ساجد ذکی فہمی، سنبل فاطمہ حق، حنبل، کمال صفدر ہاشمی، عافر مظفر بھٹ، مجوفہ، تجل، علیم اسماعیل، منظر امن، ہلال، توفیق، شاہد اقبال اور

محمد حمزہ کا شکریہ جنھوں نے کسی نہ کسی درجے میں ہماری معاونت کی۔
اپنے دو بھائیوں مصطفیٰ قادری اور جیلانی کے لیے لفظ نہیں بس بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ انھیں شاد و آباد رکھے۔
اخیر میں اپنے والدین کے شکریہ کے بجائے اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت اور طویل عمر کی دعا کرتا ہوں۔

ضیاء المصطفیٰ مصباحی
ریسرچ اسکالر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

13 اپریل 2019

Unit-I

تاریخ زبان اردو

ہند آریائی کی مختصر تاریخ

- قدیم ہند آریائی دور 1500 قبل مسیح سے 500 قبل مسیح تک شمار کیا جاتا ہے۔
- 'زبان' آواز اور الفاظ کا مجموعہ ہے۔ زبان ہمارے احساسات، جذبات و خیالات کو ادا کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔
- زبانیں زمان و مکان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ ان کی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات کی بنا پر انھیں ماہرلسانیات نے مختلف آٹھ خاندانوں میں تقسیم کیا ہے:
  (1) سامی (2) ہند چینی (3) دراوڑی (4) منڈا (5) افریقہ کی بانتو (6) امریکی (7) ملایائی (8) ہند یورپی
- سامی خاندان میں بہت سی اہم زبانیں آتی ہیں عربی اور عبرانی اسی سے نکلی ہیں۔
- دراوڑی سے ہندوستان کی بہت سی اہم زبانوں کا سلسلہ ملتا ہے۔ یہ زبانیں جنوبی ہندوستان میں رائج ہیں تامل، تلگو، کنڑ اور ملیالم اسی کی مشہور شاخیں ہیں۔
- لیکن اردو اور ہندی کا جس خاندان سے تعلق ہے وہ ہند یورپی ہے۔
- ہندوستان میں آکر یہ خاندان یعنی ہند یورپی اپنے ارتقائی دور میں 'ہند ایرانی' سے گزر کر 'ہند آریائی' شکل اختیار کر لیتا ہے۔
- آریوں کا وطن وسطی ایشیا میں تلاش کرنا چاہیے۔ (نصیر احمد خان، تاریخ زبان اردو)
- آریا ہندو یوروپی زبان بولتے تھے جو مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔
- ہندوستان میں آریوں کے داخلہ کی تاریخ 1500 ق م مقرر کی جا سکتی ہے۔ (مسعود حسین خان)
- مغرب میں جانے والے آریوں کو کنیٹم گروہ کا نام دیا گیا جن کی نمائندہ زبانیں یورپ کی یونانی، لاطینی اور جرمینک وغیرہ ہیں۔
- مشرق کی طرف ہجرت کرنے والے آریہ کو شتم گروپ کے لوگ کہا گیا جو ایران میں اوستھا اور بعد میں اس کی جدید شکل فارسی وغیرہ بولتے تھے۔
- شتم گروپ کے جو آریا ہندوستان میں داخل ہوئے ان آریوں کی زبان سنسکرت کہلائی۔
- ماہرین لسانیات نے ہندوستان میں ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے:
  (1) قدیم ہند آریائی (2) وسطی ہند آریائی (3) جدید ہند آریائی

قدیم ہند آریائی

- آریائی کا پہلا مستند نقش ہمیں رگ وید (1000 ق م سے قبل) کی شکل میں ملتا ہے۔
- قدیم ہند آریائی کو ڈاکٹر سد یشور ور مانے پانچ منزلوں میں تقسیم کیا ہے جو اس طرح ہے:

(1) ویدک منزل: اس عہد میں وید (رگ، یجر، اتھر، سام) لکھے جاتے ہیں یعنی سنسکرت مذہب کی بانی ہوتی ہے۔

(2) عہد پانی کی منزل: اس عہد میں پانی کی اشٹ ادھیائے اور پاتن جلی کی مہا بھاشیہ لکھی جاتی ہیں اس طرح اس دور میں سنسکرت عالموں کی زبان بن جاتی ہے۔

(3) رزمیہ منزل: اسے ادبی منزل بھی کہا جاتا ہے۔ اسی میں مہا بھارت لکھی گئی تھی۔

(4) دنیوی منزل: اس دور میں سنسکرت سرکاری زبان بن جاتی ہے اور اس کا تعلق مذہب سے منقطع ہو جاتا ہے۔

(5) ٹکسالی منزل: اس عہد میں سنسکرت قواعد نویسوں کی پابند ہو کر خود کو محدود و محصور کر لیتی ہے۔ شدھی کے چکر میں پھنس کر عوام سے دور ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کے پہلو بہ پہلو عوامی بولیاں پروان چڑھنے لگتی ہیں۔

- سنسکرت اپنے اس مرحلے یعنی قدیم ہند آریائی کے دور میں تین مختلف معیاروں کی بتائی جاتی رہی ہے۔

(1) اد یچہ یا معیاری سنسکرت: جو ہندوستان کے شمال اور شمالی مغربی حصے میں بولی جاتی تھی یعنی پنجاب اور اس سے ملحق علاقوں میں بولی جانے والی سنسکرت سب سے معیاری سمجھی جاتی تھی۔

(2) مدھیہ دیشیہ یا وسطی یا نیم معیاری: اس میں انبالہ سے الہ آباد تک کا علاقہ شامل تھا۔ یہاں کے لوگوں کی سنسکرت نیم معیاری قرار دی گئی تھی۔

(3) پراچیہ یا مشرقی یا غیر معیاری: مشرقی ہندوستان کی زبان۔ اس میں یو پی اور بہار کے علاقے شامل تھے۔

- پروفیسر گیان چند جین نے قدیم ہند آریائی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے:
  (1) ویدک سنسکرت (2) کلاسیکل سنسکرت
- ہندوستان میں آریاؤں کی آمد کے بعد سب سے پہلے ویدک سنسکرت کے نمونے ملتے ہیں۔

وسطی ہند آریائی

- **وسطی ہند آریائی** 500 قبل مسیح سے 1000 تک کا زمانہ ہے جسے ماہرین نے اس کے ارتقائی خصوصیات کے لحاظ سے تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

- پہلا دور 500 قبل مسیح سے مسیحی سن شروع ہونے سے پہلے تک کا زمانہ ہے۔اس دور میں 'پالی' عوام کی مقبول زبان رہی ہے جس میں جین مت اور بدھ مت کی تعلیمات ملتی ہیں۔
- دوسرا دور مسیحی سن کے ابتدا سے 500ء تک شمار کیا جاتا ہے۔

پراکرت

- یہ عہد دراصل پراکرتوں کے آغاز و ارتقا کا عہد ہے۔
- پراکرت کے معنی فطری زبان کے ہیں۔
- یہاں پراکرتوں سے مراد وہ فطری زبانیں ہیں جو سنسکرت پر لگائی گئی پابندیوں اور قواعد نویسوں کی جکڑ بندیوں کے سبب سنسکرت کے پہلو بہ پہلو وجود میں آگئی تھیں جن میں فطری سلاست و روانی تھی اور عوام کی روزمرہ ضرورتوں کو پورا کرتی تھیں۔
- عوام کا محاورہ یا عوام کی بولی ٹھولی کو 'پہلی پراکرت' کہا گیا ہے جو ٹکسالی سنسکرت سے مختلف تھی۔
- عوام کی بولی ٹھولی کا ادبی روپ پالی ہے۔
- پراکرت کے سب سے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا پھر اشوک کی لاٹوں پر کندہ کیے ہوئے ملتے ہیں۔اسی کو ہم پہلی پراکرت مانتے ہیں اور پراکرت کی اسی ادبی شکل کو پالی کے نام سے یاد کیا گیا ہے لیکن پراکرت کا نام پالی اس وقت پڑا جب پراکرت نے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس پہلی پراکرت پر شورسینی پراکرت کا پورا پورا اثر پڑ چکا تھا۔
- مسعود حسین خان کے مطابق شروع سے ہی عوام کی زبان ایسی زبان تھی جس میں آریوں کی ابتدائی زبان اور دیسی بولیوں دونوں کا میل تھا۔بعض لوگوں نے اسی کو 'پہلی پراکرت' کہا ہے اور ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت دونوں کی ماں مانا ہے۔ہم اسے ابتدائی زبان کے نام سے یاد کریں گے۔
- مسعود حسین خان کے مطابق پہلی پراکرت صرف اس زبان کو کہیں گے جس کا ادبی روپ پالی ہے۔
- پالی کو قدیم ماگدھی بھی کہا گیا ہے۔
- لفظ پالی سنسکرت کے 'پنکتی' سے نکلتا ہے (اسی سے اردو کا پانتی، پتی اور پٹی ہے)
- پنڈت ہری اودھ کی تحقیق کے مطابق پالی بدھ دھرشاستری کی سطر کو کہتے ہیں۔
- پہلی پراکرت کو ابتدائی پراکرت بھی کہتے ہیں۔
- پہلی پراکرت میں پالی اور اشوک کے کتبوں کی زبانوں کا شمار ہوتا ہے۔یہ دونوں پراکرت کی اوّلین شکلیں ہیں۔

- پالی بدھ مذہب کی زبان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ مذہب کے پیشوا مہاتما گوتم بدھ پالی بولتے تھے اور انھوں نے اسی زبان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی تھی۔
- پالی بنیادی طور پر مگدھ کی زبان تھی جہاں بعد کے دور میں ماگدھی پراکرت کا ارتقا عمل میں آیا تھا۔
- بدھ مذہب کی تمام مستند تصانیف بشمول 'دھمپد' پالی زبان میں ہی پائی جاتی ہیں۔
- وسطی ہند آریائی کا دوسرا دور ادبی پراکرتوں (دوسری پراکرت) کا دور کہلاتا ہے۔
- ہند آریائی لسانیات کے ماہرین نے ادبی پراکرتوں یعنی دوسری پراکرت کی حسب ذیل پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔
- (1) مہاراشٹری (2) شورسینی (3) مگدھی (4) اردھ مگدھی (5) پیشاچی۔

(1) **مہاراشٹری:** یہ جنوب کی پراکرت ہے۔ مراٹھی اسی سے نکلی ہے۔ سنسکرت کے ڈراموں کے گیت اسی میں لکھے جاتے تھے۔ پراکرتوں میں سب سے پہلے مہاراشٹری کی قواعد مرتب ہوئی۔ اس زمانے کا بیشتر ادبی سرمایہ اسی پراکرت میں ملتا ہے۔

(2) **شورسینی:** اس کا مرکز شورسین یعنی متھرا کا علاقہ تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقے میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو وہ یہی زبان تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

(3) **مگدھی:** یہ پورے مشرقی ہندوستانیوں کی بولی تھی۔ اس کا مرکز مگدھ یعنی جنوبی بہار تھا۔ چونکہ یہ آریاؤں کے مرکز سے دور تھی اس لیے اس پر غیر آریائی بولیوں کا شدید اثر ملتا ہے۔ اس لیے آریا اس پراکرت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

(4) **اردھ مگدھی:** اس کے لفظی معنی آدھی مگدھی کے ہیں۔ اس کا مقام اودھ اور مشرقی اتر پردیش تھا۔ یہ تمام پراکرتوں میں سب سے قدیم ہے۔ اس میں اشوک کی تعلیمات کا بھی پرچار ہوا ہے۔ مغربی ہندوستانی اسے 'پراچیہ' کہا کرتے تھے۔ پراچیہ کے تحت مگدھی اور اردھ مگدھی دونوں آجاتی ہیں۔ گوتم بدھ اور مہاویر جین نے اسی پراکرت کو اپنایا تھا۔

(5) **پشاچی:** یہ کشمیر اور پنجاب کے علاقے کی پراکرت تھی۔ کشنوں کے عہد میں اس پراکرت کو فروغ ہوا۔

- **تیسرا دور** 500ء تا 1000ء پر محیط ہے۔ یہ دور اَپ بھرنش کا دور کہلاتا ہے۔

اپ بھرنش

- مسعود حسین خان کے مطابق جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کی تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔ اسی بول چال کی زبانوں کو اس عہد

کے قواعد نویسوں نے 'اَپ بھرنش' کہا ہے۔

- یعنی پراکرتوں کے ادبی شکل اختیار کر لینے کے بعد عوام کی بول چال کی زبانوں کو قواعد نویسوں نے 'اَپ بھرنش' کہا ہے۔
- اب بھرنش کے معنی بگڑی زبان کے ہیں۔
- سید ھیشورور ما اَپ بھرنشو کو پراکرتوں کا مابعد ارتقا کہتے ہیں۔
- پتن جلی نے اپنی مہا بھاشن میں سنسکرت الفاظ کی بگڑی ہوئی شکلوں کو اَپ بھرنش کہا ہے۔
- ایک خاص زبان کے معنی میں سب سے پہلے ہیم چند نے لفظ اَپ بھرنش کا استعمال کیا ہے۔
- پراکرت کے بڑے عالم مارکنڈے نے اَپ بھرنش کی تین قسمیں بتائی ہیں:

(1) **ناگر اَپ بھرنش:** جو گجرات اور راجستھان کی قدیم بولیوں کی ادبی شکل تھی اس پر شورسینی کا بڑا اثر تھا۔ اس اَپ بھرنش کو فوقیت اس لیے حاصل تھی کہ یہ علمی طبقہ میں مقبول تھی۔ ناگری اَپ بھرنش میں بکثرت تصانیف ملتی ہیں۔ اسی کی رعایت سے ہندی رسم الخط کا نام ناگری پڑا ہے جو گجرات کے ناگر برہمنوں سے ماخوذ ہے۔

(2) **براچڈ اَپ بھرنش:** جو سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے۔

(3) **اُپ ناگر اَپ بھرنش:** جو ناگر اور براچڑ کے میل سے بنی ہے۔ اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب کے علاقوں میں تھا۔

- اس عہد میں شورسینی اَپ بھرنش شمالی ہند کی 'لنگوا فریکا' کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو زبان گجرات اور مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔
- رفتہ رفتہ اَپ بھرنش بھی ایک ادبی زبان بن گئی جس کے نتیجے میں جدید زبانوں کا وجود ہوا۔
- ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ اب بھرنشوں سے ہوتی ہے۔ ان کا سلسلہ مندرجہ ذیل پانچ اَپ بھرنشوں سے ملایا جا سکتا ہے۔
- اَپ بھرنشوں میں شورسینی ابھرنش ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

(1) **<u>شورسینی ابھرنش:</u>** علاقہ شورسین یعنی متھرا وغیرہ میں بولے جانے والے اَپ بھرنش۔

- شورسینی اپ بھرنش میں مندرجہ ذیل چار بولیاں شامل ہیں:

(1) کھڑی بولی یا ہندوستانی (موجودہ اردو ہندی) (2) راجستھانی

(3) پنجابی (مشرقی) (4) گجراتی اور پہاڑی بولیاں

- یادرہے کہ گجراتی اور راجستھانی کا تعلق شورسینی کی اس شکل سے ہے جسے ناگر اَپ بھرنش بھی کہا

جاتا ہے۔
(2) **ماگدھی اَپ بھرنش:** یہ بڑے وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اس لیے مختلف جگہوں پر اس کے مختلف نام پڑ گئے۔
بنگال میں پراچیہ، گوڑ اور ڈھکیٔ کہلائی جس سے موجودہ بنگالی اور آسامی نکلیں۔ اڑیسہ میں اس کا نام 'ات کلی' پڑا جس سے موجودہ زبان اڑیا نے جنم لیا

- بہار کی تمام بولیاں ماگدھی اَپ بھرنش سے ہی نکلی ہیں۔
- بہار کی بولی کا نام مگہی ہے جو ماگدھی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(3) **اَرْدھ ماگدھی اَپ بھرنش:** بہار سے الہ آباد تک کا علاقہ

* اس میں پوربی یا مشرقی ہندی کی تمام بولیاں آتی ہیں یعنی اودھی، چھتیس گڑھی، اور بھوجپوری وغیرہ

(4) **مہاراشٹری:** اس کا خاص مرکز موجودہ برار تھا۔ سنسکرت میں اسی صوبہ کو مہاراشٹر کے نام سے پکارا گیا ہے۔
(5) **پراچڈ اور کیکئی اَپ بھرنش:** پراجڈ سے سندھی اور اور کیکئی سے لہندا نکلی۔

* سندھی اور لہندا میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

- جدید زبانوں کا تعلق اَپ بھرنش اور پراکرت کے وسیلے سے سنسکرت سے جا ملتا ہے۔
- موجودہ ہندوستانی زبان اور شورسینی اَپ بھرنش کی درمیانی منزل کو بعض اوقات 'اوہٹ' بھی کہا گیا ہے۔
- ودیاپتی کی شاعری 'اوہٹ' میں ہی ہے۔
- اوہٹ میں جب پراکرتی روایات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے تو اسے پنگل کہتے ہیں۔
- راجپوتانہ کے بھاٹ شاعر اپنی ڈنگل (قدیم راجستھانی) کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شاعری کرتے تھے۔

جدید ہند آریائی

- جدید ہند آریائی زبانوں کا زمانہ 1000ء سے تا حال مقرر ہے۔
- ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل طریقے پر کرتے ہیں:

شمال مغربی ہندوستان کی زبانیں (1) لہندا (2) سندھی

(1) **لہندا:** یہ مغربی پنجاب کی زبان ہے۔

* لہندا پر دُردیا پشاچ زبانوں کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے۔
* لہندا مغربی پنجابی، جانگی، ہندکی یا اچی کے ناموں سے بھی مشہور ہے۔

(2) **سندھی:** یہ صوبہ سندھ کی بولی ہے۔

* پاکستان میں سندھی عربی رسم الخط میں اور ہندوستان میں دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔
* سندھ کو پرانے زمانے میں براچڈ دیس کہا جاتا تھا۔ اس لیے موجودہ سندھی کا تعلق براچڈ اَپ بھرنش سے ہے۔
* جدید ہند آریائی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جس پر عربی کے براہِ راست اثرات پڑے ہیں۔

جنوبی ہندوستان کی آریائی زبان: (1) مراٹھی

(1) **مراٹھی:** مہاراشٹر کی زبان ہے۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں جس میں سے پونا کے اطراف والی بولی نے ادبی مراٹھی کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کا رسم الخط دیوناگری ہے:

- ادبی سرمایہ کے اعتبار سے ہندوستان کی ممتاز ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔
- ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں میں گجراتی کے علاوہ مراٹھی ایک ایسی زبان ہے جس میں صیغہ تثنیہ ملتا ہے۔

مشرقی ہندوستان کی زبانیں: (1) اسامی (2) بنگالی (3) اڑیا (4) بہاری

(1) **آسامی:** * آسام کی زبان ہے

* اڑیا کی طرح آسامی بھی بنگالی کی بہن ہے نہ کہ بیٹی۔

(2) **بنگالی:** یہ ریاست بنگال اور بنگلہ دیش کی زبان ہے۔

(3) **اڑیا:** یہ اڑیسہ (قدیم اتکل دیس) میں بولی جاتی ہے اس لیے اس کو اتکلی یا اوڈری بھی کہتے ہیں۔

(4) **بہاری:** یہ بہار اور یوپی کے کچھ اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

* بنگالی، اڑیا اور اسامی کی طرح بہاری کی پیدائش بھی ماگدھی اَپ بھرنش سے ہوئی ہے۔
* بہاری ماگدھی اَپ بھرنش کی سچی جانشین ہے۔
* بہاری کی تین بولیاں قابل ذکر ہیں: (1) میتھلی (2) مگہی (3) بھوج پوری

مشرقی ہندوستان کی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان: (1) مشرقی ہندی

(1) **مشرقی ہندی:** یہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے مغربی ہندی کے مماثل ہے مگر بعض خصوصیات کے اعتبار سے یہ بہاری و بنگالی سے بہت قریب ہے۔

* مشرقی یا پوربی ہندی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مغربی ہندی کے پورب میں بولی جاتی ہے۔
* مشرقی ہندی کی تین خاص بولیاں ہیں:
(1) اودھی (2) بگھیلی (3) چھتیس گڑھی
* کوسلی اودھی کا دوسرا نام ہے

* مشرقی ہندی کی سب سے اہم بولی اودھی کو ہندی ادب میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔
- اودھی کے دو مشہور شاعر ملک محمد جائسی اور تلسی داس ہیں جو ہندی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔
- گریرسن نے سب سے پہلے مشرقی ہندی کو ایک علیحدہ زبان کی حیثیت دی ہے اس سے قبل اسے ہندی کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔

مدھیہ دیش کی زبان خاص: (1) مغربی ہندی

(1) **مغربی ہندی:** مدھ دیش کی زبان کو ہی مغربی ہندی کہتے ہیں جو مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک اور شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیا چل اور بندیل کھنڈ تک بولی جاتی ہے۔

- لسانی تحقیق کی رو سے مغربی ہندی کا براہِ راست تعلق شور سینی اَپ بھرنش سے ہے۔
- گریرسن کے مطابق مدھ دیش میں بولی جانے والی پانچ آریائی بولیاں 'مغربی ہندی' کی ایک اصطلاح یا ایک نام کے تحت آتی ہیں۔
- مغربی ہندی مدھ دیش کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی سچی نمائندہ زبان ہے۔
- مغربی ہندی کی پانچ بولیاں ہیں (گریرسن کے مطابق)
  (1) کھڑی بولی یا ہندوستانی (2) ہریانوی (جاٹو یا بانگڑو)
  (3) برج بھاشا (4) قنوجی (5) بندیلی
- <u>مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:</u>
  الف: (اُو) کو ترجیح دینے والی بولیاں: (1) برج بھاشا (2) بندلی (3) قنوجی
  ب: (اَ) کی شکل رکھنے والی بولیاں: (1) ہریانی (جاٹو یا بانگڑو) (2) کھڑی بولی
- **<u>برج بھاشا:</u>** برج کو مغربی ہندی کی نمائندہ بولی کہا جاتا ہے۔

* ماہر لسانیات نے برج بھاشا کو شور سینی اَپ بھرنش کی سچی جانشین کہا ہے کیونکہ برج بھاشا مغربی ہندی کی دوسری بولیوں کے مقابلے میں شور سینی اَپ بھرنش اور شور سینی پراکرت کی مجموعی خصوصیات کی حامل رہی ہے۔

- برج بھاشا کا مرکز برج (متھرا) کا علاقہ ہے لیکن یہ آگرہ، بھرت پور، دھول پور، کرولی، ریاست گوالیر اور جے پور کے مشرقی اضلاع تک پھیلی ہوئی ہے۔ شمال میں گڑگاؤں ضلع کے مشرقی حصوں میں بھی رائج ہے۔
- **<u>بندیلی یا بندیل کھنڈی:</u>** بندیلی بندیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے اور اس کے بولنے والے بندیلے

کہلاتے ہیں۔

- **قنوجی:** مغربی ہندی کی اس بولی کا نام شہر قنوج کے نام پر ہے جو ضلع فرخ آباد میں ہے۔
- **ہریانوی** (بانگڑو یا جاٹو): دہلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال، رہتک، حصار وغیرہ کی بولی ان تینوں ناموں سے پکاری جاتی ہے۔
- ہریانوی کو بانگڑو اور جاٹو بھی کہا جاتا ہے۔
- گریرسن موجودہ ہریانوی کو کھڑی بولی ہی کی ایک شکل مانتا ہے جس میں راجستھانی اور پنجابی بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔
- **کھڑی بولی یا ہندوستانی:** یہ مغربی روہیل کھنڈ، دوآبہ کے شمالی حصہ اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بولی جاتی ہے۔
گریرسن کھڑی بولی کو ہندوستانی کا نام دیتا ہے۔

مدھیہ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں

(1) پہاڑی بولیاں (2) گجراتی (3) راجستھانی (4) پنجابی

(1) پہاڑی بولیاں:......

- پوربی پہاڑی: یہ نیپال میں بولی جاتی ہے۔ اس کو نیپالی، پربتیا، گورکھالی اور سکھ کُرا بھی کہتے ہیں۔
- درمیانی پہاڑی: اس کی دو شکلیں ہیں: (1) کمایونی (3) گڑھوالی
- مغربی پہاڑی: یہ شملہ اور اس کے آس پاس کے پہاڑی علاقے میں بولی جاتی ہے۔

(2) گجراتی (3) راجستھانی

- راجستھان کی چار اہم بولیاں ہیں:
(1) مارواڑی یا میواڑی (2) مالوی (3) جے پوری (4) میواتی

(4) پنجابی: لفظ پنجابی کا اطلاق عام طور پر ان تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے لے کر ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہے۔

- گریرسن اور سنیتی کمار چٹرجی دونوں نے اپنے طور پر جدید ہند آریائی زبانوں کی گروہ بندی کی ہیں۔
* امتحان کے پیش نظر دونوں نقشے پیش خدمت ہیں۔
- گریرسن کی تقسیم کے مطابق جدید ہند آریائی زبانیں دو شاخوں میں بٹ جاتی ہیں:
(1) اندرونی (2) بیرونی

گریرسن کی تقسیمِ زبان کا نقشہ

(1) **بیرونی زبانیں:**
(الف) شمالی مغربی شاخ: (1) لہندا (مغربی پنجابی) (2) سندھی
(ب) جنوبی شاخ: (1) مراٹھی
(ج) مشرقی شاخ: (1) آسامی (2) بنگالی (3) اڑیا (4) بہاری بولیاں

(2) **وسطی زبانیں**
(الف): مشرقی یا پوربی ہندی: (1) اودھی (2) بگھیلی (3) چھتیس گڑھی

(3) **اندرونی زبانیں**
(1) مغربی ہندی: (الف) کھڑی بولی (ب) ہریانوی (ج) برج بھاشا (د) قنوجی (ہ) بندیلی
(2) پنجابی (3) گجراتی (4) راجستھانی
(5) بھیلی (6) خاندیشی

(4) **پہاڑی زبانیں**
(1) مشرقی پہاڑی یا نیپالی (2) درمیانی پہاڑی
(3) مغربی پہاڑی

سنیتی کمار چٹرجی کی تقسیم زبان کا نقشہ

(الف): **مدھیہ دیش کی خاص زبان:** مغربی ہندی
(ب) **درمیانی زبانیں:** پنجابی، راجستھانی، گجراتی اور پہاڑی بولیاں جو مدھ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔ پوربی ہندی جو بیرونی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں۔
(ج) **شمال مغربی ہندوستان کی زبانیں:** لہندا (مغربی پنجابی)، سندھی
(د) **مشرقی ہندوستان کی زبانیں:** پہاڑی، اڑیا، بنگالی، آسامی
(ہ) **جنوبی ہندوستان کی آریائی زبانیں:** مرہٹی

نوٹ: ہارنل پہلا شخص ہے جس نے 1880ء میں اس طرف توجہ دلائی کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد دو مختلف وقفوں اور گروہوں میں ہوئی۔ دوسرا گروہ جو کافی عرصہ کے بعد ہندوستان میں آیا وہ پنجاب کے میدانوں سے گزرتا ہوا وادی گنگ تک پہنچ گیا اور اس نے پہلے گروہ کو مغرب کی

جانب کھدیڑ دیا۔اس طرح دوسرا گروہ اندرونی کہلایا اور اس کی زبان اندرونی کہلائی جبکہ یہ پہلا گروہ جو بیرونی حصوں میں پھیل گیا اس کی زبانیں بیرونی کہلائیں۔



کھڑی بولی کے اوصاف

کھڑی بولی کے اہم خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

- کھڑی بولی میں مشدّد الفاظ کا استعمال کثرت سے ملتا ہے جیسے رٹّی (روٹی)، بدّل (بادل)، چدّر (چادر)، گڈّی (گاڑی وغیرہ۔
- قدیم اردو یعنی دکنی اس لحاظ سے کھڑی بولی سے قریب ہے جس میں سُنّار (سونا)، چُلّا (چولا) عام ہیں۔
- سہارنپور، مظفر نگر اور میرٹھ مشدد الفاظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے 'اضلاعِ مشدّدہ' کہے جاتے ہیں۔
- دکنی اردو کی طرح کھڑی بولی کی یہ عام خصوصیت ہے کہ اس میں درمیانی "ہ" گرادی جاتی ہے اور نفسی آوازیں اپنی ہائیت کھودیتی ہیں جیسے نئیں (نہیں)، کاں (کہاں) وغیرہ۔
- کھڑی بولی میں معکوسی مصمتے ڈ کا استعمال زیادہ ہے۔
- کھڑی بولی میں دکنی کی طرح مصوتوں کو انفیانے کا رجحان عام ہے جیسے فاطماں (فاطمہ)، کہناں (کہنا)، دیاں (دیا)، کونچ در کونچ (کوچ در کوچ)
- کھڑی بولی میں ساکن کو متحرک کردینے کا رجحان ہے جو عوامی اردو کی تا حال خصوصیت ہے۔ جیسے شَکَلْ، رَحَمْ، نَظَم، طِفَلْ، مِصَرْ، عَقَلْ، ذِکَر
- کھڑی بولی 'ڑ' اور 'ڑھ' پر 'ڈ' اور 'ڈھ' کو ترجیح دیتی ہے جو دکنی اردو کی بھی خصوصیت ہے۔
- کھڑی بولی کے اسما، ضمائر، صفات اور افعال بالعموم طویل مصوتے پر ختم ہوتے ہیں جن کی تحریری نمائندگی الف سے ہوتی ہے مثلاً گھوڑا، میرا اور اچھا وغیرہ۔
- کھڑی بولی میں اسما کی جمع الف نون لگا کر بنائی جاتی ہے جیسے دناں اور کھیتاں وغیرہ۔
- نے کا استعمال دکنی اردو کی طرح کھڑی میں بھی بے قاعدہ طور پر پایا جاتا ہے یعنی یہ فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں آتا ہے مثلاً بندر نے اس نے دیکھ لیا (بندر نے اس کو دیکھ لیا)
- کھڑی بولی میں ضمیر میں تیرا میرا کی جگہ تجھ مجھ کا استعمال ملتا ہے۔
- کھڑی بولی میں افعال کی یہ صورت ہے کہ "میں مارتا ہوں" کے ساتھ "میں ماروں ہوں"، "وہ مارے ہے"، "تو مارے ہے" بھی ملتا ہے۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات

- محمد حسین آزاد نے اردو کا ابتدائی سرچشمہ برج بھاشا کو قرار دیتے ہوئے آبِ حیات میں لکھا ہے کہ ''اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔''
- محمد حسین آزاد کے مطابق اردو شاہجہاں کے عہد میں تکمیل کو پہنچی۔
- میر امن، سرسید، امام بخش، سید شمس اللہ قادری، ماہر لسانیات روڈولف ہیورنلے نے بھی برج بھاشا کو ہی اردو کی اصل قرار دیا ہے۔
- میر امن کے مطابق اردو اکبر کے عہد میں پیدا ہوئی اور شاہجہاں کے زمانے میں اس نے فروغ پایا۔
- محمود شیرانی نے اپنی کتاب 'پنجاب میں اردو' میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اردو کی داغ بیل پنجاب کے علاقے میں پڑی ہے۔
- شیر علی سرخوش، جارج گریرسن اور ٹی گراہم بالی نے بھی اردو کو سرزمین پنجاب سے منسوب کیا ہے۔
- ڈاکٹر سہیل بخاری نے اردو کی جائے پیدائش اڑیسہ کو قرار دیا ہے۔
- شوکت سبزواری نے دوآبۂ گنگ و جمن کو اردو کا مسکن قرار دیا ہے اور یہ کہ اردو پالی سے نکلی ہے۔
- مسعود حسین خان نے سرزمین دہلی اور اس کے گردونواح کو اردو کی جائے پیدائش قرار دیا ہے۔
- مسعود حسین خان نے لکھا ہے کہ ''نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع ہیں اور حضرت دہلی اس کے حقیقی مولد و منشا۔''
- سید سلیمان ندوی نے اردو زبان کے آغاز کا سہرا سندھ کے سر باندھا ہے۔
- سلیمان ندوی نے نقوش سلیمانی میں لکھا ہے کہ ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں۔ اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔
- محی الدین قادری زور اردو پر ہریانوی کے اثرات کے قائل ہیں۔
- اختر اورینوی نے اردو کے مگدھی سے نکلنے کا قول کیا ہے۔
- نصیر الدین ہاشمی اردو کے دکن میں پیدا ہونے کے قائل ہیں۔
- ڈاکٹر گیان چند جین نے کھڑی بولی کو اردو کی اصل قرار دیا ہے۔
- انشاءاللہ خان انشا نے اردو کو عربی فارسی ترکی اور برج بھاشا پر مشتمل قرار دیا ہے۔

لسانیات کے متعلق اقوال

- اگر مسلمان ہندوستان میں نہ آتے تب بھی جدید ہند آریائی زبانوں کی پیدائش ہو جاتی لیکن ان کے ادبی آغاز و ارتقا میں ضرور تاخیر ہو جاتی۔ (سنیتی کمار چٹرجی)
- ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ اپ بھرنشوں سے ہوئی۔ (محی الدین قادری زور)
- اردو کھڑی بولی اور ہریانی کی آمیزش سے نکلی ہے۔ (مسعود حسین خان)
- ماہر لسانیات نے اپ بھرنشوں کو ہند آریائی زبانوں کے عہد وسطیٰ اور عہد جدید کو ملانے والی کڑی کہا ہے۔



اردو اور اس کی بولیاں

- اردو کی بولیوں کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1) لسانی بولیاں (2) سماجی بولیاں (3) علاقی بولیاں

- اردو کی چند اہم لسانی، سماجی اور علاقائی بولیاں مندرجہ ذیل ہیں:

(1) کرخنداری اردو (2) مراٹھی اردو (3) دکنی اردو (4) پنجابی اردو
(5) کلکتیا اردو (6) کشمیری اردو

- کرخنداری اردو
- کرخنداری اردو سماجی بولیوں میں ایک بولی شمار ہوتی ہے۔
- کرخنداری دہلی کے ان علاقوں میں بولی جاتی ہے جسے کبھی شاہ جہاں آباد کہا جاتا تھا۔
- کرخنداری کو فصیل شہر کی زبان بھی کہا جاتا ہے جس میں پرانی دہلی کے اردو بازار، کباڑی بازار، ٹمیا محل، چتلی قبر، سوئی والان، محلہ قبرستان، کوچہ پنڈت، کوچہ چیلان، لال کنواں، بازار سیتا رام، فراش خانہ، گلی قاسم جان، پہاڑ گنج اور صدر بازار وغیرہ کے محلے خصوصاً قابل ذکر ہیں۔
- کرخنداری کی لسانی خصوصیات:

* صوتی سطح پر اردو کے مقابلے میں کرخنداری کے بعض مصمتوں اور مصوتوں کا تلفظ بدلا ہوا ملتا ہے جیسے حلقی بندشی مصمتے: لب دندانی، دندانی، مسوڑی، تالوی اور حلقی صفیری مصمتے وغیرہ جو مخارج اور

طریقِ ادائیگی کے اعتبار سے اردو سے مختلف ہیں۔

- کرخنداری میں رکنوں کی ساخت اردو کے مقابلے میں بدلی ہوئی ملتی ہے۔
- کرخنداری میں مصورتوں کے انفی ہوجانے کا رجحان زیادہ ہے۔
- کرخنداری میں 'اس اور ان' کی جگہ 'وس' اور 'ون'، 'انھوں نے' کی 'ونوں نے'، 'مجھ، تجھ کی جگہ مُج تج وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے۔
- مستقبل کا فعل امدادی 'گا' کرخنداری میں 'اَں' ہوجاتا ہے۔
- کرخنداری میں جبھی کے بجائے جدی، کبھی کے بجائے کدی، یہاں، وہاں، جہاں اور کہاں کے بجائے یاں، واں، جاں اور کاں کا استعمال ہوتا ہے۔
- اردو کے وہ الفاظ جو صوتی تغیر کے ساتھ کرخنداری میں استعمال ہوتے ہیں۔
- درکت (درخت)، جگّہ (جگہ)، تھنڈا (ٹھنڈا)، مَسِجد (مسجد)، پھتر (پتھر)، سِیل (سیر)، کمّل (کمبل) چقو (چاقو)، قبوتر (کبوتر)، بدام (بادام) اگاڑ (آگے) وغیرہ۔
- خالص کرخنداری کے الفاظ مندرجہ ذیل میں۔

لمڈا (لڑکا)، ہلہلا (تحریک)، کھنڈک (خلل)، منادگی (ممنوع)، رسان (آہستہ)، دھیائی (اجرت)، ترّی (جرأت)، ناواں (رقم مخریز (مذاق)

- کرخنداری میں استعمال ہونے والے چند غلط فقرے بے فضول، دراصل میں، انشاءاللہ اگر اللہ نے چاہا، یا پیادہ پیدل چل کر، لب جمنا کے کنارے، ماہ رمضان کا مہینہ، للہ کے واسطے اور سنگ مرمر کا پتھر۔
- <u>مراٹھی اردو</u>
- مراٹھی اردو: شہر پونا کے اردگرد بولی جاتی ہے۔
- مراٹھی اردو کے چند اہم خصوصیات:

* پونا کی اردو میں سوائے 'ق' کے تمام بندشی مصمتے ملتے ہیں۔ 'ق' کبھی 'کھ' اور کبھی 'ک' میں بدل جاتا ہے، مثلاً کھندیل (قندیل)، مشرک (مشرق)
* اردو کے الفاظ کے ساتھ پونا کی بولی میں تقلیب کا عمل بھی ہوتا ہے، جیسے گرج کا گجر ہوجانا وغیرہ۔
* پونا کی اردو میں لفظ کے آخر میں مصمتی خوشوں کا رواج نہیں ہے اس لیے مصمتی خوشوں کے درمیان مصوتہ داخل ہوجاتا ہے البتہ مصمتی خوشوں کا پہلا جز اگر 'ن' ہے تو وہ لفظ کے آخر میں آسکتے ہیں جیسے نند (نند)، دَرَد (دَرْد)

- اس بولی میں سادہ مصمتوں کو مشدد کرنے کا عام رجحان پایا جاتا ہے جیسے پکّا ہوا (پکا ہوا) آدّا (آدھا)، اٹّا (آٹا)

- **دکنی اردو**
- عام طور پر جنوبی ہندوستان میں بولی جانے والی اردو کی بدلی ہوئی شکل کو دکنی اردو کہا جاتا ہے۔
- مغربی ہند کے صوبہ مہاراشٹر میں جو اردو بولی جاتی ہے اسے بھی وہاں کے لوگ دکنی کہتے ہیں۔
- **پنجابی اردو**
- پنجاب کے علاقے میں بولی جانے والی اردو کی بدلی ہوئی شکل کو پنجابی اردو بولتے ہیں۔
- پنجابی اردو میں مصمتوں کو مشدد کرنے کا عام رجحان ہے جیسے رٹّی (روٹی)، اڈّی (آدھی)
- پنجابی اردو میں بل کی حیثیت بنیادی ہے۔
- اردو کے اکثر ہا کاری آوازوں پر مشتمل الفاظ پنجابی اردو میں غیر ہا کاری ہو جاتے ہیں۔ جیسے اہنسا، نہانا، شہر، محنت کے بجائے ریتا، نانا، شیر اور مینت وغیرہ۔
- مذکر اسما کو مونث بنانے کے لیے اردو میں جہاں 'یا' کا استعمال ہوتا ہے وہاں پنجابی اردو میں 'ی' لاحقہ استعمال کیا جاتا ہے جیسے بندر (مذکر)، بندریا (مونث) کے بجائے بندری وغیرہ۔
- مستقبل کا فعل امدادی 'گا' واحد متکلم میں کبھی کبھی پنجابی اردو میں 'اں' ہو جاتا ہے۔
- اردو میں عام قاعدہ یہ ہے کہ اگر اسم جمع میں ہے تو فعل کے بجائے صرف فعل امدادی جمع میں آئے گا لیکن پنجابی اردو میں فعل بھی جمع میں استعمال ہوتا ہے جیسے عورتیں جاتی ہیں کے بجائے عورتیں جاتیں ہیں وغیرہ۔
- پنجابی اردو میں 'مجھے' ضمیر کی جگہ 'میں نے' استعمال ہوتا ہے جیسے مجھے کرنا ہے کے بجائے میں نے کرنا ہے وغیرہ۔
- **کلکتیا اردو**
- مغربی بنگال اور بنگلہ دیش کے علاقوں میں بولی جانے والی اردو کی بدلی ہوئی شکل کو کلکتیا اردو کہا جاتا ہے۔
- کلکتیا اردو میں 'ہ' آواز کی طرف رجحان کم ہے۔ اکثر الفاظ 'ہ' کے بغیر تلفظ کیے جاتے ہیں جیسے آہستہ سے آستا، نہیں سے نئیں وغیرہ۔
- کلکتیا اردو میں 'و' اکثر 'ب' میں بدل جاتا ہے جیسے تصبیر (تصویر) مولوبی (مولوی)
- اردو کی دو جنسوں یعنی مذکر اور مؤنث کے مقابلے میں کلکتیا میں عام طور پر الفاظ مذکر ملتے ہیں جو الفاظ اپنی اصل کے اعتبار سے مونث ہیں ان کے رشتہ رکھنے والے الفاظ بھی مذکر ہی استعمال ہوتے ہیں۔
- **کشمیری اردو**
- جموں و کشمیر میں بولی جانے والی اردو کی بدلی ہوئی شکل کو کشمیری اردو کہا جاتا ہے۔

- کشمیری میں ہاکاری جہری مصمتے نہ ہونے کی وجہ سے اردو کی تمام ایسی آوازیں کشمیری اردو میں غیر ہاکاری ہوجاتی ہیں جیسے جولنا (جھولنا)، گر (گھر)، بوک (بھوک) وغیرہ۔
- لفظ کے شروع میں مصمتے 'گ' 'ڈ' میں بدل کر پوری ساق کو جوں کا توں دہرا کر بننے والے اردو کے مرکب الفاظ کشمیری اردو میں 'ڈ' کے بجائے 'ش' سے تلفظ ہوتے ہیں۔ جیسے چائے شائے (چائے والے)، روٹی شوئی (روٹی ووٹی) وغیرہ۔
- کشمیری اردو میں 'ڈ' اور 'ڑ' آوازیں عام طور سے ایک دوسرے سے بدل جاتی ہیں۔
- اردو میں عام قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کے آخر میں آنے والی ہاکاری آوازیں عام طور پر ہاکاریت کے بغیر یا کم ہاکاری عنصر کے ساتھ تلفظ ہوتی ہیں جب کہ کشمیری اردو مین ہاکاری، مصمتوں کا ہاکاری عنصر برقرار رہتا ہے۔



لسانیات

- زبان کے سائنسی طریقے سے مطالعے کو لسانیات کہتے ہیں۔
- لسانیات کی رو سے زبان ایک ایسے خود اختیاری اور روایتی صوتی علامتوں کے نظام کو کہتے ہیں جو کوئی انسان اپنے سماج میں اظہارِ خیال کے لیے استعمال کرتا ہے۔
- لسانیات میں زبان اوپر دیئے گئے خاص معنی میں استعمال ہوتی ہے اگر چہ زبان آوازوں یا اصوات کا مجموعہ اور ترتیب کا نام ہے۔
- یاد رہے کہ لسانیات میں انسان کے اعضائے تکلم سے ادا کی جانے والی آوازیں ہی اہم ہیں اشاروں کی زبان یا تحریر، لسانیات میں ثانوی حیثیت رکھتے ہیں یعنی لسانیات میں زبانی بولی جانے والی زبان کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ لکھی ہوئی زبان کا نہیں۔

لسانیات کی شاخیں

- لسانیات کی مندرجہ ذیل چار شاخیں ہیں
  (1) صوتیات (2) صرفیات/ مارفوجی (3) نحویات (4) معنیات
- یاد رہے کہ بعض ادیب پانچ شاخ مانتے ہیں کیونکہ وہ فونیمیات کو ایک الگ شاخ مانتے ہیں۔
- یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدید لسانیات نے زبان کے مطالعے کو چار سطحوں میں تقسیم کیا ہے۔
  (1) صوتیاتی سطح (2) صرفیاتی سطح (3) نحویاتی سطح (4) معنیاتی سطح

صوتیات (Phonetics)

- صوتیات لسانیات کی وہ شاخ ہے جس میں کسی زبان کی آوازوں کے مخارج کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
- صوتیات میں منہ کے ان حصوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے جن سے ہم بولنے میں مدد لیتے ہیں اور یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ کس طرح کا کام کرتے ہیں۔
- صوتیات کی ایک تعریف یہ بھی کی جاتی ہے کہ 'صوتیات انسانی آوازوں کا سائنسی مطالعہ ہے'
- انسانی آواز سے مراد وہ تمام آوازیں ہیں جو الفاظ کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔
- صوتیات فونیمیات سے مختلف ہے۔
- فونیمیات میں کسی مخصوص زبان کے صوتی نظام کا مطالعہ پیش کیا جاتا ہے اس کے برعکس صوتیات میں تمام انسانی آوازوں کا عمومی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔
- صوتیات میں حرف کے بجائے صوت اور لفظ کے بجائے مجموعۂ اصوات کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔
- جس طرح علم ہجا میں حرف کو بنیادی اکائی مانا جاتا ہے اسی طرح صوتیات میں 'صوت' کو بنیادی اکائی تسلیم کیا جاتا ہے۔
- مصوتوں اور مصمتوں کو مجموعی طور پر صوتیہ (Phoneme) کہتے ہیں۔
- صوتیات کی مدد سے ہی آوازوں کی ادائیگی، آوازوں کی ترسیل اور آوازوں کے ادراک کو سمجھا جاتا ہے۔
- کسی زبان کی آوازوں کا مطالعہ مندرجہ ذیل تین زاویوں سے کیا جاسکتا ہے یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ صوتیات کی تین شاخیں ہیں۔

(1) سمعیاتی صوتیات Acoustic Phonetics

(2) سامعی صوتیات Auditory Phonetics

(3) تلفظی صوتیات Articulatry Phonetics

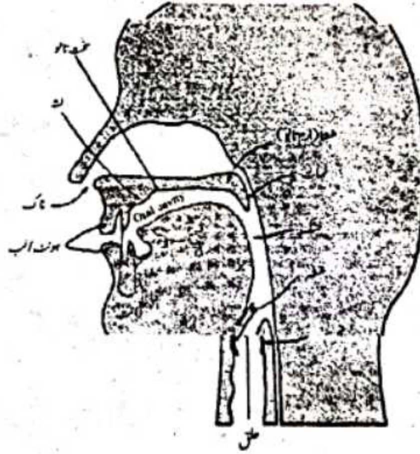
- **تلفظی صوتیات:** صوتیات کی اس شاخ میں اعضا اور ان کی حرکت پر غور کیا جاتا ہے جن سے مختلف آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔

اعضائے تکلم

- جن اعضا سے زبان کی مختلف اصوات پیدا ہوتی ہیں ان کو اعضائے تکلم کہتے ہیں۔
- اعضائے تکلم مندرجہ ذیل ہیں:

(1) ہونٹ Lips (2) اوپری دانت Upper teeth

(3) زبان کی نوک Tip of the tongue (4) زبان کا پھل Blade of the Tongue
(5) زبان کا وسطی حصہ Arid of the Tongue (6) زبان کا پچھلا حصہ Back of the Tonge
(7) زبان کی جڑ Root of the Tongue (8) اوپری مسوڑھ Alveolar Ridge
(9) سخت تالو Hard Plate (10) نرم تالو (غشا) Soft Palate (Velum)
(11) لمہات یا کوا Uvula (12) حلق Pharynx
(13) حلقی ڈھکن Epiglottis (14) سانس کی نلی Trachea
(15) حنجرہ Larynx (16) صوت تانت Vocal Cords
(17) صوت تانت کا دہانہ Glottis (18) انفی خلا Nasal Cavity
(19) پھیپھڑا (Lung)



- ان اعضا کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔
  (1) تلفظ کار (2) مقام تلفظ
- جو اعضا حرکت کرتے ہیں انھیں تلفظ کار (Articulator) کہتے ہیں جیسے زبان اور نچلا ہونٹ
- زبان تمام اعضائے تکلم میں سب سے زیادہ متحرک اور لچیلا عضوِ تکلم ہے۔
- جو اعضا جامد رہتے ہیں اور تلفظ کار جن اعضا پر جا کر ہوا میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور جو آوازوں کی ادائیگی میں معاون ثابت ہوتے ہیں ان اعضا کو مقام تلفظ کہتے ہیں۔
- بالفظ دیگر وہ مقام جہاں تلفظ کار باہر آتی ہو میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے اسے مقام تلفظ کہتے ہیں۔
- اردو مصمتوں کی ادائیگی میں نو مختلف مقامات پر یہ رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں۔

الف۔لبی

(1) دو لبی: اس میں دونوں ہونٹوں سے ہوا کو روکا جاتا ہے۔ مثلاً پ، ب وغیرہ آوازوں کو بناتے ہیں
(2) لب دنتی: اس میں نچلے ہونٹوں سے اوپر کے دانتوں پر ہوا کو روکا جاتا ہے مثلاً ف وغیرہ۔

(ب) نوک زبانی

(3) دندانی: اس میں زبان کی نوک سے اوپری دانت پر تنفّسی بہاؤ (سانس کی ہوا) کو روکا جاتا ہے مثلاً ت۔
(4) لثوی: زبان کی نوک اور لثہ یعنی مسوڑھا مثلاً انگریزی کی ٹ آواز میں۔
(5) معکوسی: اس میں زبان کی نوک اوپر ہوکر پیچھے کی طرف مڑتی ہے اور پھر تالو کی طرف چھوتی ہے مثلاً اردو میں ٹ ڈ آوازوں میں

(ج) تالوئی:

(6) تالوئی: اس میں زبان کے مختلف حصے مختلف آوازوں کے لیے سخت تالو کی طرف جاتے ہیں۔ مثلاً ج چ د۔
(7) غشائی: زبان کا پچھلا حصہ اور نرم تالو جیسے ک گ وغیرہ۔
(8) لہاتی: اس میں زبان کا پچھلا حصہ اور کوامل کر ہوا کو روکتے ہیں جیسے ق۔
(9) حلقی: اس میں صوت تانت بند ہوکر ہوا کو روکتے ہیں جیسے عربی کے ع میں۔

طریقۂ ادائیگی/طرز تلفظ

- طریقۂ ادائیگی کی اصلاح رکاوٹ کے اس انداز کی نشاندہی کرتی ہے جس کی بنا پر آوازوں کی ادائیگی ہوتی ہے۔
- آوازوں کے طریقۂ ادائیگی کو عام طور سے مندرجہ ذیل سات قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(1) **بندشی** (Stop): وہ مصمتے (آوازیں) جن کے پیدا کرنے میں ہوا کا راستہ مکمل طور سے ایک لمحہ کے لیے بند ہو جاتا ہے ان آوازوں کو بندشی آواز میں کہا جاتا ہے۔

- اردو زبان میں بندشی آوازوں کی کل تعداد اکیس ہے۔ پ، پھ، ب، بھ، ت، تھ، د، دھ، ٹ، ٹھ، ڈ، ڈھ، چ، چھ، ج، جھ، ک، کھ، گ، گھ

(2) **انفی** (Nasal): اگر سانس کی ہوا کو منہ میں کسی جگہ مکمل طور سے روک دیا جائے تو انفی آوازیں بنتی ہیں۔ مثلاً اگر ہوا لثہ یعنی مسوڑھا پر روکی جائے تو 'ن' آواز بنتی ہے اور اس انفی مصمتے کو لثوی مصمتہ کہتے ہیں اور اگر ہوا ہونٹوں پر روکی جائے تو 'م' آواز بنتی ہے اور اس انفی مصمتے کو دولبی انفی مصمتہ بولتے ہیں۔

(3) **صفیری** (Fricative): وہ مصمتے (آوازیں) جن کی ادائیگی میں سانس کی ہوا (تنفّسی بہاؤ) کو خارج ہوتے وقت منہ میں کسی بھی جگہ راستہ کی تنگی کی وجہ سے رگڑ کے ساتھ گزرنا پڑے ان آوازوں کو صفیری آوازیں کہا جاتا ہے۔

- اردو میں صفیری آوازوں کی کل تعداد نو ہے:

(1) ف (2) و (3) س (4) ز (5) ش (6) ژ (7) خ (8) غ (9) ہ

(4) **پہلوئی** (Lateral): وہ آواز (مصمتہ) جس کی ادائیگی میں زبان کا وسطی حصہ آگے سے اوپر تالو سے لگ جاتا ہے۔اس آواز کو پہلوئی آواز کہتے ہیں جیسے 'ل'

- یادرہے کہ پہلوئی مصمتہ عام طور سے مسموع ہوتا ہے۔

(5) **ارتعاشی** (Trill): ارتعاشی طریقۂ تلفظ میں زبان کی نوک مسوڑھے کے قریب آکر کپکپاتی ہے۔ اسی ارتعاش یا کپکپاہٹ کی وجہ سے ان مصمتوں کو ارتعاشی مصمتہ کہتے ہیں۔

- اردو میں 'ر' ارتعاشی مصمتہ ہے۔
- یادرہے کہ ارتعاشی مصمتہ عام طور سے مسموع ہوتا ہے۔

(6) **تھپک دار** (Flap): اگر کسی مصمتے کی ادائیگی میں 'تلفظ کار' 'مقام ادائیگی' پر دستک سی دے کر ہٹ جائے تو اس مصمتے کو تھپک دار مصمتہ کہتے ہیں جیسے ڑ ڑھ تھپکدار مصمتہ ہے۔

(7) نیم مصمتہ (Semi Vowel): کہ اگر کسی مصمتہ کی ادائیگی میں تلفظ کار مقام ادائیگی تک اس طرح جائے کہ باہر آتی ہوئی ہوا میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ پڑے تو اس میں مصوتے جیسی کچی خصوصیات شامل ہوجاتی ہیں یعنی اس مصمتے میں کچھ ایسی خوبیاں شامل ہوجاتی ہیں جن میں سے کچھ مصوتوں میں اور کچھ مصمتوں میں ملتی ہیں۔اسی وجہ سے ان آوازوں کو نیم مصوتہ کہتے ہیں۔

- اردو میں 'ی' اور 'و' نیم مصمتے ہیں۔

مسموع (Viced): اگر کسی آواز کی ادائیگی میں صوت تانت میں ارتعاشی کیفیت پائی جاتی ہے تو وہ مصمتہ مسموع کہلاتا ہے۔

غیر مسموع (Voiceless): وہ مصمتے جن کی ادائیگی میں صوت تانت میں کسی قسم کی کوئی حرکت یا ارتعاش کی کیفیت نہیں پائی جاتی غیر مسموع کہلاتے ہیں۔

- اردو آوازوں کی ادائیگی جن مقامات سے ہوتی ہے اس کا تفصیلی جائزہ ملاحظہ ہو تاکہ اردو آوازوں کی ادائیگی میں مستعمل تلفظ کار اور مقام تلفظ کو بخوبی سمجھا جا سکے۔

(1) نچلا ہونٹ + اوپری ہونٹ = دولبی (پَ۔بَ)

(2) نچلا ہونٹ + اوپری دانت = لب دنتی (فَ۔وَ)

(3) زبان کی نوک + اوپری دانت = دنتی (تَ۔دَ)

(4) زبان کی نوک + اوپری مسوڑھا = لثوی (نَ۔سَ۔رَ)

(5)	زبان کی نوک	+	سخت تالو	=	معکوسی (ٹ۔ڈ۔ڑ)
(6)	زبان کا پھل	+	سخت تالو	=	تالوئی (چ۔ج)
(7)	زبان کا پچھلا حصہ	+	نرم تالو	=	غشائی (ک۔گ)
(8)	زبان کا پچھلا حصہ	+	کوا یا لہان	=	لہاتی (ق)
(9)	صوت تانت	+	صوت تانت	=	حلقی (ہ۔ح)

سمعیاتی صوتیات (Acoustic Phonetics)

- صوتیات کی دوسری اہم شاخ سمعیاتی صوتیات ہے۔
- آدمی کے منھ سے آواز نکلنے پر ہوا میں جو لہریں بنتی ہیں اور جن کو آواز کی لہریں کہا جاتا ہے ان کا مطالعہ سمعیاتی صوتیات میں کیا جاتا ہے۔
- ان لہروں کی رفتار 1100 سے 1200 فی سکنڈ ہوتی ہے۔

سماعی صوتیات (Auditory Plonetics)

- سماعی صوتیات، صوتیات کی وہ شاخ ہے جو آوازوں کے سماعی طریقۂ کار جائزہ پیش کرتی ہے۔
- دوسرے لفظوں میں سمعی صوتیات میں یہ دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ سننے کا عمل کیسے شروع ہوتا ہے اور آوازیں ذہن پر کیا تاثر قائم کرتی ہیں۔
- یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر تلفظی صوتیات بولنے کے عمل کا جائزہ پیش کرتی ہیت وسماعی صوتیات سننے کے عمل کو موضوع بحث بناتی ہے۔
- سننے کے عمل میں کان کا نمایاں رول ہوتا ہے۔اس عمل میں درج ذیل تین حصے کردار ادا کرتے ہیں۔
  (1) کان کا باہری حصہ (2) کان کا درمیانی حصہ (3) کان کا اندرونی حصہ
- آوازوں کی قسمیں اوران کی درجہ بندی
- یک رکنی اصوات وہ ہوتی ہیں جن کی ادائیگی میں کسی دوسری صوت کی مدد درکار نہیں ہوتی۔
- صوتیات میں انسانی آوازیں عام طور سے دو خاص قسموں میں تقسیم کی جاتی ہیں: (1) مصوتے (2) مصمتے
- یہ اصوات (مصوتے، مصمتے) عموماً ایک رکنی ہوتی ہیں۔

مصوتے (Vowels)

- جن آوازوں کی ادائیگی میں منہ کے اندر کسی قسم کی رکاوٹ نہیں آتی وہ مصوتے کہلاتی ہیں۔
- ان آوازوں کی ادائیگی کے وقت باہر آتی ہوا میں صوت تانت (Vocal Cord) کے قریب کچھ

اس طرح رکاوٹ ڈالی جاتی ہے کہ صوت تانت مرتعش ہو جاتے ہیں۔صوت تانت میں اس ارتعاش کی وجہ سے ایک گونج کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور مصوتے مسموع (Voiced) ہو جاتے ہیں۔

- یاد رہے کہ مصوتے ہمیشہ مسموع ہوتے ہیں اور ان کی ادائیگی میں صوت تانت کا مرتعش ہونا نمایاں رول ادا کرتا ہے۔
- اردو میں آٹھ مصوتے ہیں:(1) اَ(2) اِ(3) اُ(4) آ(5) اے (6) ای(7) او(8) اؤ
- ان میں سے پانچ طویل اور تین خفیف مصوتے ہوتے ہیں۔
- اردو میں دو دوہرے مصوتے ہوتے ہیں:(1) اَے (2) اَو

یعنی اردو میں کل دس مصوتے ہیں۔

- مصوتوں کی درجہ بندی کے لیے عام طور سے تین باتوں پر خاص توجہ دی جاتی ہے:
 (1) زبان کی اونچائی (2) زبان کا حصہ (3) ہونٹوں کی گولائی
- **مصمتے** (Consonants)
- جن آوازوں کی ادائیگی میں منہ/ دہنی جوف سے باہر آتی ہوا میں رکاوٹ پیدا ہو انھیں مصمتی آوازیں کہتے ہیں۔مثال کے طور پر 'پ' اس آواز کی ادائیگی میں باہر آتی ہوا کو دونوں ہونٹوں کے درمیان روکا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اسے مصمتہ کہا جاتا ہے۔جب کہ اس کے برعکس 'آ' کی ادائیگی میں منہ کھلا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ 'آ' مصوتہ ہے۔
- مصمتوں کی درجہ بندی میں چار بنیادی باتوں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔
 (1) مقام تلفظ (2) طریقۂ تلفظ (3) مسموعیت/ غیر مسموعیت (4) ہکاریت

نیم مصوتے:

- جن آوازوں میں صوت تانت تھرتھراتے ہیں لیکن زبان سے کوئی رگڑ یا رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی ہے۔انھیں نیم مصوتے کہتے ہیں۔
- انھیں نیم مصوتے اس لیے کہتے ہیں کہ یہ صوت رکن میں مصمتوں کے مقام پر آتے رہتے ہیں۔

دوہرے مصوتے

- یہ وہ مصوتے ہیں جن کو بولتے وقت ان کی خاصیت ایک مصوتے سے دوسرے مصوتے میں بدلنے لگتی ہے۔
- دوہرے مصوتوں کو ڈفیتھانگ کہتے ہیں۔
- دوہرے مصوتے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

- ایک وہ جن میں بل شروع میں زیادہ ہوتا ہے اور بعد میں کم یعنی شروع میں وہ ایک واضح نقطہ سے چلتے ہیں لیکن ایک مبہم نقطے پر ختم ہوتے ہیں ان کو گرتا ہوا مصوتہ کہتے ہیں۔
- دوسرے وہ جن میں بل شروع میں نہ ہو کر آخر میں ہوتا ہے یعنی شروع میں وہ ایک مبہم نقطے سے چلتے ہیں اورا یک واضح نقطے پر ختم ہوتے ہیں۔ان کو ابھرتے ہوئے مصوتے کہتے ہیں۔

قطعاتی خصوصیات

- مصوتے، دوہرے، مصوتے اور نیم مصوتے زبان کی قطعاتی خصوصیات ہیں۔ان کی وجہ سے الفاظ میں معنوی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔نیز انھیں آزادانہ طور پر ادا کیا جاسکتا ہے۔

صوت رکن

- صوتی اعتبار سے زبان کی ادائیگی کے وقت آوازیں گروپ میں تقسیم ہو جاتی ہیں جن کو تنفّسی گروہ (Breath Group) کہتے ہیں۔یہ گروہ صوت رکن کہلاتے ہیں۔
- کسی بھی زبان میں ایک سے لے کر پانچ یا چھ رکن کے الفاظ ہو سکتے ہیں۔اردو میں پانچ چھ رکن کے الفاظ مل جاتے ہیں۔مثلاً:

ایک رکن کے الفاظ	آ—دو— آج—شام
دو رکن کے الفاظ	کبھی—اکثر
تین رکن کے الفاظ	سلیقہ—بدزبان
چار رکن کے الفاظ	سلیقہ مند
پانچ رکن کے الفاظ	چہ میگوئیاں

نوٹ: اوپر دیے گئے مثالوں سے صوت رکن کو اچھی طرح سمجھ لیں کیوں کہ اس طرح کے سوالات اکثر پوچھے جاتے ہیں۔

- یادرہے کہ ایک لفظ میں صرف ایک مصوتے کا رکن ہوسکتا ہے جیسے آ۔لیکن صرف ایک مصمتے کا رکن نہیں ہوسکتا۔
- یہ بھی یادرہ کہ بغیر مصوتے کے کوئی رکن نہیں بنتا۔
- ایک لفظ میں ایک رکن کی ساخت اس میں شامل مصوتوں اور مصمتوں سے بنتی ہے۔
- جس رکن کی آخری آواز مصوتہ ہو وہ کھلا یا آزاد رکن (Open Syllable) کہلاتا ہے جیسے جا
- جس رکن کے آخر میں مصمتہ ہو وہ بند رکن (Checked or closed syllable) کہلاتا ہے جیسے شام۔

فونیمیات

(Phonology)

- فونیمیات میں کسی زبان کی اہم یا تفاعلی آوازوں کومعلوم کرنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
- یادر ہے کہ صوتیات میں آوازوں کی طرز ادائیگی کا جائزہ لیا جاتا ہے جب کہ فونیمیات میں صرف تفاعلی آوازوں کا جائزہ لیا جاتا ہے اوران کی تعداد کا تعین کیا جاتا ہے۔
- فونیمیات میں جن آوازوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے وہ ہر زبان میں محدود ہوتی ہیں اور عام طور سے پندرہ اور پچاس کے بیچ میں ہوتی ہیں۔
- فونیمیات میں سب سے چھوٹی اکائی فونیم ہے۔
- فونیم کسی زبان کی اہم آواز کو کہتے ہیں۔ اہم کے معنی ہیں کہ اس میں فونیم کے ہونے یا نہ ہونے سے معنی میں فرق پڑ جائے مثال کے طور پر اردو میں ایک لفظ مال ہے۔ اب اگر اس لفظ کے م آواز کو ہم ل سے بدل دیں تو لفظ کے معنی بدل جاتے ہیں اس طرح یہ ظاہر ہوا کہ م اور ل دو فونیم ہیں۔
- فونیم کے تعین کے لیے ایسے الفاظ کا تقابلی جائزہ لیا جاتا ہے جن میں آپس میں صرف ایک آواز کا فرق ہو۔ جیسے اوپر دی ہوئی مثال میں ہے۔ ایسے الفاظ کو ہم اقلی جوڑا کہتے ہیں۔
- فونیم کی ایک اور تعریف یہ ہے کہ ایک فونیم آوازوں کا ایسا کنبہ یا درجہ ہے جس کے ممبر صوتی اعتبار سے ایک سے ہوتے ہیں اور جو آپس میں تکمیلی تقسیم میں ہوتے ہیں۔ ان ممبروں کو اس فونیم کے ذیلی فونیم کہتے ہیں۔
- لسانیات میں آوازوں کو ان نشانوں میں عموماً دکھایا جاتا ہے جن سے ان کے بولے جانے کا طریقہ ظاہر ہو۔
- یہ نشان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک صوتی یعنی جس طرح بولے جاتے ہیں اور دوسرے فونیمی یعنی جس طرح اس آواز کو زبان کی ساخت میں رکھا جاتا ہے۔
- صوتی نشان کو مربع قوسین میں دکھایا جاتا ہے اور فونیمی نشانوں کو ترچھی قوسین میں۔

اردو میں فونیم

- معیاری اردو میں چھپن قطعاتی اور فوق قطعاتی فونیم ہیں۔
- قطعاتی فونیم میں 45 مصمتے (جس میں ایک نیم مصوتہ بھی شامل ہے) اور دس مصوتے (مع دو ہرے مصوتوں کے) شامل ہیں۔

اردو کے مصمتی خوشے

- دو یا دو سے زیادہ مصمتوں کا ایسا استعمال جن کے بیچ میں کوئی مصوتہ نہ ہو مصمتی خوشہ کہلاتا ہے۔

فوق قطعاتی خصوصیات(Suprasegmental Feature)

- فوق قطعاتی خصوصیات علم صوت یا صوتیات کی وہ اصطلاح ہے جو آوازوں کے ٹکڑوں کی ادائیگی کی نمائندگی کرتی ہے۔مثلاً سُر (Pitew) زور یا بل(Strees)اور اتصال کی مخصوص طرز ادائیگی۔
- سر، لہر، اور اتصال ایسی خوبیاں ہیں جن سے معنی بدلتا ہے لیکن ان خوبیوں کی اپنی کوئی آزاد حیثیت نہیں ہوتی اس لیے انھیں فوق قطعاتی خصوصیات تسلیم کیا جاتا ہے۔
- فوقیہ (Super fix)، غیر قطعاتی (Non Segmental) اور کثیر قطعاتی (Plurisegmental) فوق قطعاتی خصوصیات کی متبادل اصلاحات ہیں۔

ہکاریت(Aspiration)

- اگر کسی مصمتے کی ادائیگی میں منہ سے خارج ہوا کے جھونکے میں اضافہ کر دیا جائے تو اس مصمتے کو ہکاری مصمتہ کہتے ہیں۔
- یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ 'ہکاریت' وہ طریقۂ کار ہے جس میں منہ سے باہر آتی ہوا میں اضافہ کر دیا جاتا ہے جیسے ب اور بھ کیوں کہ ب کے تلفظ میں ہوا کے جھونکے میں اضافہ نہیں کیا جاتا ہے جب کہ بھ کے تلفظ میں ہوا کے جھونکے میں اضافہ کیا جاتا ہے اس طرح بھ ہکاری آواز ہے نہ کہ ب۔
- ہکاری آوازیں مسموع اور غیر مسموع دونوں طرح کی ہوتی ہیں۔
- یاد رہے کہ عربی اور فارسی میں ہکاری آوازوں کا وجود نہیں ہے۔
- اردو میں ہکاری آوازوں کے لیے علیحدہ حروف نہیں ہیں اس لیے جن حروف میں ہکاریت پیدا کرنی ہوتی ہے ان میں دو چشمی 'ھ' جوڑ دی جاتی ہے۔
- اردو میں گیارہ حرف یعنی پ، ب، ت، ٹ، د، ڈ، چ، ج، ک، گ اور ڑ میں 'ھ' کے اتصال سے علی الترتیب گیارہ آوازیں پھ، بھ، تھ، ٹھ، دھ، ڈھ، چھ، جھ، کھ، گھ، اور ڑھ وضع کیے ہیں جو ہکاری آوازوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔
- اس طرح اردو میں گیارہ ہکاری آوازیں ہیں۔
- بعض عالموں نے صوتیاتی نقطۂ نظر سے رھ، لھ، مھ، نھ کو بھی ہکاری آواز مانا ہے۔
- بعض عالموں کا خیال ہے کہ 'ھ' کا استعمال صرف ہکاری آوازوں کے لیے ہی استعمال کرنا چاہیے تاکہ 'بھار' اور 'بہار' یا 'گھر' اور 'گہر' جیسے الفاظ میں فرق کیا جا سکے۔

- یاد رہے کہ تحریر میں 'ل'، 'م'، 'ن' اور 'ڑ' کے ساتھ بھی 'ھ' جوڑی جاتی ہے، لیکن ان کی آوازوں یعنی لھ، مھ، نھ، اور رھ کو فونیمی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

نظامِ ہجا

- حرف: سادہ آوازوں کو تحریری علامات یا شکل میں لانے کا نام حرف ہے۔
- ایک سے زیادہ ملی ہوئی آوازوں کی تحریری علامتیں الفاظ کہلاتی ہیں۔
- ہجا میں حروف کی آواز اور ان کی حرکات و سکنات سے بحث کی جاتی ہے۔
- یاد رہے کہ حروف کے مجموعے کو ابجد کہتے ہیں۔
- یاد رہے کہ مولوی عبدالحق نے 36 کے بجائے حروف تہجی کی تعداد 50 بتایا ہے کیوں کہ انھوں نے ہکاری آوازوں کو بھی حروف گردانا ہے۔
- اردو میں دس مصوتوں کے لیے صرف چار حرف (ا، و، ی، ے) اور تین اعراب (زبر، زیر، پیش) استعمال ہوتے ہیں۔
- مد 'الف' پر صرف ابتدائی حالت میں 'آ' مصوتے کی آواز دیتا ہے۔ باقی حالتوں میں الف بغیر مد کے ہی 'آ' مصوتے کی آواز دیتا ہے۔
- الف ہر مصوتے کے لیے ابتدائی حالت میں استعمال ہوتا ہے۔ ضرورت کے لحاظ سے اس کے ساتھ زبر، زیر، پیش یا مد کا استعمال کیا جاتا ہے۔
- 'ی' کا استعمال صرف 'ای' مصوتے کے لیے ہوتا ہے۔
- 'ے' الف پر زبر کے ساتھ 'اَے' دوہر مصوتے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔
- 'و' کا استعمال تین مصوتوں کے لیے ہوتا ہے۔ یعنی الٹے پیش کے ساتھ 'او' کی آواز دیتا ہے یعنی طویل مصوتہ، الف پر زبر کے ساتھ 'اَو' کی آواز دیتا ہے یعنی دوہرا مصوتہ ہوتا ہے۔ جب الف اور واو بغیر اعراب کے ایک ساتھ آئے ہیں تو 'او' یعنی مجہول مصوتہ ہوتا ہے۔
- باقی مصوتوں کے لیے لفظ کے درمیان اور آخر میں زبر، زیر اور پیش کا استعمال بالترتیب اَ، اِ، اُ کے لیے ہوتا ہے۔

ہائے مختفی

- وہ 'ہ' جو لکھی جائے لیکن پڑھی نہ جائے ہائے مختفی کہلاتی ہے۔ یہ لفظ کے آخر میں زیر 'اِ' زبر 'اَ' اور مد 'آ' کی آواز دیتی ہے جیسے نہ، یہ، ہفتہ

ہائے ملفوظی:

- وہ 'ہ' جو لکھی جائے اور پڑھی بھی جائے یعنی تلفظ میں آئے اسے ہائے ملفوظی کہتے ہیں جیسے آہ، راہ، نباہ۔
- یادرہے کہ درمیان میں آنے والی 'ہ' ہمیشہ ملفوظی ہی ہوتی ہے جیسے بہار، نہار وغیرہ۔
- وہ واؤ جو لکھا جائے لیکن پڑھا نہ جائے وہ واو معدولہ کہلاتا ہے۔
- فارسی کے چند الفاظ میں جب یہ حرف 'خ' کے بعد آتا ہے اور اس کے بعد کوئی مصمتی حرف ہوتا ہے تو وہ 'اُ' مصوتے کی طرح تلفظ ہوتا ہے۔ مثلاً خوش، خود، خورشید اور برخوردار وغیرہ۔
- واو کے بعد اگر مصوتہ الف آتا ہے تو وہ 'وٗ' تلفظ میں نہیں آتا۔ مثلاً خواہ، خوار، خواب، خواہش، خواجہ اور تنخواہ وغیرہ۔
- یادرہے کہ 'ع' عربی میں حلقومی صفیری مصمتہ ہے لیکن اردو میں مصوتے کی آواز دیتا ہے۔
- ع حروف 'اُ، و، ی، ے، کے ساتھ اور تنہا اردو کے دس مصوتوں میں سے کسی ایک کی آواز دیتا ہے۔ جیسے عورت میں 'ع' 'اَوْ' کی 'عقل' میں 'اَ' کی سعود میں 'ع'، 'اؤ' کی عمر میں 'اُ' کی آواز دیتا ہے۔

معکوسی

- اردو میں چھ معکوسی آوازیں ہیں۔
- اردو کی چھ معکوسی (تین ہکاری اور تین غیر ہکاری) آوازوں کی نمائندگی کے لیے حروف پر 'ط' کی نشان لگایا جاتا ہے۔ اس طرح ٹ ڈ ڑ غیر ہکاری معکوسی آوازیں ہیں ٹھ، ڈھ، اور ڑھ ہکاری معکوسی آوازیں ہیں۔
- یادرہے کہ معکوسی آوازیں عربی یا فارسی میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

اضافت

- اضافت کی چند صورتیں مندرجہ ذیل ہیں۔ یادرہے کہ جس لفظ میں اضافت لگتی وہی جملے کے فعل کو متاثر کرتا ہے۔
- اگر لفظ 'ی'، 'ع' اور مصمتی حروف پر ختم ہو رہا ہے تو ان حروف کے نیچے اضافت زیر استعمال ہوتی ہے جو 'اے' مصوتے کا تلفظ دیتی ہے جیسے شمعِ فروزاں، آدابِ زندگی۔
- اگر لفظ ہائے مختفی پر ختم ہو رہا ہو تو اس پر اضافت ہمزہ لگتا ہے اور مصوتی تسلسل 'اَ+ ے' کا تلفظ ہوتا ہے جیسے نالۂ دل، پردۂ حیا۔
- اگر لفظ 'آ' اور 'اُوْ' مصوتوں (الف متحرک اور واو معروف) پر ختم ہو رہا ہے تو اس کے آگے یائے مہموز 'ے' کا اضافہ کر دیتے ہیں جیسے دریا + ے + لطافت = دریائے لطافت، بوٗ + ے + گل =

بڑے گل۔

- یاد رہے کہ عربی کے بعض مرکبات میں 'ال' کی اضافت استعمال ہوتی ہے۔
- اگر مرکب الفاظ میں 'ال' کے بعد لفظ حرف شمسی سے شروع ہو رہا ہو تو وہ حرف شمسی مشدد ہو جاتا ہے اور اضافت کے 'الف لام' تلفظ میں نہیں آتے جیسے واجب التعظیم، دار الشما میں ت اور ش مشدد ہو گئے ہیں اور ان دونوں مرکبات کے 'ال' تلفظ میں نہیں آتے ہیں۔

اگر مرکب الفاظ میں 'ال' کے بعد لفظ قمر حروف سے شروع ہو رہا ہو تو 'ال' کا تلفظ ہوتا ہے جیسے حب الوطن اور واجب الادا میں۔

- حروف شمسی مندرجہ ذیل ہیں:

ت، ث، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ال، ن

- حروف قمری مندرجہ ذیل ہیں:

الف، ب، ج، ح، خ، ع، غ، ف، ق، ک، م، و، ہ، ی



مارفیمیات/صرفیات (Morphology)

- زبان کی قواعد کے دو حصے ہوتے ہیں: (1) صرف (2) نحو
- صرف وہ شعبہ ہے جو لفظ کی ساخت سے بحث کرتا ہے جب کہ نحو میں فقروں اور جملوں کی اقسام سے سروکار ہوتا ہے۔
- مارفیمیات/صرفیات میں اس بات کا مطالعہ کیا جاتا ہے کہ زبان میں الفاظ کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے اور الفاظ آپس میں ایک دوسرے سے کس طرح کا رشتہ رکھتے ہیں۔
- یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مارفیمیات میں لفظ کی ساخت اور اس میں استعمال شدہ بامعنی اکائیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔
- مارفیمیات کی سب سے چھوٹی اکائی مارفیم ہے جس پر مارفیمیات کی بنیاد ہے۔
- مارفیم کا مطلب اردو میں 'صرفیہ' ہے۔
- ماہر لسانیات نے مارفیم ایک ایسے لسانی ٹکڑے کو کہا ہے جو بامعنی اور چھوٹی سے چھوٹی ہو جیسے اردو میں 'کتابیں' ایک لسانی بامعنی قطعہ یا ٹکڑا ہے لیکن یہ چھوٹے سے چھوٹا نہیں ہے کیوں کہ اس کو آگے بھی دو میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی 'کتاب' اور 'یں' یہاں پر 'یں' بامعنی ہے اس کے معنی ہیں جمع

یا ایک سے زیادہ۔اس طرح اس لفظ میں دو مارفیم 'کتاب' اور 'یں' ہیں۔

- مارفیم کی دو قسمیں ہوتی ہیں:(1) آزاد مارفیم (2) پابند مارفیم
- آزاد مارفیم وہ ہیں جو اکیلے آزادی سے استعمال ہو سکیں۔
- پابند مارفیم وہ ہیں جو بغیر کسی دوسرے مارفیم کے استعمال نہ ہو سکیں جیسے اوپر کی مثال میں 'کتاب' آزاد مارفیم ہے اور 'یں' ایک پابند مارفیم ہے۔
- یادرہے کہ ہندوستان میں مارفیمیات کے مطالعے کا آغاز ماہرلسانیات پانی (تقریباً 520 ق م تا 460 ق م) نے کیا تھا۔
- پانی نے اپنی تصنیف 'اشٹا دھیائے' میں سنسکرت صرفیات بلکہ لفظ سازی کے 3959 قاعدے بتائے ہیں۔

صرف اعمال (Morphological Process)

- صرف اعمال کی مدد سے گردان والے مختلف الفاظ کے درمیان ترکیبی اختلاف کو معلوم کیا جاتا ہے۔
- صرفی اعمال کسی ہیئت کے کسی طور بدلی ہوئی اشکال پر مشتمل ہوتے ہیں تاکہ مختلف مگر ایک دوسرے سے جڑی ہو سکیں۔
- صرف اعمال کی پانچ قسمیں ہوتی ہیں:

(1) تعلیقیت (2) داخلی تبدیلی (3) تکرار (4) صفر ترمیم (5) اشتقاق

تعلیقیت (Affirattion)

- وہ جز جو کسی ہیئت (Form) کے شروع، درمیان یا آخر میں جڑتا ہے اسے تعلیقیہ (Affix) اور اس عمل کو تعلیقیت کہتے ہیں۔
- تعلیقیہ کئی طرح کے ہوتے ہیں

(1) **سابقہ** (Prefix): سابقہ وہ تعلیقیہ ہے جو اپنا آزاد معنی نہیں رکھتا لیکن کسی بنیادی لفظ کے شروع میں جڑ کر اس کے معنی میں تبدیلی پیدا کر دیتا ہے۔

- کسی ہیئت/ بنیادی مفرد و مرکب لفظ/ آزاد صرفیہ یعنی مارفیم میں نئی ہیئت یا نیا لفظ بنانے کے عمل کو سابقہ سازی کہا جاتا ہے جیسے بےقدر میں بے سابقہ ہے اور قدر بنیادی لفظ، نالائق میں 'نا' سابقہ ہے۔

(2) **وسطیہ** (Infex) وسطیہ وہ تعلیقیہ ہے جو کسی مارفیم کے درمیان آتا ہے۔

(3) **لاحقہ** (Suffix): لاحقہ وہ تعلیقیہ ہے جو کسی ہیئت یا لفظ کے آخر میں آتا ہے جیسے کچھ اردو اسما کی جمع 'ات' کے اضافے سے بنتی ہے جیسے حالت سے حالات، مقام سے مقامات

- کسی ہیئت میں لاحقہ جوڑ کر ایک نئی ہیئت بنانے کے عمل کو لاحقہ سازی کہا جاتا ہے۔

داخلی تبدیلی(Internal Change)

- جب دو یا دو سے زائد الفظ، ہیئت اور معنی کے اعتبار سے مماثل یا قریبی ہوتے ہوئے بھی اپنی بنیادی ہیئت میں کوئی امتیازی صوت یا امتیازی اصوات کی وجہ سے مختلف ہوں تب ایسی صورت حال میں یہ مانا جائے گا کہ الفاظ کی گردان میں ایک لفظ دوسرے لفظ میں داخلی تبدیلی کی وجہ سے برآمد ہوا ہے جیسے ادب اور آداب۔

تکرار(Reduplication)

- اگر کسی لفظ کی بنیادی ہیئت مکمل یا جزوی طور پر داخلی تبدیلی کے ساتھ یا بغیر کسی داخلی تبدیلی کے بنیادی ہیئت سے قبل یا بعد میں دہرائی جائے تو ایسے صرفی عمل کو تکرار کہا جاتا ہے۔
- الفاظ کو دوہرانے کے اس عمل سے معنی یا تصورِ معنی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ''جاتے جاتے موسم نے اپنا کمال دکھایا'' میں ''جاتے جاتے''

صفر ترمیم(Zero Madification)

- جب دو الفاظ کی ہیئتوں میں اسی نوعیت کے الفاظ کی ایک اور جوڑی کے ساتھ اگر کوئی سابقہ، وسطیہ یا لاحقہ نہیں جڑے تو اس طرح کے صرفی عمل کو صفر ترمیم کہا جاتا ہے جیسے لفظ 'پودا' اور 'درخت' ذیل کی مثال ہیں۔

(1) باغ میں آم کا ایک پودا ہے۔

(2) باغ میں آم کا ایک درخت ہے

- دونوں جملوں کو دیکھتے ہوئے یہ مانا جائے گا کہ لفظ 'پودے' کے مقابلے میں 'درخت' میں صفر ترمیم ہوئی ہے۔

اشتقاق(Derivation) اور **تصریف**(Inflection)

- اشتقاق وہ عمل ہے جس میں اشتقاقی تعلیقیے جب کسی لفظ میں جڑتے ہیں تو نتیجتاً ایک نیا لفظ وجود میں آتا ہے۔
- اگر کوئی پیچیدہ لفظ کسی ترکیب میں اسی طرح آسکتا ہے جس طرح اسی زمرے کا کوئی سادہ لفظ آتا ہو تو پیچیدہ لفظ میں استعمال ہونے والے تعلیقیہ کو اشتقاقی تعلیقیہ کہتے ہیں جیسے باسلیقہ اور پھرتیلا میں 'با' اور 'یلا' اشتقاقی تعلیقیہ ہیں۔
- تصریف وہ عمل ہے جس کے تحت کسی لفظ میں تصریفی صرفیے (مارفیم) جڑ کے تعلیقیوں کے

ذریعے لفظ کی قواعدی کیفیات یعنی حالت، تعداد، جنس، صورت اور کیفیت وغیرہ کو ظاہر کرتے ہیں جیسے کھایا، کھائی، کھاؤ میں یا، ئی، ؤ تصریفی مارفیم ہیں۔

- اگر کوئی پیچیدہ لفظ کسی ترکیب میں اس زمرے کے سادہ لفظ کی طرح نہیں آ سکتا ہو تو پیچیدہ لفظ میں استعمال ہونے والے تعلیقیہ کو تصریفی تعلیقیہ کہتے ہیں۔
- دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشتقاق کے ذریعے نئے الفاظ وجود میں آتے ہیں جب کہ تصریف میں ایک ہی لفظ کی مختلف اشکال وجود میں آتی ہیں۔
- الفاظ کا ایک ایسا سیٹ (Set) جس میں سبھی الفاظ ایک مشترکہ اساس (Base) پر بنائے جائیں اور جن میں سبھی ممکنہ تعلیقیے جوڑے جا سکیں اس عمل کو گردان کہتے ہیں۔

جیسے اردو لفظ وفا کی اشتقاقی گردان یوں ہوگی:

وفا: وفادار، وفاداری، وفاشعار، وفاشعاری، بےوفا، بےوفائی، وفاپرست، وفاپرستی، وفاپرستانہ، وفاکش، وفاکشی

- وفا کی تصریفی گردان یوں ہوگی:

وفا، وفائیں، وفاؤں

- ایسے الفاظ جو ایک یا ایک سے زیادہ آزاد و پابند صرفیوں یعنی مارفیم کے اشتراک سے بنے ہوں پیچیدہ لفظ کہلاتے ہیں۔ جیسے دم، دم دار، جادوگر، ساہانہ،
- زبان میں پابند مارفیم دو طرح کے ہو سکتے ہیں تصریفی اور استقاقی۔
- تصریفی مارفیم قواعدی طور سے اہم ہوتے ہیں۔
- استقاقی مارفیم غیر قواعدی ہوتے ہیں۔

مارفیم، لفظ اور صوت رکن

- ایک لفظ ایک مارفیم بھی ہو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ ایک لفظ ایک مارفیم ہی ہو جیسے کرسی، ایک لفظ بھی ہے اور ایک مارفیم بھی ہے۔ ایک لفظ 'کرسیاں ایک لفظ تو ہے لیکن اس میں ایک کے بجائے دو مارفیم ہیں۔ 'کرسی' اور 'اں'
- ایک مارفیم ایک ایک صوت رکن بھی ہو سکتا ہے اور ایک مارفیم میں ایک سے زیادہ بھی صوت رکن ہو سکتے ہیں۔ جیسے دن ایک صورت رکن ہے اور ایک مارفیم ہے لیکن اجنبی میں تین صوت رکن ہیں لیکن یہ ایک مارفیم ہے۔

- لسانیات میں 'لفظ' کی تعریف یوں کی جاتی ہے کہ یہ ایسی آزاد شکل یا لسانی روپ ہے جو پورے طور سے دو یا دو سے زیادہ آزاد مارفیموں میں تقسیم نہ کیا جا سکے جیسے لفظ 'دل چسپ' کے چھوٹے ٹکڑے (بامعنی یعنی مارفیم) کریں تو 'دل' اور 'چسپ' ملتے ہیں۔ اس طرح اس میں ایک (چسپ) پابند مارفیم ہے اور دل آزاد مارفیم ہے۔ اس طرح دونوں روپ آزاد نہیں ہیں اس لیے یہ ایک لفظ ہے۔



- کسی زبان کے الفاظ کو مطالعہ کی آسانی کے لیے اور قواعد کے تجزیے کے لیے مختلف درجوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جن کو روایتی اصطلاح میں اقسام کلمہ کہتے ہیں۔
- یاد رہے کہ بامعنی لفظ کو کلمہ کہتے ہیں اور بے معنی لفظ کو مہمل کہتے ہیں۔
- کلمہ کی دو قسمیں ہیں:
  (1) مستقل کلمہ (2) غیر مستقل کلمہ

(1) مستقل کلمہ

- ایسے الفاظ یا کلمے جو اپنا معنی آپ دیتے ہیں 'مستقل کلمہ' کہلاتے ہیں جیسے 'زید نے عمرو کو مارا' میں زید، عمرو اور مارا مستقل کلمے ہیں۔
- مستقل کلمہ کی پانچ قسمیں ہیں: (1) اسم (2) صفت (3) ضمیر (4) فعل (5) تمیز

(1) اسم

- **اسم (Noun)**: وہ لفظ ہے جس سے کسی شخص، چیز یا جگہ کا نام ظاہر ہو جیسے علی، دہلی اور موبائل وغیرہ۔
- اسم کی دو قسمیں ہیں: (1) اسم خاص یا اسم معرفہ (Proper Noun) (2) اسم عام یا اسم نکرہ (Common Noun)
- (1) **اسم خاص یا اسم معرفہ** (Proper Noun): وہ اسم ہے جس سے کسی شخص، چیز یا جگہ کا خاص یا ذاتی نام ظاہر ہو جیسے وسیم، فاطمہ، پٹنہ، رانچی، سیوان، ہمالیہ اور شیر وغیرہ۔
- اسم خاص یا اسم معرفہ کی مندرجہ قسمیں ہیں۔
- **علم**: وہ اسم خاص ہے جو کسی شخص یا چیز کے وجود میں آنے کے وقت رکھا گیا ہو۔ تاج محل، ثنا۔
- **خطاب**: وہ اسم معرفہ ہے جو کسی بادشاہ، سرکار، دربار یا حکومت کی طرف سے اعزازی طور پر ملتا

ہے جیسے شمس العلما، خان بہادر، بھارت رتن، پدم شری اور سر وغیرہ۔

- **لقب**: وہ اسم خاص جو کسی خوبی یا وصف کی وجہ سے پڑ گیا ہو، یا لقب وہ اسم خاص ہے جو کسی شخص کی خوبی یا کمال کی وجہ سے مشہور ہوگیا ہے جیسے صدیق، حافظِ ملت، مردِ آہن، مجنوں، شاعر انقلاب وغیرہ۔
- **عرفیت**: وہ اسم خاص ہے جو شباہت، عادت، خصلت، محبت یا حقارت کی وجہ سے عرف عام میں مشہور ہو جیسے کلو، چندا، پنکی، سونی، بھورا، کفا۔
- **کنیت**: وہ اسم خاص ہے جو وطن، ماں باپ اور خاندان کے تعلق سے مشہور ہو جیسے ابن مریم، ابوحذیفہ، ابوسعد، ابوطالب اور ام عمارہ وغیرہ۔
- **تخلص**: وہ اسم خاص ہے جسے شاعر مقطع میں اپنے اصلی نام کے بجائے استعمال کرتا ہے، جیسے غالب، مرزا اسداللہ خان کا تخلص ہے، میر، میر تقی کا تخلص ہے۔
- **اسم عام یا اسم نکرہ**: وہ اسم ہے جو ایک قسم کے تمام افراد کے لیے فرداً فرداً استعمال ہو سکے جیسے آدمی، گھوڑا، درخت اور کتاب وغیرہ۔

* اسم عام کی اردو میں چند قسمیں ہیں:
(1) اسم کیفیت (2) اسم جمع (3) اسم ظرف (4) اسم آلہ

- **اسم کیفیت**: وہ اسم عام ہے جس سے کوئی خاص حالت یا کیفیت معلوم ہوتی ہے جیسے سختی، خوشی اور جلن وغیرہ۔
- اسم ظرف: وہ اسم عام یا اسم نکرہ ہے جس میں جگہ یا وقت کے معنی پائے جائیں جیسے گھر، چراگاہ، صبح اور شام وغیرہ۔
- اسم آلہ: وہ اسم نکرہ ہے جس سے آلہ یا اوزار کے معنی ظاہر ہوں جیسے تلوار، چاقو، ترازو اور ہل وغیرہ۔
- اسم جمع: وہ اسم ہے جو بظاہر واحد معلوم ہوتے ہیں مگر اصل میں کئی اسموں کا مجموعہ ہوتے ہیں جیسے فوج، قطار، جھنڈ اور انجمن وغیرہ۔

لوازم اسم

- ہر اسم میں لازمی طور پر کچھ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان خوبیوں کو لوازم اسم کہا جاتا ہے۔ لوازم اسم تین ہیں: (1) تعداد (2) حالت (3) جنس
- تعداد (Number): اسما یا چیزوں کی گنتی کو تعداد کہتے ہیں۔ مولوی عبدالحق کے الفاظ میں اسم عام

یا تو ایک ہوگا یا ایک سے زیادہ اسی کو تعداد کہتے ہیں۔

- اردو میں تعداد کی دو قسمیں ہیں (1) واحد (2) جمع
- واحد (Singular): تعداد کے اعتبار سے کسی اسم کا تنہا استعمال واحد کہلاتا ہے جیسے لڑکا، کتاب اور عورت وغیرہ۔
- جمع (Plural): تعداد کے اعتبار سے کسی اسم میں کثرت ہو تو اس کو جمع کہا جاتا ہے۔ جیسے لڑکے، کتب، کتابیں اور دروازے وغیرہ۔
- عبدالحق کے الفاظ میں ایک کو واحد اور ایک سے زیادہ کو جمع کہتے ہیں۔
- حالت (Case): وہ ہے جو کسی جملے میں اسم اور دوسرے اجزائے کلام خصوصاً فعل کے درمیان رشتہ قائم کرتی ہے۔ اردو میں اسم کی چند حالتیں ہیں:
- (1) فاعلی حالت (Nominative Case): یہ اسم کی وہ حالت ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کام کا کرنے والا ہے۔ یا وہ کسی خاص حالت میں ہے جیسے احمد گیا اور رام نے کھانا کھایا (یہاں رام اور احمد خاص حالت میں ہے)۔
- یاد رہے کہ اس حالت میں اسم کے ساتھ اس وقت 'نے' جب فعل متعدی اور صیغۂ ماضی ہو۔ اس کے علاوہ اسم کے ساتھ 'نے' کا استعمال نہیں ہوتا ہے، جیسے مندرجہ بالا مثال رام نے کھانا کھالیا میں رام کے بعد نے کا استعمال ہوا ہے کیوں کہ کھایا فعل متعدی صیغۂ ماضی ہے۔
- فاعلی حالت کی علامت بعض صورتوں میں 'نے' ہے۔
- (2) مفعولی حالت (Accusative Case): یہ اسم کی وہ حالت ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسم پر فعل کا اثر واقع ہوا ہے جیسے میں نے احمد کو مارا۔ یہاں مارنے کا اثر احمد پر واقع ہے اس لیے احمد مفعولی حالت میں ہے۔
- یاد رہے کہ جو اسم مفعولی حالت میں ہوتا ہے اس کے ساتھ کبھی 'کو، سے، کے، پر، کے لیے میں' آتے ہیں لیکن کبھی ان حروف میں سے کوئی بھی نہیں آتا ہے۔
- مفعولی حالت کی بنیادی علامت 'کو' ہے۔
- (3) ندائی حالت (Vocative Case): یہ اسم کی وہ حالت ہے جس سے کسی کا بلانا ظاہر ہو جیسے صاحبو! غور سے سنو:

* یاد رہے کہ ندائی حالت میں اگر واحد مذکر اسم کے آخر میں الف یا ہ ہو تو وہ یائے مجہول سے بدل جاتے ہیں جیسے لڑکے! شور نہ کر۔

* ندائی حالت میں جمع میں آخر کا نون گر جاتا ہے جیسے تولو! شور نہ کرو۔ لڑکیو! چپ بیٹھو۔
- **اضافی حالت (Genitive Case)**: یہ اسم کی وہ حالت ہے جس میں کسی ایک اسم کو دوسرے سے نسبت دی جائے یعنی ایک اسم کا علاقہ یا تعلق کسی دوسرے اسم سے ظاہر کیا جائے جیسے احمد کا قلم، یہاں قلم کا تعلق احمد سے بتایا گیا ہے۔ اس لیے یہ مضاف ہے اور جس سے نسبت یا علاقہ ظاہر کیا جائے اسے مضاف الیہ کہتے ہیں۔ اس جملے میں احمد مضاف الیہ ہے۔
- یاد رہے کہ حروف اضافت واحد مذکر میں (کا) جمع میں (کے) اور واحد اور جمع مونث (کی) آتے ہیں۔ ان کے علاوہ زیر، ہمزہ اور یائے مجہول کا استعمال ہوتا ہے۔
- **(5) ظرفی حالت (Locative Case)**: جس کسی اسم سے زمانی یا مکانی یعنی وقت یا جگہ کا مفہوم پایا جائے تو وہ ظرفی حالت میں ہوتا ہے جیسے وہ گھر میں ہے۔ وہ صبح سے کام کر رہا ہے۔
- **(6) خبری حالت (Indicative case)**: کسی جملے میں اگر اسم خبر کے طور پر آیا ہو تو اسے خبری حالت کہتے ہیں جیسے وہ بیمار ہے — عارف شاعر ہے — ان جملوں میں شاعر اور بیمار خبری حالت میں ہے۔
- **(7) طوری حالت**: جس سے طور، طریقہ، اسلوب، ذریعہ، سبب اور مقابلہ معلوم ہو جیسے شوق سے پڑھتا ہے۔ وہ مجھ سے بڑا ہے۔ وہ دولت کے بڑھا۔
- **جنس (Gender)**: اسما (Nourns) کی تذکیر و تانیث (Masculinity and feminity) کو جنس کہا جاتا ہے۔
- اردو میں جنس کی دو قسمیں ہیں۔ **مذکر** (Masculine) اور **مؤنث** (Feminine)، یہ جنس حقیقی (Natural) یا پھر غیر حقیقی (Unnatural) ہوتے ہیں۔
- **جنس حقیقی**: اسے کہتے ہیں جب اسم کی جنس کا تعین اس کے نر یا مادہ ہونے پر ہو یعنی نر اسم مذکر ہوگا اور مادہ اسم مونث۔
- **جنس غیر حقیقی**: جنس غیر حقیقی یا مصنوعی وہ ہوتا ہے جب وہ بے جان ہو جیسے قلم، علم، پاجامہ، شلوار اور دردو غیرہ۔

(2) صفت Adjective

- صفت: وہ مستقل کلمہ یا لفظ ہے جس سے کسی اسم کی حالت یا کیفیت یا کمیت ظاہر ہو یاد رہے کہ صفت ہمیشہ اسم کی حالت کو محدود کر دیتی ہے۔ جیسے بے کار لوگ اور جاہل آدمی۔

صفت کی پانچ قسمیں ہیں:

ﺟ صفت ذاتی (Qualitative Adjective): وہ ہے جس سے کسی اسم کی اندرونی حالت، کیفیت یا خصوصیت ظاہر ہو جیسے ہلکا، ٹھوس، سبز، شریر اور چالاک وغیرہ۔

ﺟ (2) صفت نسبی (Relative Adjective): وہ ہے جس میں کسی دوسری چیز سے لگاؤ یا نسبت ظاہر ہو جیسے بنارسی، سیوانی، مصاحی، مکی اور دہلوی وغیرہ۔

* یاد رہے کہ عموماً یہ لگاؤ اسما کے آخر میں یائے معروف کے بڑھانے سے ظاہر ہوتا ہے جیسے ہندوستانی وغیرہ۔

ﺟ (3) صفت عددی (Numerical Ajective): وہ ہے جس سے کسی اسم کی تعداد معلوم ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(الف) تعداد معین: وہ ہے جس میں کسی چیز کی تعداد ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جیسے پانچ آدمی اور چھ گھوڑے وغیرہ۔

(ب) تعداد غیر معین: وہ ہے جس سے کسی چیز کی تعداد ٹھیک ٹھیک نہ معلوم ہو جیسے کچھ، چند، کئی، بعض، سب، کُل، بہت اور تھوڑا وغیرہ۔

ﺟ (4) صفت مقداری (Quantitative Adjective): وہ ہے جس سے وزن یا ناپ تول معلوم ہو جیسے کلو، میٹر، سیر اور من وغیرہ۔

ﺟ (5) صفت ضمیری (Pronominal Adjective): وہ ضمیر ہے جو صفت کے طور پر استعمال ہوتی ہے اسے صفت ضمیری کہتے ہیں۔ جیسے وہ، یہ، کیا، کون اور جو وغیرہ۔

(3) ضمیر (Pronoun)

ﺟ ضمیر: وہ مستقل کلمہ یا لفظ ہے جو اسم کی جگہ استعمال ہوتا ہے جیسے ''غالب ایک عظیم شاعر ہیں اور وہ دلی کے رہنے والے ہیں'' میں 'غالب' اسم ہے اور 'وہ' ضمیر ہے۔

* اردو میں ضمیر کی پانچ قسمیں ہیں:

(1) ضمیر شخصی (2) ضمیر موصولہ (3) استفہامیہ (4) ضمیر اشارہ (5) ضمیر تنکیر

(1) **ضمیر شخصی** (Personal Pronoun): وہ ہے جو اشخاص کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس کی تین صورتیں ہیں۔

(1) متکلم: وہ جو بات کرتا ہے جیسے میں، ہم۔

(2) مخاطب: وہ جس سے بات کی جاتی ہے، جیسے تو، تم، آپ۔

(3) غائب: وہ جس کے متعلق بات کی جاتی ہے، جیسے یہ، وہ۔

- (2) **ضمیر موصولہ** (Relative Pronoun): وہ ہے جو کسی اسم کے بجائے آتی ہے مگر اس کے ساتھ ہمیشہ ایک جملہ ہوتا ہے جس میں اس کے اسم کا بیان ہوتا ہے۔ جیسے وہ کتاب جو کل چوری ہوگئی تھی مل گئی۔ اس میں جو ضمیر ہے وہ موصولہ ہے۔
- (3) **ضمیر استفہامیہ** (Introgative Pronoun): وہ ہے جو سوال پوچھنے کے لیے آتی ہے جیسے کون کہتا ہے، کیا چاہیے میں کون اور کیا۔
- (4) **ضمیر اشارہ** (Demonstrative Pronoun) وہ ہے جو بطور اشارہ استعمال ہوتی ہے جیسے 'وہ' (بعید کے لیے) 'یہ' (قریب کے لیے)۔
- (5) **ضمائر تنکیر**: وہ ہے جو غیر معین اشخاص یا اشیا کے لیے آئے، ضمائر تنکیر دو ہیں کوئی اور کچھ۔

(4) فعل (Verb)

- فعل: وہ ہے جس سے کسی کام کا کرنا یا کسی چیز کا ہونا ظاہر ہو جیسے تماشا شروع ہوا، ریل چلی وغیرہ۔

فعل کی بہ لحاظ معنی تین قسمیں ہیں:

(1) لازم (2) متعدی (3) ناقص

- (1) **فعل لازم** (Intransitive Verb): وہ ہے جو جس میں کسی کام کا کرنا پایا جائے، مگر اس کا اثر کام کرنے والے یعنی فاعل (Subject) تک رہے اور بس جیسے احمد آیا، پپیہا بولا۔
- (2) فعل متعدی (Transitive Verb): وہ ہے جس کا اثر فاعل سے گزر کر مفعول (Object) تک پہنچے (مفعول یعنی جس پر فعل واقع ہو) جیسے احمد نے خط لکھا۔ یہاں لکھا فعل، احمد فاعل اور خط (جس پر لکھنے کا فعل واقع ہوا ہے) مفعول ہے۔
- (3) **فعل ناقص**: وہ ہے جو کسی پر اثر نہ ڈالے بلکہ کسی اثر کو ثابت کرے جیسے احمد بیمار ہے۔ اس جملے میں فعل کا کرنا نہیں بلکہ ہونا پایا جاتا ہے احمد جو یہاں فاعل ہے کام کرنے والا نہیں بلکہ فعل کا سہنے والا ہے اور بیمار خبری حالت میں ہے۔
- یا یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایسا جملہ جس میں فاعل کے فعل کا اثر دکھائی نہ دے بلکہ اسم کی کیفیت ظاہر ہو "فعل ناقص کہلاتا ہے"

لوازم فعل

- افعال میں جنس اور تعداد کے علاوہ تین چیزیں اور بھی پائی جاتی ہیں:

(1) طور (2) صورت (3) زمانہ

- **(1) طور فعل:** وہ حالت ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کام خود فاعل سے صادر ہوا یا کام کا اثر کسی پر واقع ہوا۔ فعل کے طور دو ہیں (1) معروف (2) مجہول۔
- **معروف(Active Voice):** جب فاعل کے کام کا اثر کسی دوسری شے یا شخص پر واقع ہو تو اسے معروف کہتے ہیں جیسے احمد نے نوکر کو مارا۔ یہاں فاعل کے کام کا اثر نوکر پر واقع ہوتا ہے۔ بلفظ دیگر وہ فعل جس میں فعل کا فاعل معلوم ہو فعل معروف کہلاتا ہے۔
- **مجہول(Passive Voice):** وہ ہے جس میں صرف وہ شخص یا چیز معلوم ہو جس پر کام کا اثر واقع ہوا ہے۔ بلفظ دیگر وہ فعل جس کا فاعل معلوم نہ ہو فعل مجہول کہلاتا ہے (مجہول کے معنی نامعلوم کے ہیں) جیسے وہ مارا گیا۔ اخبار پڑھا جارہا ہے۔
- **(2) صورت(Mood):** ہر فعل کی کوئی نہ کوئی صورت ہوتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فعل (کام) کس ڈھنگ سے ہوا ہے۔

فعل کی پانچ صورتیں ہوتی ہیں:

(1) خبری (2) شرطی (3) احتمالی (4) امری (5) مصدری

- **خبری صورت(Indicative Mood):** وہ صورت ہے جو کسی واقعے، حادثے یا جذبے کی خبر دے جیسے حامد گر پڑا۔
- **شرطی صورت(Canditional Mood):** فعل کی وہ صورت ہے جس میں شرط یا تمنا پائی جائے۔ خواہ حرف شرط ہو یا نہ ہو جیسے وہ آتے تو میں بھی چلتا۔ اس میں بعض اوقات توقع اور خواہش کا بھی اظہار ہوتا ہے جیسے وہ آتا تو خوب ہوتا۔
- **احتمالی صورت (Subjunctive Mood):** فعل کی وہ صورت ہے جس میں احتمال یا شک پایا جائے جیسے اسی نے لکھا ہوگا۔
- **امری صورت (Imperative Mood):** فعل کی وہ صورت ہے جس میں حکم یا التجا پائی جائے جیسے خط لکھو، برائے کرم درخواست قبول کیجیے۔
- **مصدری صورت(Verbal mood):** فعل کی وہ صورت ہے جس میں کام کا ہونا بلا تعین وقت کے ہو۔ اس کے آخر میں ہمیشہ نا ہوتا ہے جیسے ہونا، کھانا اور کرنا وغیرہ۔ جیسے میں پڑھنا چاہتا ہوں۔"
- **(3) زمانہ(Tense):** قواعد میں زمانہ اسے کہتے ہیں جو وقت کے کسی خاص نقطے پر کسی فعل کے ہونے کو ظاہر کرے۔

- فعل کے لیے زمانہ کا ہونا ضروری ہے۔ زمانے تین ہیں (1) ماضی (2) حال (3) مستقبل
- یادر ہے کہ ہر فعل یا کام کا تعلق بہ لحاظ زمانہ ان تینوں میں سے کسی کے ساتھ ضرور ہوگا۔
- **ماضی (Past)**: گزرے ہوئے زمانے کو ماضی کہتے ہیں۔
- **فعل ماضی**: وہ کام جو گزرے ہوئے زمانے میں واقع ہوا ہو فعل ماضی کہلاتا ہے۔

فعل ماضی کی پانچ قسمیں ہیں:

- **(1) ماضی مطلق**: وہ ہے جس سے محض ایک فعل کے گذشتہ زمانے میں واقع ہونے کی خبر ملے جیسے کلیم گیا، سلیم بھاگا۔
- **(2) ماضی ناتمام**: وہ ہے جو ظاہر کرے کہ گذشتہ زمانے میں کام جاری تھا جیسے وہ کھار ہا تھا یا کھاتا تھا۔
- **(3) ماضی تمام یا ماضی بعید**: وہ ہے جو ظاہر کرے کہ گذشتہ زمانے میں کام ختم ہو چکا ہے جیسے میں دلی گیا تھا۔ تم آچکے تھے۔
- **(4) ماضی احتمالی یا شکیہ**: وہ ہے جس میں احتمال یا شک ہو جیسے وہ آیا ہوگا شاید وہ آیا ہو۔
- **(5) ماضی شرطیہ یا تمنائی**: وہ ہے جس میں شرط یا خواہش پائی جائے جیسے اگر وہ جاتا تو اچھا ہی ہوتا۔
- **حال**: موجودہ زمانے کو حال کہتے ہیں۔ حال کی چھ قسمیں ہیں:
- **(1) مضارع**: وہ ہے جو صاف صاف زمانۂ حال کو ظاہر نہیں کرتا بلکہ زمانۂ حال کے ساتھ اس میں کئی قسم کے معنی کی جھلک پائی جاتی ہے جیسے آپ آئیں، وہ کتاب لائے۔
- **(2) امر**: امر کے معنی حکم کے ہیں یہ عموماً حکم اور التجا کے لیے آتا ہے جیسے جاؤ، چلو، تشریف رکھیے۔
- **(3) حال مطلق**: جس سے زمانۂ حال عام طور پر بلا کسی تخصیص کے ظاہر ہوتا ہے جیسے آتا ہے، کھاتا ہے۔
- **(4) حال ناتمام**: وہ ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کام جاری ہے اور ابھی ختم نہیں ہوا جیسے وہ آرہا ہے وہ کھا رہا ہے۔
- **(5) حال تمام**: وہ ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کام ابھی ابھی ختم ہوا ہے جیسے وہ آیا ہے۔ پیغام لایا ہے۔
- **(6) حال احتمال**: وہ ہے جس سے زمانۂ حال کے کسی فعل میں احتمال پایا جائے جیسے وہ آتا ہے یا وہ آرہا ہے۔
- **مستقبل**: آنے والے زمانے کو مستقبل کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:
- **(1) مستقبل مطلق**: وہ ہے جس سے محض زمانۂ آئندہ پایا جائے جیسے وہ جائے۔

- (2) **مستقل مدامی:** وہ ہے جس میں آئندہ زمانے میں کام کا جاری رہنا پایا جائے جیسے کرتا رہے گا، چلتا رہے گا۔

* یادرہے کہ فعل کی گردان میں تین باتوں کا لحاظ ہوتا ہے۔ جنس، تعداد اور حالت وغیرہ۔
* فعل کی تین حالتیں ہیں غائب، حاضر اور متکلم۔ اور ان میں ہر ایک کی بہ لحاظ تعداد دو دو حالتیں ہیں۔ اس طرح کل چھ ہوئیں اور پھر بے لحاظ جنس ان چھ کی دو دو حالتیں ہیں۔ اس طرح ہر فعل کی بارہ حالتیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو صیغہ کہتے ہیں۔

- **فعل مثبت:** وہ فعل ہے جس میں کسی کام کا ہونا ثابت ہو فعل مثبت کہلاتا ہے۔ وہ جاتا ہے۔
- **فعل منفی:** وہ فعل جس میں کسی کام کا نہ ہونا ثابت ہو منفی کہلاتا ہے جیسے وہ نہیں جاتا ہے۔
- **متعلق فعل:** وہ الفاظ جو فعل کی مختلف حالتوں کو بیان کرتے ہیں جیسے طیبہ خوب پڑھتی ہے۔ اس جملے میں خوب کا لفظ فعل کی کیفیت کو بتا رہا ہے۔

(5) تمیز

- **تمیز:** وہ مستقل کلمہ یا لفظ ہے جو فعل یا صفت یا دوسری تمیز کے معنی میں کمی یا بیشی پیدا کرے یا اس کی کیفیت یا حالت بتائے جیسے زمان یا وقت کے لیے اب، جب، تب، کب، آگے، پیچھے، پہلے، آج کل، تڑکے، نت، سدا، پھر، ہمیشہ جلد، یکا یک، اچانک، ناگاہ اور شب و روز وغیرہ۔
- **مکان یا جگہ کے لیے:** یہاں، وہاں، جہاں، تہاں، کہاں، پرلے، پاس، باہر، اندر، اور بھیتر وغیرہ۔

(2) غیر مستقل کلمہ

- **غیر مستقل کلمہ:** ایسے الفاظ یا کلِمے جو دوسرے الفاظ یا کلموں سے مل کر معنی دیتے ہیں غیر مستقل کلمہ کہلاتے ہیں جیسے کو، تک اور جب وغیرہ۔ یادرہے کہ غیر مستقل کلمہ یا الفاظ کو 'حروف' بھی کہتے ہیں۔
غیر مستقل کلمہ یا حروف کی اردو میں چار قسمیں ہیں:
(1) حروف ربط (2) حروف عطف (3) حروف تخصیص (4) حروف فجائیہ
- **حروف ربط:** وہ ہیں جو ایک لفظ کا علاقہ کسی دوسرے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے کا، کی، کے، نے، کو، تئیں، سے، میں، تک اور پَر وغیرہ۔
- **حروف عطف:** وہ ہیں جو دو یا دو سے زیادہ لفظوں یا جملوں کو ملانے کا کام دیتے ہیں جیسے جوان اور بوڑھے سب تھے۔

- حروف عطف کی کئی قسمیں ہیں:
(1) وصل، جیسے اور، یا وغیرہ (2) تردید، جیسے نہ، خواہ، چاہے وغیرہ (3) استدراک جیسے پر، لیکن، بلکہ (4) استثنا جیسے مگر، الا وغیرہ (5) شرط جیسے جو، اگر (6) علت جیسے سو، پس، لہٰذا وغیرہ۔
- **حروف تخصیص:** وہ حروف ہیں جو کسی اسم یا فعل کے ساتھ آتے ہیں اور جو خصوصیت یا حصر کے معنی پیدا کرتے ہیں۔ حروف تخصیص یہ ہیں۔ ہی، تو، بھی اور ہر وغیرہ۔
- **حروف فجائیہ:** وہ الفاظ ہوتے ہیں جو جوش یا جذبے میں بے تحاشا زبان سے نکل جاتے ہیں۔ بلفظ دگر وہ کلمے یا الفاظ ہیں جو دلی خوشی، رنج وغم، تحسین اور نفرت کے اظہار کے لیے یکا یک زبان سے نکل جاتے ہیں جیسے ہیں ہیں، اوہو اور ہائے وغیرہ۔



اردو نحویات

- نحویات میں کسی زبان کی جملوں کی ساخت اور جملوں میں لفظوں کی ترتیب کے قاعدوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
- گلیسن کے مطابق جو ترکیبیں تصریف اور اشتقاق کے عمل سے بنتی ہیں انھیں اور بڑی بندشوں میں ترتیب دینے کے اصولوں کو نحو کہتے ہیں۔
- 'ہال' کے مطابق نحو ان طریقوں کا مطالعہ ہے جن میں الفاظ استعمال ہوتے ہیں جب کہ مارفیمیات ان طریقوں کا مطالعہ ہے جن سے لفظ بنتے ہیں۔
- ہاکیٹ کے مطابق نحو میں وہ طریقے شامل ہیں جن سے کلام میں الفاظ اور فوق قطعاتی مارفیموں کو ایک دوسرے کے رشتہ میں ترتیب دیا جاتا ہے۔
- گیان چند جین کے مطابق مارفیمیات لفظ کی ساخت کا مطالعہ کرتی ہے اور نحو لفظ سے بڑی ترکیبوں میں لفظوں کی ترتیب کا۔"
- یاد رہے کہ صرف ونحو کو ملا کر زبان کی قواعد کہا جاتا ہے۔

<u>نحو اور مارفولوجی میں فرق</u>

- نحو اور مارفولوجی میں فرق یہ ہے کہ مارفولوجی میں ہم لفظ کی سطح تک زبان کا مطالعہ کرتے ہیں جب کہ نحو میں دو یا دو سے زائد الفاظ (جملے تک) کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔
- یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مارفولوجی میں کسی زبان میں الفاظ کی ساخت، ان میں مارفیم کی ترتیب اور

مارفیم کی قسموں وغیرہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے جب کہ مختلف الفاظ کن اصولوں کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ترکیب میں اور پورے جملے میں استعمال ہوتے ہیں اس کا مطالعہ نحو میں ہوتا ہے۔

نحو کی بنیادی اصطلاحات

- **ترکیب:** الفاظ کے کسی بھی اہم گروپ یا گروہ کو ترکیب کہتے ہیں۔ بلفظ دیگر مارفیموں یا لفظوں کے بامعنی گروہ کو ترکیب کہتے ہیں۔ یادرہے کہ محض ایک مارفیم کی ترکیب نہیں ہوسکتی۔
- اس طرح ایک پورا جملہ بھی ایک ترکیب ہے اور صرف دو مارفیم کا بھی گروہ ایک ترکیب کہلاتا ہے۔ جیسے وہ بوڑھا شخص جو صبح آپ سے ملا تھا میرا دوست ہے۔ اس میں بوڑھا شخص، وہ بوڑھا شخص، جو کل آپ سے ملا تھا، میرا دوست وغیرہ سب ترکیبیں ہی ہیں اس طرح پورا ایک جملہ بھی ایک ترکیب ہے لیکن 'تھا'، 'میرا' ایک ترکیب نہیں۔
- یادرہے کہ ترکیب کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کم سے کم دو مارفیم یا الفاظ ہوں لیکن ترکیب میں دو ایسے مارفیم ہیں جس میں سے ایک پابند ہے تو یہ ترکیب نحوی نہ ہوکر مارفولوجیکل ترکیب ہوگی۔
- ترکیب کے تحت مرکب لفظ، فقرہ اور جملہ سب کچھ آسکتا ہے۔
- **شمول کار** (Constitute): یہ وہ ترکیب ہے جس میں ایک سے زیادہ مارفیم یا لفظ شامل ہوں۔ یہ خود کسی دوسری بڑی ترکیب کی مشمول ہوسکتی ہے۔
- **مشمول** (Constituent): یہ وہ مارفیم، لفظ یا ترکیب ہے جو کسی بڑی ترکیب کا جز ہو۔ یہ مشمول دوسرے شمول کاروں کے تعلق سے مشمول کار ہوسکتے ہیں۔
- **قریبی مشمول** (Immediate Constitutents): نحو میں کسی شمول کار کا تجزیہ دو دو مشمولوں میں کیا جاتا ہے۔ ایک شمول کار کو اول ان دو قریبی مشمولوں میں بانٹا جاتا ہے جو اس زبان کی قواعد کے تقاضوں سے فطری تقسیم کہلائے گی۔ پھر ہر قریبی مشمول کو اس کے قریبی مشمولوں سے پھاڑا جاتا ہے یہاں تک کہ مفرد مارفیم تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسے قریبی مشمولی تجزیہ کہتے ہیں۔
- یادرہے کہ جو ترکیب کسی دوسری ترکیب کی مشمول نہ ہو اسے جملہ کہتے ہیں۔
- جو مشمول کسی دوسرے مشمول پر مشتمل نہ ہو اسے مارفیم کہتے ہیں۔
- جملے کی خارجی قواعد نہیں ہوتی محض داخلی قواعد ہوتی ہے۔ مارفیم کی داخلی قواعد نہیں ہوتی محض خارجی قواعد ہوتی ہے۔
- **متعدد قریبی مشمول:** قریبی مشمولات میں عموماً دو دو کی تقسیم کی جاتی ہے لیکن بسااوقات تین بلکہ

اس سے بھی زیادہ اجزا میں تقسیم کرنی پڑتی ہے۔

- **غیر مسلسل قریبی مشمول:** کبھی کبھی قریبی مشمول کے ذیلی اجزا مسلسل نہیں ہوتے بلکہ ان کے بیچ کوئی دوسرا مشمول دخل درمعقولات کر دیتا ہے۔
- **ہم رو قریبی مشمول:** کلام میں سر درجے اور خط اختتامی یعنی سرلہر بھی ہوتی ہے۔ مکمل تجزیہ میں انھیں بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ سرلہر کا دکھانا قدرے مشکل ہوتا ہے اس لیے عام طور پر اسے تجزیہ میں حذف کر دیا جاتا ہے۔
- **روپ گروہ** (Constituent class یا From Class): ایک نحوی شمول کار ترکیب میں جو مشمول ہوتے ہیں ان میں سے ہر مشمول کے عوض بدل کر بعض دوسرے الفاظ رکھے جاسکتے ہیں اور بعض نہیں رکھے جاسکتے۔ جو الفاظ مبادلے میں آسکتے ہیں وہ مشمول کے روپ گروہ یا مشمول گروہ کہلاتے ہیں۔
- **ترکیبی سانچے:** مختلف روپ گروہوں کے ارکان کو جس طرح ملا کر ایک ترکیب تیار کی جاتی ہے اسے ترکیبی سانچا کہتے ہیں۔
- **ترتیب:** لفظ میں مختلف مارفیموں کی ترتیب مقرر ہوتی ہے۔
- ترکیبوں یعنی فقرہ یا جملہ میں بھی لفظ کے محل یا ترتیب کی اہمیت ہے۔
- ترتیب طرح طرح کی ہوتی ہے لیکن وہ کسی اصول کے تحت ہی ہوتی ہیں۔ ہر لفظ کو ایک دوسرے سے نہیں بدلا جاسکتا۔
- جملہ: ''وہ قواعدی روپ یا ترکیب جو کسی بڑی قواعدی ترکیب میں مشمول نہیں ہے یعنی جو آخری شمول کار ہے جملہ کہلاتا ہے۔
- یاد رہے کہ لسانیات میں جملہ کا تصور قواعدی جملے سے مختلف ہوتا ہے۔
- لسانیات میں جملہ سے ملتی جلتی دو اور اصطلاحیں موجود ہیں: (1) کلام (2) میکرو سگمنٹ
- ہر ترکیب یا فقرے میں کم از کم دو آزاد روپ شامل ہوتے ہیں۔ ان کی نوعیت کی بنا پر دو قسمیں کی جاسکتی ہیں۔
- (1) **دروں مرکزی ترکیب:** جس ترکیب کے قریبی مشمولوں میں سے ایک یا ایک سے زیادہ شمول کار کے روپ گروہ میں ہو یعنی اس کی جگہ لایا جاسکے وہ ترکیب دروں مرکزی ہوتی ہے مثلاً 'شریر لڑکا' اس ترکیب میں لڑکا کا روپ گروہ وہی ہے جو 'شریر لڑکا' کا۔ اس میں لڑکا مرکز اور شریر وصف ہے۔
- دروں مرکزی ترکیبیں خاص طور سے دو قسمیں ہوتی ہیں: (1) تال میل (2) توصیفی

- **بروں مرکزی ترکیب:** جس ترکیب کے قریبی مشمولوں میں سے کوئی بھی پورے شمول کار کے روپ گروہ میں نہیں ہوتا یعنی اس کی جگہ نہیں رکھا جا سکتا تو اسے بروں مرکزی ترکیب کہتے ہیں۔
- **(1) تال میلی:** یہ دو اجزا کو باہم ملاتی ہے۔اس کی تین ذیلی قسمیں کی جا سکتی ہیں:

(الف) عطفی: ان میں بالعموم 'اور' یا اس کے ہم معنی عطفی نشان کی مدد سے دو اجزا کو جوڑا جاتا ہے جیسے بچے اور بوڑھے اور اکثر و بیشتر وغیرہ۔

(ب) تردیدی: ان میں نشان گر (Marker) 'یا' کا استعمال ہوتا ہے جیسے کالا یا گورا آج یا کل وغیرہ۔

- **(2) توصیفی یا متبوعی:** توصیفی میں ایک جز و متصل سر یا مرکز ہوتا ہے اور دوسرا وصف اور ان کو ذیل کی تین قسموں میں بانٹا جا سکتا ہے:

(الف): وصف پہلے مرکز بعد میں: جیسے چالاک (وصف) لڑکا (مرکز) مضبوط (وصف)، دروازہ (مرکز)

(ب) مرکز پہلے وصف بعد میں: مزاج (مرکز)، شریف (وصف)، دل (مرکز)، ناداں (وصف) وَ

(ج) وصف غیر مسلسل اور مرکز بیچ میں جیسے ایسی حسین (مرکز) جیسی پری۔

- بروں مرکزی ترکیبوں کی تین قسمیں ہیں:
- (1) اشاری (2) ربطی (3) مسندی فقرے
- اشاری کی دو قسمیں ہیں: (1) معنوی (2) حرفی
- حرفی کی دو قسمیں ہیں: (1) حرف جاری (2) استدراکی یا شرطی
- نحوی تصریفی انسلاک کی تین قسمیں ہیں جن میں سے اردو انگریزی میں صرف دو رائج ہیں۔
- **توافق:** اس کے معنی ہیں کہ جملے کے کسی مخصوص لفظ کو کسی دوسرے لفظ کے موافق ہونا چاہیے۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

(الف) صفتی: صفت کی جنس یا تعداد یا دونوں موصوف کے مطابق ہوتی ہے۔ جیسے اچھا لڑکا، اچھے لڑکے اور اچھی لڑکیاں وغیرہ۔

(ب) فعلی: فعل کی جنس یا تعداد یا دونوں مفعول کے مطابق ہوتی ہیں جیسے لڑکے نے گنا کھایا یا لڑکی نے گنا کھایا۔ لڑکے نے روٹی کھائی یا لڑکی نے روٹی کھائی وغیرہ۔

- **متابعت:** جملے کی مختلف ترکیبوں میں بعض اجزائے کلام بالخصوص اسم اور ضمیر کا نحوی مقام ظاہر کرنے کے لیے تعریف کے خاص روپ بروے کار لائے جاتے ہیں۔اس عمل کو متابعت کہتے ہیں۔

- **جزو:** جزو ایک ایسا لفظ یا ایسی ترکیب ہے جو کسی بڑی ترکیب کا ایک حصہ ہو جیسے ''وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا میرا دوست ہے'' میں سارے الفاظ جزو میں ہی ہیں کیوں کہ وہ بڑی ترکیب یعنی جملہ میں ایک حصہ ہیں۔ اس طرح 'موٹا آدمی'، 'میرا دوست'، وغیرہ بھی جز ہیں لیکن 'تھا'، 'میرا' یا 'آدمی جو' یہ جزو نہیں ہیں کیونکہ وہ خود کوئی ترکیب نہیں ہیں اسی طرح یہ پورا جملہ بھی ایک جزو نہیں ہے کیوں کہ یہ کسی دوسری بڑی ترکیب کا کوئی حصہ نہیں ہے۔
- **جزوِ متصل:** یہ ان دو پابند چیزوں میں سے ایک ہے جن سے کوئی ترکیب بالواسطہ بنی ہو جیسے وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا میرا دوست ہے۔ اس میں دو جزوِ متصل ہیں وہ یہ ہیں: (1) وہ موٹا آدمی جو کل آپ سے ملا تھا (2) میرا دوست ہے۔
- یاد رہے کہ نحو میں کوئی بھی مطالعہ اور تحقیق کافی حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ کسی ترکیب یا جملہ کے اجزائے متصل کیا ہیں؟
- **آزاد فقرہ:** آزاد فقرہ سے مراد وہ فقرہ ہے جو اپنے آپ میں ایک اکائی ہوتا ہے اور مفرد جملہ میں صرف ایک ہی فقرہ کارفرما ہوتا ہے جیسے اچھی کتاب ہے۔ نیک لڑکا ہے۔
- **منحصر یا تابع فقرہ:** یہ وہ ذیلی جملہ ہے جو کسی دوسرے ذیلی جملے کے ساتھ مل کر کسی مرکب یا پیچیدہ جملے کا قریبی مشمول ہوتا ہے جیسے وہ کہتا ہے کہ وہ تھکا ہوا ہے۔ اگر تمھیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو ہمیں آواز دینا۔



اردو معنیات

- معنی کا مطلب ہوتا ہے قصد کیا ہوا، مراد، مطلب اور منشا وغیرہ۔
- معنیات میں کسی زبان کے معنی سمجھنے کے طریقوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
- معنیات لفظ اور اس کے معنی کی مختلف جہات کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔
- معنیات میں الفاظ اور جملوں کے مفہوم کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔
- یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ معنیات میں الفاظ اور جملوں کے لسانی مفہوم کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔
- اس کے دو طریقے ہوتے ہیں (الف) لفظ کے معنی بیان کرنا (ب) معنوی ارتباط کے لحاظ سے لفظ کی ساخت کا تجزیہ کرنا۔
- بقول گیان چند جین ''معنیات کے نقطۂ نظر سے مسلسل کلام کو جن اکائیوں میں بانٹا جاتا ہے وہ

مارفیم نہیں الفاظ ہیں..... معنیات میں لفظ کو اکائی ماننا ہی سب سے زیادہ عملی اقدام ہے۔ لغاتیات کے دو حصے ہوتے ہیں (i) لفظ کی ساخت کا تجزیہ کرنا یعنی لغاتی مارفیمیات (ii) لفظ کے معنی بیان کرنا یعنی لغاتی معنیات۔ اس طرح معنیات کا لغاتیات سے گہرا تعلق ہے معنیات کہنے سے زیادہ تر لغاتی معنیات مراد لیا جاتا ہے اس کے علاوہ نحوی معنیات بھی ہوتی ہے۔ جس میں جملہ کے اجزا، لفظوں کی ترتیب، روپ، گروہ صورت، حالت، مطابقت اور متابعت وغیرہ کے معنوی عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ ان ترکیبوں سے جو مفہوم ادا ہوتا ہے اسے ارتباطی معنی کہتے ہیں۔''

- معنی کی مختلف قسمیں ہیں:
- **لغوی و قواعدی معنی**
- یاد رہے کہ لفظ جملے کا سب سے چھوٹا بامعنی جزو ہوتا ہے لیکن جملہ سے الگ لفظ محض معنی دہندہ ہوتا ہے اس سے کوئی خاص مطلب یا مفہوم نہیں نکلتا۔
- لغت کے اعتبار سے لفظ کے جو معنی ہوتے ہیں اسے لغوی معنی کہا جاتا ہے۔ اس کو بنیادی یا حقیقی معنی بھی کہا جاتا ہے جیسے روغن کا معنی تیل اور عشوہ کا معنی ناز و ادا وغیرہ۔
- قواعدی معنی لفظ کے امدادی اجزا، حروف وغیرہ پر منحصر ہوتے ہیں اور ان کے آپسی رشتے کو ظاہر کرتے ہیں جیسے:

لغوی معنی	قواعدی معنی
وہ یہاں رہتا ہے	وہ مجھے ستاتا رہتا ہے
یہاں سے جاؤ	کھاتے جاؤ

- **حوالہ جاتی یا دلالتی معنی:** لفظ اگر مجرد ہو تو محض ایک تصور پارہ ہے لیکن کلام میں استعمال ہو کر اس کے مخصوص سیاقی معنی ہو جاتے ہیں۔ اگر قواعدی معنی سیاق کے اعتبار سے ہوتے ہیں اور ان میں حسب استعمال کچھ نہ کچھ دلالت شامل ہو جاتی ہے تو اسے حوالہ جاتی یا دلالتی معنی کہتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں:

(1) دلالت حقیقی: جس لفظ سے حقیقی معنی مراد ہوں۔

(2) دلالت التزامی: لغوی معنی کے علاوہ جب لفظ کو دوسرے معنوں میں بھی استعمال کیا جائے تو اسے 'دلالت التزامی' کہتے ہیں۔

- <u>**تعبیری معنی:**</u> تعبیری معنی ایک خاص تصور کے ساتھ منسلک اوصاف پر مشتمل ہوتا اور یہ ربط و ضبط، وقت، حالات اور ایک خاص ثقافت میں استعمال کیا جاتا ہے اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ تبدیلی بھی ہو جاتا ہے۔

- چیئر کے مطابق جب ایک لفظ دونوں مثبت اور منفی پہلو رکھتا ہے تو اسے تعبیری معنی کا لفظ کہا جاتا ہے۔
- **سیاقی معنی:** سیاقی معنی الفاظ یا جملے کو صورت حال اور استعمال کے تناظر میں دیکھنے سے بنتے ہیں۔ اس میں کسی مخصوص سیاق میں استعمال لفظ کے مفہوم کے ایک جز کے بجائے دوسرے جز پر زور دیا جاتا ہے۔ گویا مفہوم کے پہلے جز کا تعلق زبان سے ہوتا ہے اور دوسرے جز کا تکلم سے ہوتا ہے۔ سیاقی مفہوم اکثر مجازی معنی پر زور دینے سے ہوتا ہے۔ سیاقی معنی زمانہ، علاقہ، زبان اور محل استعمال اور صورت حال کے لحاظ سے مرتب ہوتا ہے۔
- **محاوراتی یا اصطلاحی معنی:** محاوراتی معنی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مجازی معنی زبان متفقہ طور پر رائج ہو کر مستحکم ہو گئے ہوں۔
- **موضوعاتی معنی:** موضوعاتی معنی میں دیکھا جاتا ہے کہ کس طرح ایک جیسے جملہ میں موضوع کی تبدیلی مفہوم کی تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔
- خاص لفظ یہ خاص معنی کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں اسم اور فعل وغیرہ ہوتے ہیں۔
- **معاون یا امدادی لفظ:** ان میں حروف جار، شرط وغیرہ، امدادی فعل اور بعض ضمیر ہوتے ہیں۔
- صفت اور تمیز کبھی خاص نقطہ ہوتے ہیں اور کبھی معاون لفظ۔
- خاص لفظ لغاتی معنیات کا کام دیتے ہیں اور معاون یا امدادی لفظ نحوی معنیات کا۔
- معنیات میں زیادہ تر لغاتی معنی سے سروکار رہتا ہے جس کے لیے لفظ اکائی کا کام دیتا ہے۔

معنوی ارتباط

- لفظ کے بنیادی معنی کو لغوی یا مرکزی معنی کہتے ہیں۔
- لفظ کے معنی زمانہ، علاقہ، زبان اور سیاق کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ تخصیصی، تعظیمی اور تنزلی معنی اختیار کر لیتے ہیں۔
- معنوی ارتباط کے تحت مختلف ذیلی زمرے شامل ہیں جیسے:
- **ترتیب:** معنیات میں ترتیب یا معنیاتی میل سے مراد ایسی ترتیب لفظی و معنوی ہے جس میں ایک صفت مختلف اسما کے ساتھ استعمال ہو اور معنوی سطح پر ہر ایک ترکیب میں قدرے جداگانہ معنی دے جیسے نیک سیرت، نیک بخت، نیک منش، نیک نام اور نیک نیت وغیرہ۔ یہاں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ نیک ہر ایک ترکیب میں قدرے مختلف معنی دے رہا ہے۔
- **انتخابی پسند:** معنیات میں انتخابی پسند سے مراد الفاظ کا بامعنی اور مناسب ترین امتزاج و استعمال

ہے جس کے تحت کلمہ یا کلام یا پھر الفاظ سیاق وسباق کے لحاظ سے معنی کا انتخاب کرتے ہیں۔ا نتخابی پسند میں ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے جوڑنے کی پوری آزادی ہوتی ہے۔مثال کے طور پر لفظ 'بہاؤ' کے لیے کوئی واضح حد مقرر نہیں ہے مثلاً جذبے کا بہاؤ ہوا کا بہاؤ اور پانی کا بہاؤ وغیرہ۔

- **انتخابی پابندی:** معنیات میں انتخابی پابندی سے مراد کلام/ الفاظ کے استعمال میں کی جانے والی پابندی قواعد کے ساتھ ساتھ سیاق وسباق میں بھی ہوتی ہے۔عام طور پر الفاظ بعض دیگر الفاظ کے ساتھ مل کر معنی پیدا کرتے ہیں۔صرف قواعد کی رو سے جملے کی ساخت کا درست ہونا معنی کی صداقت پر دلالت نہیں کرتا جیسے (1) گھوڑا دہاڑتا ہے (2) شیر ہنہناتا ہے (3) بکری میومیو کرتی ہے۔
مندرجہ بالا جملے میں معنوی ارتباط کی خلاف ورزی ہوتی ہے اگر چہ قواعد کے رو سے جملہ درست ہے۔
- **ہم آہنگی:** اس کے تحت الفاظ یکساں نوعیت کے وافر معنی پیش کرتے ہیں یہ الفاظ دیگر ایک لفظ کی ایک سے زائد معنوی مطابقت کو معنوی ہم آہنگی کہتے ہیں۔
- **مترادفیت:** مترادف وہ الفاظ ہوتے ہیں جن کے معنی یکساں ہوں جہاں دو لفظ میں سے ایک کی جگہ دوسرا بے تکلف استعمال کیا جا سکتا ہے۔
- **ہم اسمی:** جب دو یا دو سے زیادہ الفاظ کی صوتی ہیئت بالکل یکساں ہوں لیکن اس کے معنی میں بہت زیادہ فرق ہو تو انھیں ہم اسم کہتے ہیں۔جیسے میں کل آؤں گا، کسی کروٹ کل نہیں پڑتی۔ پہلے میں کل بمعنی گزرا ہوا دن اور دوسرے میں میں کل بمعنی راحت وچین کے ہے۔
- **کثیر معنویت:** اس لفظ کو کہتے ہیں جس کے کئی معانی ہوں جیسے 'بار' اس کے معانی ہیں (مرتبہ، دفعہ اور بوجھ وغیرہ)
- **محاورہ:** محاورے اہل زبان میں مستعمل وہ مخصوص فقرے ہیں جن کا کم از کم ایک لفظ مجازی یعنی غیر لغوی معنی میں لیا گیا ہو اور اس مجازی معنی پر اہل زبان میں عام طور پر اتفاق ہو۔
- اردو میں ضروری ہے کہ محاورے میں کم از کم دو لفظ ہوں اور ان میں سے کم از کم ایک لفظ مجازی یعنی غیر لغوی معنی میں استعمال کیا گیا ہو۔تنہا لفظ کو بھی محاورہ نہیں کہہ سکتے۔
- اردو میں محاوروں کی دو ساخت مرغوب ہیں:

(1) **وصفی یعنی صفت موصوف:** ان میں صفت مجازی معنی میں آئی ہے۔جیسے کڑوی بات میٹھے بول، چکنا گھڑا اور ٹیڑھی کھیر وغیرہ۔آخری دو مثالوں میں دونوں اجزا مجازی معنی میں آئے ہیں۔

(2) **فعلی:** ان کا دوسرا جز فعل ہوتا ہے اور مجازی معنی کا اس پر زور ہوتا ہے جیسے نظر پر چڑھنا، ہاتھ اٹھانا کمر کسنا وغیرہ۔

- معنیات کی دو اہم شاخیں ہیں: (1) بیانی معنیات (2) تاریخی معنیات
- **<u>بیانی معنیات</u>:** معنی کے علم کا تجزیاتی مطالعہ بیانی معنیات کہلاتا ہے۔
- بیانی معنیات میں معنی کی تعریف، علامت و رموز کا تعلق، صوتی نام، مفہوم کی خصوصیات، نام اور مفہوم کے تعلق کی مختلف صورتوں پر غور کیا جاتا ہے۔
- **تاریخی معنیات:** معنی کے علم کا عصریاتی مطالعہ تاریخی معنیات کہلاتا ہے۔
- تاریخی معنیات معنی کے ارتقا یعنی معنوی تبدیلی کے مطالعہ کا نام ہے اور اس کا موضوع تبدیلی کی نوعیت معنوی، تبدیلی کے اسباب اور ان اسباب کی گروہ بندی۔ معنوی تبدیلی کے مظاہر اور معنوی تبدیلی کے قوانین پر بحث کرنا ہے۔



اردو ساخت کے بنیادی عناصر

- اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے جس کا بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے میں کھڑی بولی نے اہم رول ادا کیا ہے۔
- اردو پر برج، پنجابی، گجری، ہریانی اور دکنی بولیوں کے اثرات بھی ملتے ہیں۔
- اردو کو ضبط تحریر میں لانے کے لیے عربی فارسی حروف کا استعمال کیا جاتا ہے۔
- اردو کا رسم الخط عربی فارسی ہے بلکہ عربی فارسی رسم الخط کی توسیع شدہ شکل ہے۔

اردو حروف تہجی

- عہد حاضر میں جدید لسانیاتی اصولوں اور سائنسی انداز پر اردو کے جو قاعدے ترتیب دیے گئے ہیں ان میں حروف تہجی کی کل تعداد 36 متعین کی گئی ہے۔
- انشاء اللہ خان انشا نے اردو حروف تہجی کی تعداد 85 بتائی ہے۔
- پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کے نزدیک اردو حروف تہجی کی تعداد 47 ہے۔
- مولوی عبدالحق نے قواعد اردو میں 36 کے بجائے حروف تہجی کی تعداد 50 بتایا ہے کیونکہ انھوں نے ہکاری آوازوں کو بھی حروف گردانا ہے۔
- ہائیہ آوازوں والی تحریری شکلوں مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، کھ، گھ، وغیرہ کو مفرد حروف کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، کیوں کہ یہ حرف کی تعریف پر پوری نہیں اترتیں۔

- لسانیات کی رو سے 'حرف' سب سے چھوٹی تحریری اکائی ہوتی ہے جس کے مزید ٹکڑے نہیں کیے جاسکتے۔
- اب اس تحریری اکائی کو لسانیاتی اصطلاح میں 'ترسیمہ' کہتے ہیں مثلاً ب ت پ ج گ وغیرہ۔
- مخلوط حروف مثلاً پھ بھ، تھ، جھ، دھ، کھ وغیرہ کو حرف یا سب سے چھوٹی تحریری اکائی (ترسیمہ) کا درجہ اس لیے نہیں دیا جاسکتا کہ ان کی تشکیل دو تحریری عناصر پ + ھ (= پھ) یا د + ھ (= دھ) کی ترکیب سے عمل میں آتی ہے۔ اسی لیے انھیں اردو کے حروف تہجی میں شمار نہیں کیا جاسکتا۔
- ہمزہ بھی اردو میں حرف نہیں ہے بلکہ محض ایک تحریری علامت ہے جس کا استعمال مصوتی تسلسل کے لیے کیا جاتا ہے مثلاً بھائی فائدہ ہوئی وغیرہ۔
- بہ استثنائے ہمزہ اردو حروف تہجی کی کل تعداد 36 ہے۔
- بعض لوگوں نے ہمزہ کو بھی حرف مانا ہے اور ان کے نزدیک 37 حروف تہجی ہیں۔
- عربی حروف تہجی کی کل تعداد 28 ہے جو مندرج ذیل ہیں:

ا ب ج د	ہ و ز	ح ط ی	ک ل م ن	س ع ف ص
اَبجَدْ	ہوّزْ	حُطّی	کلمن	سعفص
ق ر ش ت	ث خ ذ	ض ظ غ		
قرشت	ثخذ	ضظغ		

- اردو کے حروف تہجی میں 28 عربی کے حروف، چار فارسی کے اور چار وہ نئے حروف جو خود اردو میں وضع کیے گئے یعنی کل 36 حروف شامل ہیں۔
- اردو میں جو چار نئے حروف وضع کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

  ٹ، ڈ، ڑ، ے
- اردو رسم الخط نے اعراب و علامات مثلاً زبر، زیر، پیش، مد، الٹا پیش، ہمزہ، تشدید اور جزم وغیرہ عربی فارسی سے مستعار لیے ہیں۔
- اردو کے تحریری نظام میں تنوین (مثلاً فوراً)، الف مقصورہ (مثلاً عیسیٰ)، الف وصل (مثلاً دارالحکومت)، کسرۂ اضافت (مثلاً چراغِ محفل) اور واوِ معدولہ (مثلاً خوش) وغیرہ کو عربی فارسی رسم الخط سے لیا گیا ہے۔
- اردو کا طرزِ تحریر اور اندازِ کتابت 'نستعلیق' کہلاتا ہے۔
- خطِ نستعلیق کا ارتقا ایران میں ہوا تھا۔

- ایران کے خواجہ میر علی تبریزی نے عربی کے دو رسوم خط 'نسخ' اور 'تعلیق' کو ملا کر ایک نیا رسم خط ایجاد کیا تھا جو نستعلیق کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اردو کے لیے آج یہی رسم خط مروج ہے اور یہ اردو کا اپنا رسم خط بن گیا ہے۔
- اردو کا صوتی نظام مختلف زبانوں سے آئی ہوئی آوازوں کا مجموعہ ہے۔
- اردو میں خالص ہند آریائی یا ہندی الاصل آوازیں، خالص عربی آوازیں، خالص فارسی آوازیں اور دو یا تین زبانوں کی مشترک آوازیں پائی جاتی ہیں۔
- اردو ہند آریائی زبان ہے اس لیے اس میں خالص ہندی نژاد آوازوں کی تعداد زیادہ ہے مثلاً ٹ، ڈ، ڑ، بھ، پھ، تھ، دھ وغیرہ۔
- اردو میں ہندی نژاد (ہند آریائی ماخذ سے تعلق رکھنے والی) آوازوں کے علاوہ عربی و فارسی کی چھ آوازیں بھی ہیں۔

(1) لب دندانی صفیری : ف　　(2) لثوی صفیر : ز
(3) حنک لثوی صفیری : ژ　　(4) غشائی صفیری (غیر مسموع) : خ
(5) غشائی صفیری (مسموع) : غ　　(6) مہاتی بندشی : ق

- اردو میں ذ، ض، ظ، کے لیے 'ز' — ث، ص کے لیے 'س' — ح کے 'ہ' — اور 'ط' کے لیے 'ت' کی آواز مقرر کی گئی ہے۔
- مسعود حسین خاں ذ، ض، ظ، ث، ص، ح اور ط کو 'زائد حروف' کہتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جنھیں اردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے، صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے۔
- یاد رہے کہ اردو میں عربی الفاظ براہِ راست عربی زبان سے داخل نہیں ہوئے بلکہ فارسی کے توسط سے اردو میں آئے ہیں۔ اردو نے ان الفاظ کو اپنی زبان کے مزاج و منہاج اور صوتی آہنگ کے مطابق اختیار کیا ہے۔
- اردو کی تمام ضمیریں (غائب، حاضر، متکلم) سنسکرت اور پراکرت سے ماخوذ ہیں۔
- ضمائر کی طرح اردو کے تمام افعال بھی ہندی الاصل ہیں۔
- اردو کے بنیادی حروف یا بنیادی ترسیموں کی تعداد 18 قرار دی گئی ہے۔
- اردو میں جب ایک حرف دوسرے حرف کے ساتھ ملا کر لکھا جاتا ہے تو اس کی شکل قدرے بدل جاتی ہے۔ حرف کی اس بدلی ہوئی شکل کو ترکیبی شکل کہتے ہیں۔

- لسانیاتی اصطلاح میں حرف کی بدلی ہوئی یا ترکیبی شکل کو 'ذیلی ترسیمہ' کہتے ہیں۔
- اردو کے تمام 36 حروف ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر لکھے جا سکتے ہیں اور اپنی ترکیبی شکلیں وضع کر سکتے ہیں۔ لیکن نو حروف یعنی ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و ایسے ہیں جو اپنے بعد کے کسی بھی حرف کے ساتھ ملا کر نہیں لکھے جا سکتے۔
- اردو رسم الخط میں بنیادی اور اولین حیثیت حروف اور ان کی ترکیبی شکلوں یا ذیلی حروف کو حاصل ہے۔
- اردو رسم الخط میں اعراب و علامات کی حیثیت ثانوی ہے۔
- اعراب و علامات ایک قسم کے مختصر تحریری نشانات ہوتے ہیں۔
- اردو رسم الخط میں اعراب و علامات مصوتی (Vocalic)، مصمتی (Consonantal)، غنائی (Nasalizational) اور قواعدی (Grammatical) کردار ادا کرتے ہیں۔
- اعراب و علامات کی گروہ بندی (الف) مصوتی (ب) مصمتی (ج) غنائی اور (د) اضافی علامات کے طور پر کی گئی ہے۔

الف مصوتی علامات

- مصوتی علامات مصوتوں (Vowels) یا مصوتی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہے۔ ان کا استعمال بالعموم مصوتوں اور بعض مصمتوں/نیم مصوتوں کی نمائندگی کرنے والے حروف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔
- مصوتی علامات کی تعداد نو ہے:

(1) زبر (َ) (2) زیر (ِ) (3) پیش (ُ) (4) مد (ٓ)
(5) کھڑا زیر (ٖ) (6) الٹا پیش (ٗ) (7) کھڑا زبر (ٰ) (8) الٹا جزم (^)
(9) ہمزہ (ء)

(ب) مصمتی علامات

- مصمتی علامات مصمتوں (Consonants) یا مصمتی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کا استعمال مصمتوں کی نمائندگی کرنے والے حروف کے ساتھ ہوتا ہے۔
- مصمتی علامات چار ہیں:

(1) تشدید (ّ) (2) دوچشمی (ھ) (3) جزم (ْ) (4) تنوین (ً)

- نوٹ: دوچشمی ھ کا شمار اردو کے حروف تہجی میں نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یہ محض ایک علامت ہے حرف نہیں۔ اس سے مصمتی آوازوں کی ہائیت (ہکاریت) ظاہر کی جاتی ہے مثلاً پھ بھ تھ دھ وغیرہ۔

(ج) غنائی علامات

- یہ وہ علامات ہیں جو غنہ یا انفیت کو ظاہر کرتی ہیں۔
- اردو رسم الخط میں غنہ کو ظاہر کرنے کے لیے دو علامتیں رائج ہیں۔

(1) نون غنہ (ں) (2) الناقوس (ٮ)

(د) اضافی علامات:

- اضافی علامات اضافت یعنی نسبت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔
- اضافی علامات کے استعمال سے کا، کی، کے، کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔
- اضافی علامات تین ہیں:

(1) زیر (3) ہمزہ (4) بڑی ے (یائے مجہول)



دکنی اردو کی لسانی خصوصیات

- دکنی اردو میں ضمائر کے لیے جتنے الفاظ ملتے ہیں وہ شاید ہی کسی اور ہندوستانی زبان میں ملیں۔ ہمنا، ہمیں، تمنا، تمھیں، مج اور منج وغیرہ۔
- دکنی اردو میں الفاظ کی تکرار سے بعض وقت تاکید، بعض جگہ مبالغہ تو کبھی تعمیم اور کبھی کثرت کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے۔
- دکنی اردو میں الفاظ کی تکرار کرتے وقت پہلے لفظ کے آگے 'ے' کا اضافہ کردیا جاتا ہے جیسے بال بال کی جگہ بالے بال، رگ رگ کی جگہ رگے رگ، جنگل جنگل کی جگہ جنگلے جنگل اور ٹھار ٹھار کی جگہ ٹھارے ٹھار۔
- الفاظ کی تکرار کے سلسلے میں دکنی میں 'ے' کے علاوہ 'ی، ن' کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے عشق نے کھیل کھیلیا ٹھارین ٹھار۔
- حروف عطف دو جملوں یا کلموں کو ملاتے ہیں۔ اردو میں 'اور'، 'و' اور 'یا' حروف عطف ہیں اردو کے عام قاعدے کے مطابق ایک ساتھ دو حروف عطف نہیں آتے لیکن دکنی زبان کی یہ خاصیت ہے کہ اس میں بعض وقت دو حروف عطف آتے ہیں جیسے۔

قد رعنا و ہنوز لٹکتا چال (محمد قلی)

- دو جملوں کے درمیان حروف استدراک آتے ہیں۔ پہلے جملے میں جو شبہ ہوتا ہے اسے یہ حروف

دوسرے جملے میں رفع کر دیتے ہیں۔ اردو میں 'لیکن'، 'مگر'، 'گرچہ' اور 'بلکہ' حروف استدراک ہیں۔ دکنی میں اگرچہ مذکورہ بالا حروفِ استدراک استعمال ہوتے ہیں لیکن خاص دکنی کے حروف استدراک 'ولے'، 'ہن' اور 'اما' ہیں۔

- حروف استثنا ایک چیز یا شخص کو دوسرے سے الگ کرتے ہیں۔ اردو میں 'بغیر' اور 'بجز' حروف استثنا ہیں۔ دکنی میں ان کے لیے 'بن'، 'بنا'، اور 'باج' بھی ملتے ہیں۔

جیسے پیا باج پیالہ پیا جائے نا

پیا باج یک تل جیا جائے نا (محمد قلی قطب شاہ)

وہاں دوسرا نہ تھا کوئی علی باج (وجہی)

- دکنی میں حرف تخصیص 'بھی' کی جگہ 'بی' کا استعمال ملتا ہے۔
- اردو کے حرفِ تاکید 'ہی' کو دکنی میں لفظ کے آخر میں 'چ' لگا کر ظاہر کرتے ہیں جیسے ایساچ (ایسا ہی)، اپناچ (اپنا ہی) تیراچ (تیرا ہی)
- دکنی کے حروف تشبیہ 'ناد'، 'نمن' اور 'سار' ہیں۔ یاد رہے کہ حروف تشبیہ ایک دوسرے کے مانند قرار دینے کے لیے آتے ہیں، جیسے:

چلی پانی پہ کشتی باد کے سار

فلک کے ناد کس جاگے یہ ناٹھار (ابن نشاطی)

- دکنی میں پریشانی کی جگہ پریشانگی، حیرانی کے لیے حیرانگی اور سرگردانی کے لیے سرگردانگی کا استعمال ہوتا ہے۔ جیسے:

''لٹ کو اس کی پریشانی پر، اس کی حیرانگی پر، اس کی سرگردانگی پر مہر آئی۔'' (وجہی)

- دکنی اردو میں فعل ماضی بنانے کے لیے صیغہ امر کے آگے 'یا' بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے کرپا، چلپا اور اٹھپا وغیرہ۔
- دکنی اردو میں علامت مفعولی 'کو' کی جگہ 'کوں' اور 'سے' کی جگہ 'سوں' کا استعمال ملتا ہے۔
- دکنی اردو میں ہم کو اور تم کو کی جگہ ہمن کو اور تمن کو کا استعمال ملتا ہے۔
- دکنی اردو میں 'خود' کی جگہ 'آپس' کا استعمال ہوتا ہے۔
- دکنی اردو میں عام طور پر اضافی حالت میں میرا اور تیرا کے بجاے مج اور تج کا استعمال ملتا ہے۔
- اردو کے ایسے الفاظ جہاں دو معکوسی آوازیں آتی ہوں، دکنی میں ان میں سے ایک غیر معکوسی ہو جاتی ہے۔

- عام طور پر دکنی میں ہا کار آوازوں والے الفاظ غیر ہا کاری ہو جاتے ہیں۔
- دکنی اردو میں فعل ہمیشہ زمانہ، جنس اور تعداد کے لحاظ سے بدلتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ہمیشہ فاعل کے مطابق آتا ہے۔
- اردو کی طرح دکنی میں بھی مصدر کا لاحقہ 'نا' ہے لیکن بعض اوقات 'ن' بھی استعمال ہو جاتا ہے جیسے دیکھن اور بولن وغیرہ۔
- دکنی میں مرکب افعال کے درمیان اکثر 'کر' 'یا' کو استعمال ہوتا ہے۔
- دکنی اردو میں افعال میں کیجو، دیجو، آویلا وے ہووے دیویں استعمال ہوتا ہے۔
- دکنی اردو میں لفظ سے 'ہ' کو نکال دینے کا رجحان ملتا ہے جیسے مورکھ کی جگہ مورک، ابھی کی جگہ ابی وغیرہ۔
- دکنی اردو میں لفظ کے درمیان کبھی کبھی 'ہ' کی جگہ بدل دی جاتی ہے۔ جیسے 'پھتر' کی جگہ 'پتھر'، 'اکٹھا' کی جگہ اکھٹا' وغیرہ۔
- دکنی میں حرف اضافت بھی جمع میں استعمال ہوتے ہیں۔
- دکنی اردو میں مذکر کے لیے مذکر فعل اور مونث کے لیے مونث فعل استعمال ہوتا ہے۔
- دکنی میں جملے میں اسم کے ساتھ کسی کام کا کرنا پایا جائے تو وہ فاعلی حالت میں ہوتا ہے۔
- دکنی میں بعض اوقات فاعل کے ساتھ 'نے' بھی آجاتا ہے لیکن اس سے اسم متاثر نہیں ہوتا۔ اس صورت میں فعل ہمیشہ فاعل کے مطابق آتا ہے جیسے آدمی نے روٹی کھایا، پری نے تخت پر بیٹھی۔
- اسم میں ظریفت کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے میں، مین، منے، میاں اور میانے وغیرہ الفاظ کا استعمال ہوتا ہے۔
- دکنی اردو میں عددی شکلوں میں بھی کہیں کہیں فرق ملتا ہے جیسے ایکس (ایک)، ترتالیس (تینتالیس) وغیرہ۔ اعدادِ ترتیبی میں پیلا، دُسرا، تیسرا اور دوجے، تسرے وغیرہ ملتے ہیں۔
- دکنی میں اس طرح کی تمیزیں ہیں: یاں، واہ، اِنگے، نزک، اُپر، کنے، ایدھر، جیدھر، جداور نکو وغیرہ۔
- دکنی کی عطفی شکلوں میں ہور، پر اور پن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔
- دکنی کے حرف ربط میں کیاں، کیرے، کوں، سوں، تلک اور میانے میاں وغیرہ کو شمار کیا جا سکتا ہے۔
- دکنی اردو میں بڑے مصوتوں کو چھوٹے مصوتوں میں بدل دیا جاتا ہے جیسے اَسمان (آسمان)، اَنچل (آنچل)
- بعض معروف اسماد کنی اردو میں مذکر اور مونث دونوں طرح سے استعمال کیے گئے ہیں اکثر ایک ہی شاعر نے دونوں طرح سے باندھا ہے جیسے 'غزل' کو غواصی نے مذکر اور مونث دونوں طرح

استعمال کیا ہے۔

- دکنی اردو میں جمع 'اں' لگا کر بناتے ہیں جیسے عابداں، عورتاں، اَنکھیاں
- اردو میں علامت مصدر 'نا' ہے دکنی اردو میں اس کی انفی شکل (ناں) بھی ملتی ہے۔ جیسے:

سو بولیا تجھے جو نہ تھا بولناں

- دکنی اردو کے فعل ناقص موجودہ اردو سے خاصے مختلف ہیں۔ یہ عموماً اس شکل میں آتے ہیں۔ ہے، اہے، ہیں، اہیں، تھا، اتھا، تھی، اتھی، تھے، اتھے، تھیاں، اتھیاں
- دکنی اردو میں ماضی مطلق کے لیے مصدر 'نا' گرانے کے بعد زیادہ تر 'یا' لگایا جاتا ہے۔ جیسے اٹھیا (= اٹھا)

گیا راجہ تجہ جب اٹھیا بول یہ

- دکنی اردو میں ماضی احتمالی کے لیے ماضی مطلق کے بعد 'اچھے گا' یا 'اچھے گی' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ (اچھنا = ہونا)

جیسے

''تاراں کی زنجیر سوں جکڑ کر جان گیا اچھے گا'' (سب رس)

- دکنی اردو میں مصدر سے علامت 'نا' حذف کرنے کے بعد 'تا' لگا کر فعل حال بنایا جاسکتا ہے لیکن کبھی کبھی صرف 'ت' کے اضافے سے بھی بنالیا جاتا ہے۔ جیسے

ادھر تیرے کوثر کا پیالہ پلات (قلی قطب شاہ)

- دکنی اردو میں مستقبل بنانے کے لیے فعل مضارع کے بعد 'گیاں' کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ جیسے

کرے جب کی اِت سوز دھر آئیں گیاں

- دکنی ادو میں فعل مستقبل کے صیغے تشکیل دینے میں گا، گی، گے کے علاوہ سی، سے سوں کا بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسے اس کتاب کوں سینے پر تے بالا سی نا (سب رس)
- دکنی اردو میں 'سی'، 'سے'، 'سوں' اور 'سیں' عموماً 'نا'، یا 'نہ' (نفی) کے ساتھ آتی ہیں۔
- دکنی اردو کا ایک لفظ 'نکو' ہے جس کے معنی ہیں نہیں۔
- دکنی اردو میں مضارع کے حسب ذیل بناوٹ ملتے ہیں:

چلے، پاوے، جائے، پیوے، سوے، دیوے (سب رس)

- دکنی اردو میں 'نے' فعل متعدی اور فعل لازم دونوں کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔
- دکنی اردو میں 'نے' کا استعمال فعل جنس اور تعداد میں فاعل کے تابع ہوتا ہے۔

بلحاظ جنس: زہرہ نے جلوہ گائی (سب رس)

بلحاظ تعداد: نازاں نے گھونگھٹ کھولے (سب رس)

- دکنی اردو میں ماضی مطلق، ماضی قریب اور ماضی بعید کے ساتھ 'نے' کا استعمال ضروری نہیں ہے۔
- دکنی اردو میں علامات مفعول یہ ہیں: کو، کوں، تیئں
- مفعول ذی عقل یا جاندار ہو تو 'کوں' یا 'تیئں' علامت مفعول استعمال ہوتی ہے۔
- دکنی اردو میں 'نے' بھی علامت مفعول کے طور پر استعمال ہوتی ہے جیسے ''نفر ہزار ہزار ہو تو بی صاحب نے اپنا داب رکھتا'' (سب رس)
- دکنی اردو میں 'کہہ کر' کا مخفف 'ککر' استعمال کرتے ہیں۔
- دکنی اردو میں اسم کیفیت کے آخر میں اٹ، ت، ٹی وغیرہ لگایا جاتا ہے جیسے گھبرات، دیکھٹ، تمتاٹ وغیرہ۔
- موجودہ اردو میں فعل متعدی اپنے مفعول کے تابع ہوتا ہے جیسے ''میں نے روٹی کھائی، ہم نے روٹی کھائی، ہم نے روٹیاں کھائیں، اس نے روٹیاں کھائیں۔

لیکن دکنی اردو میں فعل متعدی اپنے فاعل کے تابع ہوتا ہے جیسے میں نے روٹی کھایا (واحد مذکر)، میں نے روٹی کھائی (مونث)، ہم روٹی کھائے، (جمع مذکر)، ہم روٹی کھائیں، کھائیاں (جمع مونث

- دکنی اردو میں ضمیر اپنے مرجع کے تابع ہوتی ہے۔
- دکنی اردو مس صفت اپنے موصوف کے تابع ہوتی ہے
- اردو میں علامت اضافت جنس میں اپنے مضاف کے مطابق آتی ہے لیکن دکنی اردو میں جنس میں مطابقت کے علاوہ جمع مونث کی صورت میں علامت اضافت کی بھی جمع بنائی جاتی ہے جیسے 'انوکیاں انکھیاں'، محبت کیاں چار باتاں، جیوکیاں پیاریاں (سب رس)



اردو کی لسانی انفرادیت

- اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اس کی بھی اپنی ایک تاریخ ہے۔ اپنا لسانی عمل ہے۔ اپنے ارتقائی مدارج ہیں۔ اپنی قواعد ہے۔ لغت ہے، صوتی نظام ہے۔ ہیئت و تشکیل کے اپنے اصول ہیں۔ اپنا معیار ہے اور اپنا رسم الخط بھی۔ یہ ایسے حقائق

ہیں جنھوں نے مل کر اردو کی انفرادیت کو سنوارا اور نکھارا ہے۔

ج اردو کی صوتی، نحوی، صرفی اور لفظی خصوصیات جو اس کی انفرادیت کو بڑھا دیتی ہیں یہ ہیں:

(1) اردو کے صوتی نظام میں یہ بہ یک وقت ہاکاری، کوزی، حلقی اور طریقۂ ادائیگی کے اعتبار سے بندشی، صفیری، لہردار اور انفی آوازیں ہیں۔ یہ تفریق ہندوستان کی زبانوں کے کسی صوتی نظام میں نہیں ہیں۔

(2) ق، ف، ز، خ غ حروف صحیح اردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔

(3) حاضر ضمیر کی واحد شکل میں اردو میں تین ذیلی ضمیریں استعمال ہوتی ہیں جو کسی دوسری زبان میں نہیں ہیں۔ یہ طبقاتی درجات کی پابندی ہیں۔

(4) اردو میں نسبت کا لاحقہ (ای) ہے اگر لفظ حروف علت پر ختم ہوتا ہو تو (ای) کے بجائے (وی) لاحقہ استعمال ہوتا ہے جیسے دہلی سے دہلوی، لکھنؤ سے لکھنوی وغیرہ۔

(5) اردو میں واؤ کے مجہول اور معروف ہونے سے مونث اور مذکر کا فرق پیدا ہوجاتا ہے جیسے کلو (مذکر) سے کلو (مونث)، منو (مذکر) منو (مونث)

(6) لفظ معنی کے اعتبار سے جنس بدل لیتا ہے، جیسے گذر: میری گذر نہیں ہوتی (گذر مونث) وغیرہ۔

(7) اردو میں ایک ظرفی تالیفی حالت پائی جاتی ہے جیسے اندھیرے اجالے یا دریا کنارے وغیرہ۔

(8) اردو میں صوتی آہنگ پیدا کرنے کے لیے لفظوں کے انتخاب میں بڑی گنجائش ہے: جیسے مہ/مہتاب، قمر، چاند، پازر، دولت، روپیہ، پیسہ، طلا اور سونا وغیرہ۔ یہ اس لیے ممکن ہوا کہ اردو میں کئی زبانوں کے الفاظ مستعمل نہیں ہیں۔

(9) اردو میں تذکیر و تانیث کے لیے (آت) کا لاحقہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کا رواج بشمول ہندی کسی دوسری زبان میں نہیں ملتا جیسے مشکل سے مشکلات، جذبہ سے جذبات وغیرہ۔

(10) اردو میں مشدد حروف صحیح سے پہلے چھوٹے مصوتے یا (زبر، زیر، پیش) سے ظاہر ہونے والے حروف علت کا ہونا لازمی ہے جیسے ابا، چٹیل اور اچھا وغیرہ۔

(11) اردو میں ایسے محاوروں کی تعداد ہزاروں میں ہے جو صفت کو ملا کر بنائے گئے ہیں جیسے منہ بنانا، منہ مارنا، یا آنکھ مارنا اور آنکھ پھیرنا وغیرہ۔

(12) اردو عربی و فارسی الفاظ کو دیسی الفاظ کے ساتھ ملا کر سیکڑوں نئے مرکبات بنائے ہیں اور اپنے دامن کو وسیع کیا ہے۔ جیسے عجائب گھر، گلاب جامن، لچھے دار، ان مرکبات میں حسب ضرور تعریفی اور اشتقاقی عمل بھی ہوتا ہے۔ جیسے امام باڑھ سے امام باروں، تھانہ دار سے تھانہ داری وغیرہ۔

(13) اردو میں اکثر الفاظ کے عربی و فارسی مترادفات مل جاتے ہیں۔ ان میں سماجی رشتوں، جسم کے اجزا، کھانے اور ترکاریوں کے نام، لباس اور رہن سہن کے طریقے خصوصاً قابل ذکر ہیں جیسے سالا، برادر نسبتی، والدہ، دولہا، ہونٹ، لب، آنکھ اور چشم وغیرہ۔

(14) اردو نے فرہنگ کی سطح پر عربی و فارسی زبانوں سے جتنا استفادہ کیا ہے ہندوستان کی کسی زبان نے نہیں کیا۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً 35 فیصد الفاظ اردو میں عربی، فارسی، انگریزی، پشتو زبانوں کے ہیں جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں ایک ریکارڈ بھی ہے۔

(15) اردو اپنے اسالیب، لب و لہجہ، انتخاب الفاظ اور مختلف لسانی و ادبی اقدار کے لحاظ سے تین رجحانات میں بٹی ہوئی ہیں۔ پہلے رجحانات میں عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب و تلمیحات آتی ہیں۔ دوسرے رجحان میں دیسی سادگی اور سلاست ہے۔ اور تیسرے رجحان کو انگریزی رجحان کہا جاسکتا ہے جہاں حقیقت پسندی ہے۔

(16) اردو شاعری کی تمام اصناف گیت، دوہوں اور سانٹوں کو چھوڑ کر عربی و فارسی میں ہیں۔ داستانوں کے علاوہ تمام نثری اصناف انگریزی سے مستعار ہیں۔ اس طرح ادبی اصناف کا ایک ایسا نظام مرتب ہوا ہے جو ہر اعتبار سے اپنی انفرادیت قائم کرتا ہے۔ یہ اصناف اس طرح ہیں:

شاعری کی اصناف، غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ، نعت، حمد، منقبت (عربی و فارسی) گیت، بارہ ماسہ دوہے (دیسی) سانٹ (انگریزی)، ہائیکو (جاپانی)

نثر کی اصناف: داستان (عربی و فارسی) ناول، افسانہ، مضمون، انشائیہ، سوانح، خاکہ، سفرنامہ، رپورتاژ اور مکتوب نگاری وغیرہ (انگریزی)

Unit-2

اردو کی شعری اصناف

قصیدہ، مثنوی، مرثیہ

قصیدہ کا فن

- قصیدہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی سطبر یا مغز غلیظ کے ہیں یعنی گاڑھا یا دمدار گودا۔
- ایک خیال یہ بھی ہے کہ قصیدہ لفظ قصد سے نکلا ہے اور اس کے لغوی معنی ارادہ کرنا کے ہیں۔
- اصطلاحاً قصیدہ اس مسلسل نظم کو کہتے ہیں جس کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے اور بقیہ اشعار کے دوسرے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں اور جس میں مدح یا ذم، وعظ و نصیحت یا مختلف کیفیات وحالات وغیرہ کا بیان ہو۔
- قصیدے کے لیے یہ لازم نہیں کہ اس میں ردیف بھی ہو۔
- قصیدے کے لیے تخیل کی بلندی اور شوکت الفاظ ضروری ہے۔
- قصیدہ کا پہلا شعر تو مطلع ہوتا ہی ہے لیکن کچھ شعروں کے بعد درمیان میں بھی مطالع کہے جاتے ہیں۔
- طویل قصیدوں میں مطلعوں کی تعداد کبھی کبھی پانچ تک پہنچ جاتی ہے۔
- دو مطلعوں کے قصیدے کو ذو مطلعین اور دو سے زیادہ مطلعوں کے قصیدے کو ذوالمطالع کہتے ہیں۔
- غزل کے شروع میں متعدد مطلعے یکے بعد دیگرے ہو سکتے ہیں مگر قصیدے میں شروع میں صرف ایک ہی مطلع ہوتا ہے۔ البتہ بعض قصیدوں میں متعدد مطلعے ہوتے ہیں مگر ایک مطلع اور دوسرے مطلع کے درمیان بہت سے اشعار واقع ہو جاتے ہیں جس قصیدہ میں متعدد مطلعے ہوتے ہیں اسے ذوالمطالع کہتے ہیں۔
- قصیدہ میں شاعر مقطع کا استعمال جہاں چاہے وہاں کر سکتا ہے۔
- قصیدے میں اشعا کی کم سے کم تعداد اکیس ہے۔ اور زیادہ کی کوئی حد نہیں۔
- عربی شعرا قصیدے کی ابتدا میں عشقیہ اشعار لکھتے تھے جن کو تشبیب کہتے تھے۔
- پھر کسی سلسلے سے ممدوح کا ذکر کرتے تھے اس کو تخلیص، تخلص یا مخلص کہتے تھے۔
- اس کے بعد ممدوح کی تعریف ہوتی تھی جس کو مدح یا تحمید کہتے تھے۔
- آخر میں دعا پر خاتمہ کلام ہوتا تھا جس کو براعۃ الختام یا حسن المقطع کہتے تھے۔
- قصیدے کی دو قسمیں ہیں: (1) خطابیہ (2) تمہیدیہ
- خطابیہ قصیدہ وہ ہوتا ہے جس میں شاعر تمہید باندھے بغیر مدح یا ہجو شروع کر دیتا ہے۔
- تمہیدیہ قصیدہ وہ ہوتا ہے جس میں شاعر مدح یا ہجو سے پہلے تمہید باندھتا ہے۔
- اردو قصیدے کے اجزائے ترکیبی پانچ ہیں۔ تشبیب، گریز، مدح، مدعا، دعا

- تشبیب سے مراد وہ اشعار لیے جاتے ہیں جو قصیدے کی ابتدا میں تمہید کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔
- تشبیب کا پہلا شعر قصیدے کا پہلا شعر یعنی مطلع ہوتا ہے۔
- قصیدے کے مطلعے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ بلند پایہ اور شگفتہ ہو۔
- اس میں کوئی جدت آمیز بات بیان کی جائے تاکہ سننے والا ہمہ تن گوش ہو جائے اور بعد کے اشعار کا اچھا اثر مرتب ہو مثلاً:

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام　　حلال دختر زر بے نکاح و روزہ حرام　　(سودا)

صبح دم دروازہ، خاور کھلا　　مہر عالم تاب کا منظر کھلا　　(غالب)

- تشبیب کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے اشعار 'مدح' کے اشعار سے زیادہ نہ ہوں۔
- تشبیب کے بعد شاعر مدح کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔ وہ براہِ راست مدح شروع نہیں کرتا بلکہ بات سے بات پیدا کر کے مدح کی طرف آتا ہے۔ اس بات سے بات پیدا کرنے کو گریز کہتے ہیں۔
- سودا نے حضرت علی کی منقبت کے ایک قصیدے میں بہاریہ تشبیب کے بعد اپنی شاعری کی رنگینی اور شیرینی کی تعریف کرتے ہوئے اس طرح گریز کیا ہے:

ہے مجھے فیض سخن اس کی ہی مداحی کا　　ذات پر جس کی مبرہن کنہ عز و جل

- قصیدے کا تیسرا حصہ مدح ہے جس میں شاعر ممدوح کے اوصاف بیان کرتا ہے۔
- اس کے عموماً دو ضمنی اجزا ہوتے ہیں۔
- قصیدے کا سب سے اہم جز مدح ہی ہوتا ہے۔
- گریز کے بعد پہلے ممدوح کی تعریف صیغۂ غائب میں کی جاتی ہے جس کو مدحِ غائب کہتے ہیں۔
- پھر براہِ راست ممدوح کو خطاب کر کے تعریف کی جاتی ہے اس کو مدح حاضر کہتے ہیں۔ مدح کی مثال:

کلکِ قدرت نے کوئی کھینچی نہیں ایسی شبیہ　　گو کہ تصویر ہزاروں میں مرقع ہے جہاں

- قصیدہ کا چوتھا جز مدعا یا عرض مطلب ہے جس میں قصیدہ نگار اپنا مدعا بیان کرتا ہے لیکن 'مدعا' قصیدے کا لازمی جز نہیں۔
- قصیدے کا آخری جز دعا ہے جس میں شاعر اپنے ممدوح کو درازیِ عمر یا بلندیٔ اقبال وغیرہ کی دعا دے کر قصیدہ ختم کر دیتا ہے۔
- قصیدے عربی شاعری کی پیداوار ہے جو فارسی کے توسط سے اردو تک پہنچا ہے۔
- اردو کا پہلا قصیدہ گو قلی قطب شاہ ہے۔

قصیدہ کا آغاز وارتقا

- اردو کی دوسری قدیم اصناف سخن کی طرح قصیدے کے ابتدائی نمونے بھی دکنی شعرا کے یہاں ملتے ہیں۔
- اردو کا پہلا قصیدہ گو قلی قطب شاہ (بارہ قصیدے) کو قرار دیا گیا ہے۔
- بعض لوگوں نے غواصی (35 قصائد) کو پہلا قصیدہ گو قرار دیا ہے۔
- اردو کا با قاعدہ پہلا قصیدہ گو سودا (54 قصائد) کو قرار دیا گیا ہے۔

دیگر دکنی قصیدہ گو شعرا:

* آذری * مشتاق * لطفی * محمد قطب شاہ
* عبداللہ قطب شاہ * قطبی * افضل * سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی
* محمد مقیم مقیمی * کمال خان رستمی * ملک خوشنود * عاشقی دکھنی
* علی عادل شاہ ثانی شاہی (چھ قصائد) * محمد نصرت نصرتی (13 قصائد)
* سید میران ہاشمی ولی * ولی (چھ قصائد)

شمالی ہند میں قصیدہ نگاری

سودا کے معاصرین قصیدہ گو شعرا

* میر تقی (سات قصائد) * محمد حسین کلیم دہلوی * میر محمد باقر حزیں
* میر ضیا * قائم چاند پوری * میر غلام حسین شورش

انشا و مصحفی اور ان کے معاصرین قصیدہ گو شعرا

* میر حسن (سات قصائد) * انشا (دس قصائد) * مصحفی (کم وبیش پچاسی قصائد)

- یاد رہے کہ مصحفی اپنے عہد کے سب سے زیادہ قصیدے لکھنے والے ہیں یہاں تک کہ ان کے قصائد سودا اور ذوق کے قصائد سے بھی زیادہ ہیں۔
- رنگین (سات قصائد)
- رنگین میر، درد وغیرہ کو استاد، سودا کو ملک الشعرا اور اپنے آپ کو علامہ سمجھتے تھے کیونکہ جملہ ستائش صنفوں اور سترہ زبانوں میں شعر کہنے نیز گیارہ بحروں میں شعری نگاری کا امتیاز صرف انھیں کو حاصل تھا:

* ممنون (تیں قصائد) * جعفر علی حسرت * احسن علی احسن * میر امانی اسد

* معین بدایونی * قمرالدین منت * ظہوراللہ نوا * بقااللہ بقا
* عوض علی مدعا * مرزا سیف علی شگفتہ * عظیم بیگ عظیم * جرأت
* مرزا مغل سبقت * صغیر علی مروت * راجہ جسونت سنگھ پروانہ * راسخ عظیم آبادی
* محمد تقی خان ہوس * مظہر علی خان ولا * محمد بخش مہجور * سید حیدر بخش حیدر

ذوق اوران کے معاصرین

* ذوق (تیس قصائد) * مومن (9 قصائد)
* غالب (4 طویل اور چار مختصر کل 8 قصائد) * اسیر (36 قصائد)
* نسیم دہلوی (چودہ قصائد) * قلق لکھنوی (چار قصائد)
* سحر لکھنوی (دس قصائد) * کرامت علی شہیدی (تین قصائد)
* غلام امام شہید

منیر اور امیر کا زمانہ

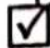
* منیر شکوہ آبادی (28 قصائد)
* امیر مینائی (مطبوعہ دیوان میں 12 قصائد اور دیگر سات یعنی کل 19 قصائد)
* جلال لکھنوی * تسلیم * داغ
* محسن کاکوروی (پانچ قصائد) * قدر بلگرامی * ظہیر دہلوی

دور جدید میں قصیدہ

* اسماعیل میرٹھی * حالی (سات مکمل اور تین نامکمل یعنی کل دس قصائد)
* نظم طباطبائی * صفی لکھنوی * محشر لکھنوی * عزیز
* آزاد * شبلی * سورج نرائن مہر * جلیل مانک پوری
* ثاقب لکھنوی * برج موہن دتاتریہ کیفی * آرزو

قصیدے کے بارے میں مختلف اقوال

- زندوں کی تعریف کو قصیدہ کہتے ہیں اور مردوں کی تعریف کو جس میں تاسف اور افسوس بھی شامل ہوتا ہے مرثیہ کہتے ہیں (مقدمۂ شعروشاعری۔از حالی)
- قصیدہ کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے جوش اور ولولہ پر ہو تو شعر نہایت بلند ہو جاتا ہے اور یہ قصیدہ کا ضروری وصف بھی ہے۔ (حالی)



اردو کے اہم قصیدہ گو اور ان کے قصائد

قصیدے کا نقاشِ اوّل

مرزا محمد رفیع سودا

(1712-1781ء)

- نام مرزا محمد رفیع تھا اور تخلص سودا۔
- سودا 1712 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔
- سودا کا انتقال 4 رجب 1195ھ مطابق 27 جون 1781 میں لکھنؤ میں ہوا۔
- سودا کا انتقال کثرت سے آم کھانے کی وجہ سے ہوا۔
- عالم نزع میں سودا کی زبان سے یہ مطلع نکلا تھا:

آج سودا جہاں سے اٹھتا ہے
شور و غل ہر مکاں سے اٹھتا ہے

- سودا کے استاد شاہ حاتم نے سودا کی موت پر کہا تھا کہ "ہمارا پہلوان سخن مر گیا"
- سودا کے والد کا نام محمد شفیع تھا جو دہلی میں سوداگر تھے۔
- سودا نے والد کے پیشے (سوداگری) کی نسبت سے سودا تخلص اختیار کیا۔
- سودا کے اجداد کا پیشہ سپہ گری تھا اور ان کا تعلق بخارا سے تھا۔
- سودا کے بیٹے کا نام میر غلام حیدر مجذوب تھا۔
- سودا کو ترکی، عربی اور فارسی میں مہارت حاصل تھی۔
- عبدالغفور نساخ اور جگن ناتھ پرشاد کا بیان ہے کہ سودا کو نواب آصف الدولہ نے ملک الشعرا کا خطاب دیا تھا۔ خلیق انجم نے اسے غلط کہا ہے)
- میر تقی میر سودا کو ملک الشعرا مانتے تھے۔
- سودا نے ابتداً فارسی میں شاعری شروع کی اور خان آرزو سے اصلاح لی۔
- خان آرزو کے کہنے پر اردو شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔

بقول محمد حسین آزاد "خان آرزو نے کہا کہ مرزا فارسی اب تمہاری زبانِ مادری نہیں۔ اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو۔ طبع موزوں ہے۔ شعر سے مناسبت رکھتی ہے تم اردو کہا کرو تو یکتائے زمانہ ہو گے۔"

- سودا نے رسالہ عبرت الغافلین میں لکھا ہے کہ بندے نے پینتالیس سال فن ریختہ میں ضائع کیے۔
- سودا کے اردو اور فارسی شاعری کے چار استاد ہیں: (1) خان آرزو، (2) قلی خان وداد (3) شاہ حاتم (4) صانع
- قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ حاتم کو سودا کی استادی پر بہت ناز تھا۔ اکثر شاہ حاتم یہ مصرع پڑھا کرتے تھے:

رتبہ شاگردی من نیست استاد مرا

اور کہا کرتے تھے کہ یہ مصرع میری استادی اور مرزا کی شاگردی کے متعلق کہا گیا ہے۔

- سودا کو کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ اور یہ شوق آخری عمر تک قائم رہا۔
- سودا نے دہلی میں تین کتیا پالی تھیں، جن سے انھیں بے انتہا محبت تھی۔ ان کتیوں کی خاطر ہمسایوں کی گالیاں بھی کھانا پڑیں جب یہ کتیاں مریں تو سودا کو بہت افسوس ہوا۔
- کلیات میر میں ایک ہجو 'ہجو عاقل نام ناکسے کہ بہ سگان انسے تمام داشت' کے نام سے ہے۔ جو میر نے سودا پر کہی ہے۔ میر نے اپنی ہجو میں لکھا ہے کہ سودا کتوں کے پیچھے دیوانے رہتے ہیں۔
- میر کی ہجو کا جواب سودا نے دس بندوں کی ایک مخمس میں دیا ہے۔
- سودا شجاع الدولہ کے زمانہ میں فیض آباد گئے اور اس کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔
- شجاع الدولہ نے سودا کے لیے دو سو روپیہ ماہوار مقرر کیے تھے۔
- سودا آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد سے لکھنؤ آئے۔
- سودا کو آصف الدولہ کی سرکار سے دو سو روپے ماہانہ ملتے تھے اور میر کو بھی دو سو روپے۔
- اردو غزل میں 'خارجیت'، 'زور بیان'، 'نشاط آمیز لب ولہجہ' سودا کی دین ہے۔
- قائم چاند پوری صاحب مخزن نکات سودا کے شاگرد تھے۔
- سودا نے پہلی بار مسدس کی شکل میں مرثیہ کہا۔
- سودا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت فاطمہ، حضرت علی اور دیگر ائمہ کے علاوہ عالم گیر شاہ ثانی، شاہ عالم، آصف جاہ نظام الملک، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، سرفراز الدولہ حسن رضا خاں، نواب سیف الدولہ احمد علی خاں، نواب بسنت خاں خواجہ سرا، نواب مہربان خان رند، حکیم میر محمد

کاظم، اودادوھ کے انگریز رزیڈنٹ رچرڈ جانسن کے شان میں قصیدے کہے ہیں۔

- سودا کو فارسی شعرا انوری اور عرفی کے برابر سمجھا جاتا ہے۔
- سودا نے فارسی کے مشہور قصیدہ نگاروں خاقانی، انوری، عرفی کے قصیدوں کے ذیل میں قصیدے کہے ہیں۔
- سودا نے ایک قصیدہ درہجواسپ موسوم بہ تضحیک روزگار لکھا ہے جیسا کہ انوری نے ایک قصیدہ گھوڑے کی ہجو میں لکھی ہے۔
- سودا کو ہجویہ قصیدہ کا بانی کہا جاتا ہے۔

سودا کی ادبی چشمک

- سودا اور قائم، سودا اور ندرت کاشمیری، سودا اور مرزا مظہر جانجاناں، سودا اور بقا، سودا اور میر تقی میر، سودا اور فدوی، سودا اور جعفر علی حسرت، سودا اور میر سوز، سودا اور فاخر مکیں، سودا اور میر ضاحک کے درمیان ادبی معرکے ہوئے اور سودا کی ان سے ادبی چشمک تھی۔

سودا کے بارے میں مختلف آراو خیالات

- میر تقی میر نے سودا کو ''سرآمد شعرائے ہندی'' کہا ہے۔
- میر حسن نے سودا کو قصیدہ و ہجو میں 'صاحب یدِ بیضا' بتایا ہے۔
- لچھمی نرائن شفیق نے ان کے صریرِ کلک کو ہمدم اعجاز مسیحا' سمجھا ہے۔
- مصحفی نے سودا کو' قصیدے کا نقاش اوّل' کہا ہے۔
- ''قصیدہ تو ختم مرزا سودا پر ہوا'' (صاحب گلشن ہند مرزا علی لطف)
- ''پس اول قصائد کا کہنا اور پھر اس دھوم دھام سے اعلیٰ درجہ فصاحت، بلاغت تک پہنچانا ان کا پہلا فخر ہے۔ (مولانا حسین آزاد)
- وہ (سودا) اس میدان میں فارس کے نامی شہسواروں کے ساتھ عنان درعنان ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے ہیں۔ (محمد حسین آزاد)
- اگر سودا نہ ہوتے تو اردو قصیدے کو زیر بحث لانا بھی فضول ہوتا۔ (امداد امام اثر)
- اردو قصیدہ نگاروں میں سودا سب کے سرخیل ہیں۔ (عبدالسلام ندوی)
- قصیدوں میں وہ واقعات کو اس بے تکلفی سے اور سادگی سے نظم کرتے ہیں کہ دوسرا شخص مثنوی میں اس طرح نظم نہیں کرسکتا۔'' (مولانا عبدالحئی، گل رعنا)

- اردو میں قصیدہ گوئی کا موجد اگر کسی کو کہہ سکتے ہیں تو وہ صرف مرزا کی ذات ہے جن کے زور قلم نے عالم سخن میں دھاک بٹھادی۔ مقطوع الجواب قصائد سن کر مخالفین نے بھی ان کا لوہا مان لیا۔ (لالہ سری رام)
- یہ جو عوام میں مشہور ہے کہ ان (سودا) کا قصیدہ غزل سے بہتر ہے مہمل بات ہے۔ فقیر (شیفتہ) کے خیال سے ان کی غزل قصیدے سے بہتر ہے اور قصیدہ غزل سے۔" (نواب مصطفیٰ خان شیفتہ)
- سودا کی شاعری میں غزل کی دیو مالا کا مخصوص منظر نامہ نظر آتا ہے۔ (تبسم کاشمیری)

سودا کے داخل نصاب قصائد

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی

(قصیدہ در لغت حضرت سید المرسلین خاتم النبیین
احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ہوا جب کفر ثابت، ہے وہ تمغائے مسلمانی — نہ ٹوٹی شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی
ہنر پیدا کر اول ترک کیجو تب لباس اپنا — نہوجون تیغ بی جوہر دگر نہ ننگ عریانی
فراہم زر کا کرنا باعث اندوہ دل ہووے — نہیں کچھ جمع سے غنچہ کو حاصل جز پریشانی
خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی — نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی
عروج دست ہمت کو نہیں ہے قدر بیش وکم — سدا خورشید کی جگ پر مساوی ہے زرافشانی
کرے ہے کلفت ایام ضائع قد مردون کی — ہوئی جب تیغ زنگ آلودہ کم جاتی ہے پہچانی

اکیلا ہو کے رہ دنیا مین گر چاہے بہت جینا — ہوئی ہے فیض تنہائی سے عمر خضر طولانی
اذیت وصل مین دونی جدائی سے ہو عاشق کو — بہت رہتا ہے نالان فصل گل مین مرغ بستانی
موقر جان ارباب ہنر کو بی لباسی مین — کہ ہو جو تیغ با جوہر اوے سے عزت ہے عریانی
برنگ کوہ رہ خاموش حرف ناسزا سن کر — کہ تا بدگو صدائے غیب سے کھینچے پشیمانی
یہ روشن ہے برنگ شمع ربط بادو آتش سے — موافق گر نہووے دوست ہے وہ دشمن جانی
نہیں غیرا ز ہوا کوئی ترقی بخش آتش کا — نفس جب تک ہے داغ دل سے فرصت کیونکہ ہے اپنی
کرے ہے دہر زینت ظالموں پر تیرہ روزی کو — کہ زیب ترک چشم یار سرمہ ہے صفاہانی

طلوع مہر ہو پامال حسرت آسمان اوپر
لکھوں گا پھر غزل کر اس زمین مین مطلع ثانی

مطلع ثانی

عجب نادان ہیں جن کو ہے عجب تاج سلطانی
فلک بال ہما کو پل میں سونپے ہے مگس رانی

نہیں معلوم ان نے خاک مین کیا کیا ملا دیکھا
کہ چشم نقش پا سے تا عدم نکلی نہ حیرانی

ہماری آہ دل تیرا نہ مرادے تو یا قسمت
وگرنہ دیکھ آئینہ کو پتھر ہوگئے پانی

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا
کہ ہے جمعیت خاطر مجھے ان کی پریشانی

زمانہ میں نہیں کھلتا ہے کاربستہ حیراں ہوں
گرہ غنچے کی کھولے ہے صبا کیونکر بآسانی

جنون کے ہاتھ سے سرتا قدم کا ہیدہ اتنا ہوں
کہ اعضا دیدۂ زنجیر کی کرتے ہیں مژگانی

دکھا جگ میں رسم دوستی اندوہ روزی نے
مگر زانو سے اب باقی رہا ہے ربط پیشانی

سیہ بختی میں اے سودا نہیں طول امل لازم
نمط خامہ کے سر کٹوائے گی ایسی زباں دانی

سمجھ اے تا قباحت فہم کب تک یہ بیان ہوگا
ادائے چین پیشانی و لطف زلف طولانی

خدا کے واسطے باز آ تو اب ملنے سے خوبان کے
نہیں ہے ان سے ہرگز فائدہ غیرا ز پشیمانی

نظر رکھنے سے حاصل ان کے چشم و زلف کے اوپر
مگر بیمار ہودے صعب یا کھینچے پریشانی

نکال اس کفر کو دل سے کہ اب وہ وقت آیا ہے
برہمن کو صنم کرتا ہے تکلیف مسلمانی

زہے دین محمد پیروی میں اس کے جو ہو دین
رہے خاک قدم سے اس کی چشم عرش نورانی

ملک سجدہ نہ کرتے آدم خاکی کو گر اس کی
امانت دار نور احمدی ہوتی نہ پیشانی

سب کو آدم و حوا کی خلقت سے کیا پیدا
مراد الفاظ سے معنی میں تا آیات قرآنی

خیال خلق اس کا گر شفیع کافراں ہووے
رکھیں بخشش کے سر منت یہودی اور نصرانی

زباں پر اس کے گزرے حرف جس جاگہ شفاعت کا
کرے دان ناز آمرزش پہ ہر اک فاسق وزانی

رکھا جب سے قدم مسند پر آ اون نے شریعت کا
کرے ہے موج بحر معدلت تب سے یہ طغیانی

اگر نقصان پر خس کے شرر کا ٹک ارادہ ہو
گرہ کو آگ کے دو ہیں کرے غرق آنکر پانی

موافق گر نہ کرتا عدل اس کا آب و آتش کو
تو کوئی سنگ سے بندھتی تھی شکل لعل رمانی

یہ کیا انصاف ہے یارو کہ طیر و وحش تک جگ میں
اس امن و عیش سے اپنی بسر اوقات لے جانی

پلے ہے آشیانمیں باز کے بچہ کبوتر کا،
شبان نے گرگ کو گلہ کی سونپی ہے نگہبانی

ہما آسا ہے پرواز ملخ اوج سعادت پر
کرے ہے مور چڑھ کر سینۂ دو پر سلیمانی

کھلے ہے غنچۂ گل باغ میں خاطر سے بلبل کے
جواب اوراق جمعیت کو ہوتی ہے پریشانی

جہاں انصاف سے ہر گاہ اب معمور ہے اتنا
تو اس کے آگے ہوگی عدل کی کیا کچھ فراوانی

ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں
وگرنہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی

نہ ہونے سے جدا سایہ کے اُس قامت سے پیدا ہے
قیامت ہووے گا دلچسپ وہ محبوب سبحانی

جسے یہ صورت و سیرت کرامت حق نے کی ہووے
بجا ہے کہیے ایسے کو اگر اب یوسف ثانی

معاذ اللہ یہ کیا حرف بے موقع ہوا سرزد
جو اس کو پھر کہوں تو ہوں میں مردودِ مسلمانی

کدھر اب فہم ناقص لے گیا مجھ کو نہ یہ سمجھا
کہ وہ مہر الوہیت ہے یہ ہے ماہ کنعانی

جو صورت اس کی ہے لاریب وہ ہے صورت ایزد
جو معنی اس میں ہیں بے شک وہ ہیں معنی ربانی

حدیث من رآنی دال ہے اس گفتگو اوپر
کہ دیکھا جس نے اس کو ان نے دیکھی شکل یزدانی

غرض مشکل ہمیں ہوتی کہ پیدا کر کے ایسے کو
خدا گر یہ نہ فرماتا نہیں کوئی مرا ثانی

بس آگے مت چل اے سودا میں دیکھا فہم کو تیری
کر استغفار اس منہ سے اب ایسے کی ثنا خوانی

قصیدہ در ہجو اسپ المسمیٰ بہ تضحیک روزگار

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عنان کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گھٹاتے ہیں وہ اُدھار

تنہا ولے نہ دہر سے عالم خراب ہے
خست سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار

ملیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار

نہ دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس،
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد — امید وار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
جس دن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ — گزرے ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر — دیکھے ہے آسماں کی طرف سے ہو کے بے قرار
تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا — چوکے کو آنکھ موند کے دیتا ہے وہ پسار
خط شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ — ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار
پیدا ہوئی ہے تسپہ اگن باد اس قدر — ہرگز دروغ اس کو تو مت جان زینہار
گزرے وہ جس طرف سے کبھو اس طرف نسیم — باد سموم ہووے وہیں گر کرے گزار
دیکھے ہے جب وہ تو بڑہ وتھان کی طرف — کھودے ہے اپنے سُم سے کنوئیں تاپیں ہار بار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی — گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار
ہے اس قدر ضعیف کہ اوڑ جائے باد سے — میخیں گر اس کی تھان کی ہودیں نہ استوار
استخوان نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں — دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جون کھال کو لوہار
سمجھا نہ جاے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ — خارشت سے زبس کہ ہے مجروح بے شمار
یہ حال اس کے دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق — چنگل سے موذی کے چھوڑا اس کو کردگار
ہرزخم پر ز بسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں — کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار
لے جا دیں چوریا مرے یا ہو کہیں یہ گم — اس تین بات سے کوئی جلدی ہو آشکار
تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ زین کا — خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور — آیا یہ دل میں جایئے گھوڑے پہ ہو سوار
رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا — مشہور تھا جنھوں کنے وہ اسپ نابکار
خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس — گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا جب انھوں نے کہ اے مہربان من — ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پر میں نثار
لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ — یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کا دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ — سیرت سے جس کے نت ہے سگ خشمگیں کو عار
بدرنگ جیسے لید و بدبو ہے چوں پشاب — بدیمین یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار
مانند مینگھو کے لکد زن ہے تھان پر — لاجب وہ زمین سے یہ چوں میخ استوار

حشری ہے اس قدر کہ بکثر اس کی پشت پر
دجال اپنے منہ کو سیہ کر کے ہو سوار
اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اوڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بس کہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہے مار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگ بیابان کرے شمار
لیکن مجھے زردے تواریخ یاد ہے
شیطان اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا
لوہا گلا کے تیغ بنا دے کبھو لوہار
ہے دل کو یہ یقیں کہ وہ تیغ روز جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار
اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سفید
تھا سروسا جو قد سو ہوا شاخ باروار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجوان
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گزار
مٹھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار
دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے اگر ہے وقت کار
مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ
ہوکر سوار اب کرو میدان میں کارزار
ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتیار باندھ کر میں ہوا جا کے پھر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
تک تک سے پاشنہ کے مرے پاؤں تھی نگار

آگے سے تو بڑا اسے دکھلائے تھا سیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا روبراہ
ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوہسار
اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو لوں کے دو اختیار

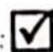
میں کیا کہوں غرض ک ہر اک اس کی شکل دیکھ
تیغ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار
کہتا تھا کوئی ہے بزکوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہیگا ولایت کا یہ حمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار
کہنے لگا پھر آ کے اس اجماع میں کوئی شخص
مرکب نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہگار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کی بھیس میں
ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار
اس مخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز
فتنے کو آسمان نے کیا مجھ سے پھر دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے دان گزار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

دریاے کشمکش ہوا اس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبیے خفت سے ایک بار
بدچشمی اس کی دیکھ کے خرس کا خیال
لڑکے بھی وان تھے جمع تماشے کو بے شمار
رکھتا تھا کوئی لا کے سباریکو مھ کے بیچ
مو اس کے تن سے کوئی اکھاڑے تھا بار بار
کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا تجھے میں ہے نوچندا ایتوار
کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اس کے گرد و پیش
ساتھ اس سمند خرس نما کے ہو چشم چار
اس وقت میں نے اپنی مصیبت پہ کر نظر
کہنے لگا خدا سے یہ رو رو کے زار زار
جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں سے یا لڑوں کہ مروں اپنا پیٹ مار۔
بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب
دانسے بہر نمط کیا جنگاہ تگ گزار

دست دعا اٹھا کے میں پھر وقت جنگ کے
کہنے لگا جناب الٰہی میں یوں پکار
پہلے ہی گولا چھوٹتے اس گھوڑے کے لگے
ایسا لگے یہ تیر کہ ہووے جگر سے پار
یہ کہہ میں خدا سے ہوا مستعد بجنگ
اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آدوچار
گھوڑا تھا بس کہ لاغر و پست وضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے مرے کی شکل یہ ہے تم نے جو سنی
اس پر بھی دل میں آلے تو اب ہو جیسے سوار
سن کر تب ان سے میں نے یہ قصہ دیا جواب
اتنا بھی جھوٹ بولنا کیا ہے ضروریار
گفتن ہمیں بس ست کہ اسپ من ابلق ست
سمجھوں گا دل میں اپنے اگر ہو نمیں ہوشیار
سودا نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدہ کا تضحیک روزگار



خاقانیٔ ہند

شیخ محمد ابراہیم ذوق

(1789-1854ء)

- نام شیخ محمد ابراہیم، تخلص ذوق اور خطاب خاقانی ہند تھا۔
- ذوق 11 ذوالحجہ 1204ھ مطابق 1789 میں دہلی میں پیدا ہوئے۔
- ذوق کا انتقال 1854 میں ہوا۔
- ذوق کے والد کا نام شیخ محمد رمضان تھا جو ایک غریب سپاہی تھے۔
- ذوق کی ابتدائی تعلیم حافظ غلام رسول کے مکتب میں ہوئی۔
- ذوق نے درسیات کی تکمیل مولوی عبدالرزاق سے کی۔
- ذوق شاہ عبدالعزیز دہلوی کی خدمت میں بھی طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوتے تھے۔
- ذوق علم نجوم، علم ہیئت، علم طب، علم منطق، علم فلسفہ، علم فقہ، علم تصوف، علم تفسیر، علم حدیث، علم تاریخ، علم موسیقی سے گہری واقفیت رکھتے تھے۔
- ذوق کے پہلے استاد حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے اور شوق تخلص کرتے تھے۔ ان کے یہاں شعر و شاعری کا اکثر چرچا رہتا تھا اس سے متاثر ہو کر ذوق نے کم عمری ہی میں شاعری شروع کی اور حافظ غلام رسول شوق سے اپنے کلام پر اصلاح لی اور استاد ہی کے تخلص شوق کی مناسبت سے ذوق تخلص اختیار کیا۔
- شوق کے بعد ذوق نے استاد سخن شاہ نصیر دہلوی سے مشورۂ سخن کیا۔
- ذوق کی رسائی شہزادہ ولی عہد مرزا ابوظفر کے دربار تک انیس برس کی عمر میں ذوق کے بچپن کے دوست میر کاظم حسین بے قرار کے ذریعے ہوئی۔ (مقدمہ انتخاب کلام ذوق ص 8، از تنویر احمد علوی)
- ظفر نے ذوق کی شاگردی اختیار کر کے چار روپے مہینہ تنخواہ مقرر کی تھی۔
- ظفر ذوق سے پہلے شاہ نصیر سے مشورہ سخن کرتے تھے اور ذوق کے بعد غالب سے۔
- آزاد کی روایت کے مطابق انیس برس کی عمر میں ذوق کے ایک قصیدے پر جس کا مطلع تھا:

جبکہ سرطان واسد مہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اور جس میں طرح طرح کی صنعتوں کے علاوہ اٹھارہ (18) زبانوں میں 18 شعر تھے اکبر شاہ ثانی نے

ذوق کو خاقانیٔ ہند کا خطاب عطا کیا تھا۔ (اردو میں قصیدہ نگاری، ص159 از ابو محمد سحر)

- بہادر شاہ ظفر نے تخت نشیں ہونے کے بعد ذوق کو سلطنت کا ملک الشعرا مقرر کیا اور تنخواہ چار روپے سے بڑھا کر سو روپے کر دی۔
- ذوق کبھی دہلی سے باہر نہیں گئے۔ وہ ہمیشہ بہادر شاہ ظفر کے دربار سے وابستہ رہے۔
- حیدرآباد کے دیوان مہاراجہ چندو لال شاداں نے شہرت سن کے ذوق کو حیدرآباد بلایا مگر ذوق نہیں گئے اور یہ جواب دیا:

گرچہ ہے ملکِ دکن میں ان دنوں قدرِ سخن
کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

- ذوق کا کلام دہلی کے روزمرہ اور محاورے کے لیے سند گردانا جاتا تھا۔
- ذوق اور غالب کے درمیان معاصرانہ چشمک رہی ہے۔
- 1852 میں غالب نے شہزادہ جواں بخت کی شادی کے موقعے پر ملکہ زینت محل کی فرمائش سے ایک سہرا لکھا اور مقطع میں تعلّی کے طور پر یہ کہا:

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

اس پر ذوق نے بھی جواباً ایک سہرا کہا جس کا ایک شعر یہ ہے:

جن کو دعوائے سخن ہو یہ سنا دو ان کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

- مرزا الٰہی بخش خاں معروف بھی ذوق سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔
- ذوق کو خان بہادر کا بھی خطاب ملا تھا۔
- ذوق نے مختلف علوم و فنون کی اصطلاحات کو بڑی خوبی کے ساتھ اپنے قصائد میں برتا ہے۔

ذوق کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- ذوق کو آزاد نے اردو نظم کا خاتم قرار دیا ہے۔
- نظم اردو کی نقاشی میں مرزا موصوف (یعنی سودا) نے قصیدے پر دستکاری کا حق ادا کر دیا۔ ان کے بعد شیخ مرحوم (ذوق) کے سوا کسی نے اس پر قلم نہیں اٹھایا اور انھوں نے مرقع کو ایسی اونچی محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ (محمد حسین آزاد)

- انوری، ظہیر، ظہوری، نظیری، عرفی فارسی، آسمان پر بجلی ہوکر چمکتے ہیں۔لیکن ان کے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہندی کی زمین کو آسمان کر دکھایا۔(محمد حسین آزاد)
- قصیدہ گوئی میں ذوق کا پایہ بہت بلند ہے۔سودا کے بعد اس صنف شاعری کے معیار کو قائم رکھنے میں انھوں نے بڑی قابلیت سے کام لیا۔(ڈاکٹر اعجاز حسین)
- مرزا رفیع سودا کے بعد قصیدہ گوئی میں شیخ ابراہیم ذوق کا نمبر ہے مگر ان دونوں شاعران نامی میں پہاڑ اور ٹیلے کا فرق ہے۔(امداد امام اثر)
- غزل اور قصائد سے دفتر دفتر ہے اور ہر شعر انتخاب (صاحب آثار الصنادید سر سید احمد خان)
- مشق سخن وری اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ کوئی بات اس صاحب سخن کی پیرایۂ بیان سے معرا نہ ہوگی۔(سر سید احمد خان)
- آمد مضامین برجستہ کی اس قدر اس کو حاصل ہے کہ کسی شاعر کو آج تک نہیں ہوئی ہے۔'' (مولوی کریم الدین)
- کوئی شاعر جس نے قصیدے میں کمال بہم نہیں پہنچایا وہ مسلم الثبوت نہیں سمجھا گیا۔خود مرزا غالب کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے اور اس بنا پر وہ شیخ محمد ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا شاعر جانتے تھے۔(الطاف حسین حالی)
- اس زمانہ میں خصوصاً دہلی میں کوئی ان کے مقابلہ کا نہیں ہے۔اکثر مشاعروں میں اس کی آتش زبانی کے آگے دوسرے شعرا مثل خس و خاشاک کے جلتے ہیں اور اس کے الفاظ برجستہ کے رشک سے جب کہ وہ محفل مشاعرہ میں غزل پڑھتا ہے شرمندہ ہوکر بے تابانہ کف افسوس ملتے ہیں۔(امام بخش صہبائی)
- اس قدر جامعیت کہ فصاحتِ عبارت اور متانتِ ترکیب اور تازگیِ طرز ادا اور جدت معنی اور غرابت تشبیہ اور حسن استعارہ اور خوش اسلوبی کنایہ اور لطف تلمیح اور پاکی الفاظ اور تنگ ورزی کلمات اور پست قافیہ اور نشست ردیف اور نظم و نسق کلام اور حسن آغاز و انجام ایک جائے میں جمع ہے۔(سر سید احمد خان)
- محمد حسین آزاد نے ذوق کے متعلق لکھا ہے کہ ملک الشعرا کا سکہ ان کے نام سے موزوں ہوا اور اس کے طغرائے شاہی میں یہ نقش ہوا کہ اس پر نظم اردو کا خاتمہ کیا گیا۔چنانچہ اب ہرگز امید نہیں کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔
- محمد حسین آزاد نے ذوق کے متعلق لکھا ہے کہ رنگ سانولا چیچک کے داغ بہت تھے۔کہتے تھے کہ

نو دفعہ چیچک نکلی تھی۔ مگر رنگت اور داغ کچھ ایسے مناسب اور موزوں واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے۔

ذوق کے داخل نصاب قصائد

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر

زہے نشاط اگر کیجیے اسے تحریر
عیاں ہو خامے سے تحریر نغمہ جائے صریر

زبان سے ذکر اگر چھیڑیے تو پیدا ہو
نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم وزیر

ہوا یہ باغ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلید قفل دل تنگ و خاطر دلگیر

کرے ہے وا لب غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موج تبسم کی کھول کر زنجیر

کچھ انبساط ہوائے چمن سے دور نہیں
جو وا ہو غنچہ منقار بلبل تصویر

قفس میں بیضے کے بھی شوق نغمہ سنجی سے
عجب نہیں کہ ہو مرغ چمن بنالہ صفیر

اثر سے باد بہاری کے لہلہانے میں
زمیں پہ ہم سر سنبل ہے موج نقش حصیر

نکل کے سنگ سے گر ہو شرارہ تخم فشاں
تو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگ شعیر

زمین پر گرتے ہی لے آئے دانہ برگ وثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

نہ خار دشت ہے نرمی میں خواب مخمل ہے
ہر ایک تار رگ سنگ بھی ہے تار حریر

ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دود گلخن بھی
برستا اٹھتا ہے آتش سے مثل ابر مطیر

یہ آیا جوش میں باران رحمت باری
کے سنگ سنگ میں سنگ دیدہ کی ہے تاثیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغر عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی طرح خوش آب
ہر اک گہر گہر شب چراغ پر تنویر

کرے ہے صبح شکر خندہ اس مزے کے ساتھ
کہ جس طرح بہم آمیختہ ہوں شکر وشیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلف مشکیں کو
سواد مشک ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

نہال شمع سے ہر شب چنے گل خوشبو
بہار عیش میں گلچیں کی طرح سے گلگیر

ہنسے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں
حیا سے رنگ گل آفتاب ہو تغیر

رہے ہے چرخ پہ ہر صبح، جوں صبوحی کشش
بہ ایں درازی ریش آفتاب ساغر گیر

عجب نہیں ہے کہ آرائش زمانہ سے
حنائی پنجے ہوں، تاک و چنار و بیدا نجیر

چمن میں ہے یہ درختانِ سبز پر، جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزانِ خطۂ کشمیر

نہ کیوں کہ دیکھ کے گلشن کو یہ پڑھوں مطلع
کہ آئے ہے نظر، اک قدرتِ خداے قدیر

مطلع ثانی

ظہورِ نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیم و نکہتِ گل، مظہرِ لطیف و خبیر

شمیمِ عیش سے، ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ قرصِ عنبر اگر ہے زمیں، تو گرد عبیر

حمل سے حوت تلک، جا بہ جا ہیں تصویریں
بنا ہے، عالمِ بالا بھی، عالمِ تصویر

جہاتِ ستہ سے، بزم جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجومِ نشاط و سرور جمِ غفیر

زمانہ دشمنِ عشرت کا اس قدر قاتل
مہِ صیام کو، دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ، یہ بزم گاہِ عیش و نشاط
کہ شمس بازغہ کی جا، پڑھیں ہیں، بدرِ منیر

اگر پیالہ ہے صغریٰ، تو ہے سبو کبریٰ
'نتیجہ' یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمین میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز
کہ لالے مے سے، ہو دیوارِ قہقہہ، تعمیر

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے
ضمیرِ خلق سے، اے بادشاہ پاک ضمیر

عجب نہیں، یہ ہوا سے، کہ مثلِ نبض صحیح
کرے اگر حرکتِ موجِ چشمۂ تصویر

شہنشا! ترے یمنِ شفاے کامل سے
جو لاعلاج مرض تھے، وہ ہیں علاج پذیر

کہ چوبِ گل کو اگر ماریں بیدِ مجنوں پر
تو صورتِ بشر ہوش مند، خوش تقریر

اشارہ فہم ہو ایسا کہ وہ بیان کرے
زبان برگ سے، گونگے کے، خواب کی تعبیر

جو میلِ کحل بصارت ہو کلکِ خطِ غبار
تو چشمِ دائرہ عین بھی، ہو چشم بصیر

نہ موج مے کو ہو پیچش، نہ شیشہ لے ہچکی
گئی جہاں سے یہ بیماریِ فواق و زحیر

نہ برق کو تپِ لرزہ، نہ ابر کو ہو زُکام
نہ آب میں ہو رطوبت، نہ خاک میں تبخیر

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخ دارو
شرابِ تلخ بھی ہو، مے کشوں کی شربت و شیر

قوی ہے قوتِ تاثیر سے دو اے طبیب
غنی قبول کی دولت سے ہے دعاے فقیر

(قطعہ)

شکستِ دل کو ترے، یمن تندرستی سے
کرے درست، اگر مومیائی تدبیر

تو موے کاسۂ چینی کو چارہ ساز قضا
نکالے کاسۂ چینی سے مثلِ موے خمیر

کھجائے سر، جو کبھی مفسدانِ سرکش کا
علاجِ خارش سر ہو، بہ ناخنِ شمشیر

بنا ہے، نقشِ شفاخانۂ ہزار شفا ۔۔۔ ہر ایک خانۂ تعویذ صاحب تکسیر
ہر ایک اسم، عزیمت میں، اسم اعظم ہے ۔۔۔ ہر ایک نسخۂ شفا میں ہے، نسخۂ اکسیر
رہا نہ کوئی، گرفتارِ رنج، عالم میں ۔۔۔ چھٹے، جو تیرے تصدق میں، مجرمانِ اسیر
شہا ہے دم سے ترے، زندگانیِ عالم ۔۔۔ یہ تیرا دم ہے، وہ اعجازِ عیسوی تاثیر
مثالِ خضر، تو اے رہنمائے ملت و دیں ۔۔۔ جہاں میں پیر ہو، پر ہوکرامتوں سے پیر
تو ہے وہ، حامیِ دنیا و دیں زمانے میں ۔۔۔ کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو، دین کو توقیر
کیا شہانِ سلف نے، مسخر ایک جہاں ۔۔۔ کیے ہیں تو نے شہنشاہِ دو جہاں، تسخیر
سحر سے شام تلک، زرفشاں ہے، پنجۂ مہر ۔۔۔ نثار کرتا ہے، ہر روز ایک گنجِ خطیر
فلک پہ کرتا ہے، ہر شب ادا، جو سجدۂ شکر ۔۔۔ نشانِ سجدہ ہے، زیبِ جبین ماہِ منیر

یہ روز بہ سے ترے ہے جواں جہانِ کہن
کہے نہ کوئی دو شنبے کو بھی، جہان میں، پیر

(قطعہ)

حیات بخش جہاں، تیرا مژدۂ صحت ۔۔۔ جو بخشے خلق کو، عمر طویل و عیشِ کثیر
ہزاروں سال، سرِ ہر صدی نکال کے دانت ۔۔۔ ہنسیں اجل پہ، جوانوں کی طرح مردم پیر
جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت ۔۔۔ صحیح، جیسے کہ قرآن ہو مع تفسیر
یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں جس سے روز بروز ۔۔۔ ہلال بست و نہم کی طرح بدن کے حقیر
پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلعِ روشن ۔۔۔ کہ جس کا مطلع خورشید بھی نہ ہووے نظیر

مطلعِ ثالث

شہنشا! وہ تری روشنیِ رائے منیر ۔۔۔ عقولِ عشرہ، کے انوار جس کے عشرِ عشیر
جو ہو نہ، تابع امر 'تشاور فی الامر' ۔۔۔ تو عقلِ کل کو، کرے تو نہ ہرگز، اپنا مشیر
جو ہیں، نکات و معانی، بشر کی فہم سے دور ۔۔۔ وہ تیرے ذہن میں، موجود، سب قلیل و کثیر
اگر ہے، سہو کو کچھ دخل، حافظے میں، تو یہ ۔۔۔ نہ اپنا یاد ہے احساں، نہ اور کی تقصیر
جو ہے حیا متعلق، تری نگاہ کے ساتھ ۔۔۔ تو ہے، صفائی کی جانب، تری صفا کی ضمیر
ترا تو سیہ بھی، یوں ہے داخلِ حسنات ۔۔۔ کہ جیسے صحبتِ اصحابِ کہف میں تطہیر
کرے ہے سلب، تغیر، کو ذاتِ حادث سے ۔۔۔ زمانہ عدل سے تیرے، یہ اعتدال پذیر
مجال کیا کہ ترے عہد میں، شرر کی طرح ۔۔۔ اٹھائیں، سر کو شرارت سے، سرکشانِ شریر

ہوا میں آکے، جو کرتا ہے سرکشی، شعلہ
تو چنکیاں، دلِ آتش میں لے ہے، آتش گیر

ترے نسق سے، جو بالکل رہی نہ، خوں ریزی
لڑائیوں میں، کہیں، پھوٹتی نہیں، نکسیر

جو پہنچے، بت کدے میں تیرا شورِ دیں داری
بلند، نالۂ ناقوس سے بھی، ہو تکبیر

کیا، یہ کفر کو، اسلام نے ترے، معدوم
کہ کوئی زلفِ بتاں پر، نہ کر سکے، تکفیر

جہاں میں، چشم سیہ مستِ یار کا، ہو یہ رنگ
جو مے کشوں کو، ترا احتساب دے، تعزیر

پڑے گلے میں رسن خطِ سرمہ سے، اس کے
رہے، مدام وہ گردش میں، از پئے تشہیر

وہ برقِ قہرِ خدا، تیری تیغ آتش دم
کہ جس کی آنچ، ترے دشمنوں کو، نارِ سعیز

جو ہے خدنگ کا تیرے، نشانہ، چشم حسود
تو ہے تفنگ کا تیرے، دلِ عدو نخچیر

ترے نہیب سے ہوں، شکلِ فلسِ ماہی، الگ
کریں نہ حلقہ جوہر، رفاقتِ شمشیر

جو تیر نکلے، کماں سے تری، وہ ہوجائے
طلب میں، جانِ عدو کی رواں، قضا کا سفیر

ترے ہے، خامۂ طغرا نگار میں، یہ زور ق جو کھینچے، اک، روشِ خطِ منحنی، وہ لکیر

تو اس سے، ایسے ہوں اشکالِ ہندسی پیدا
مٹا دے، دیکھ کے اقلیدس اپنی سب تحریر

وہ روشنی، ترے خط میں کہ ابنِ مقلہ، اگر ق لگائے آنکھوں سے، سرمے کی جا تری تحریر

تو ہو یہ نورِ بصارت کو پڑھ لے حرف بہ حرف ق جو ہووے، لوحِ جبیں پر، نوشتۂ تقدیر

ترا سمند ہے، وہ تیز رو، کہ وقتِ خرام
نظر ہو، دیدۂ زرقا کی بھی، نہ اس کا نظیر

کہ سیرگاہ دو عالم، تو راہِ یک روزہ ق اور اس کا شرق سے تا غرب عرصہ گاہِ مسیر

ترے جو فیل کی تعریف خسروا لکھوں
کروں، حکایتِ شیریں وہ کوہ کن، تحریر

کہ فیل کوہ، کجک تیشہ، فیل باں، فرہاد
وہ دونوں دانت، صفا ایک ایک جوئے شیر

چلے نہ، اشرفی آفتاب، عالم میں ق خطِ شعاع سے اس پر، جو ہو نہ ہو یہ، تحریر

ابو ظفر، شہِ والا گہر، بہادر شاہ ق سراجِ دینِ نبی، سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ، شہریارِ والا جاہ
خدیوِ مہر کلہ، خسروِ سپہر سریر

رقم میں گر ترے انصاف کی قصور کرے
زبانِ خامہ، عطارد کی ناک میں دے تیر

زمیں ہو سبز، جو تیرے سحابِ بخشش سے
تو بوٹی بوٹی سے، ہر خاک کی بنے، اکسیر

بہ چشمِ مہر، اگر تیرا نیر اقبال ق کرے نگاہ، سرِ آب جو و آبِ غدیر

تو فلس فلس سے ہو، ماہیوں کے، وقتِ شکارق   نگینِ دستِ سلیماں بدستِ ماہی گیر
نہ ہے ثنا کے لیے تیری، اختتام و تمام ق   نہ ہے دعا کے لیے تیری، انتہا و اخیر
مگر یہ ذوقِ ثنا سنج و مدح خواں تیر! ق   غلام، پیرِ کہن سال، اک فقیرِ حقیر
کرے ہے دل سے دعا، یہ سدا فقیرانہ   سنا ہے، جب سے کہ رحم خدا دعاے فقیر
الٰہی! آپ پہ ہو، تا زمیں، زمیں کو ثبات   زمیں پہ، تاہو فلک اور فلک کوہو تدویر
فلک پہ چھوڑے، نہ تادامنِ مسیح، حیات   زمیں پہ خضر ی تا ہو فنا، نہ دامن گیر
عطا کرے تجھے، عالم میں قادرِ قیوم ق   بہ جاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر
تنِ قوی و مزاجِ صحیح و عمرِ طویل   سپاہِ وافرو ملکِ وسیع و گنجِ خطیر
جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک موید و اختر معین و بخت نصیر

ہیں مرے آبلۂ دل کے، تماشا گوہر

ہیں مرے آبلۂ دل کے، تماشا گوہر   اک گہر ٹوٹے، تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر
نظرِ خلق سے، چھپ سکتے نہیں، اہلِ صفا   تہِ دریا سے بھی، جا ڈھونڈ نکالا گوہر
رزق تو درخورِ خواہش ہے پہنچتا سب کو   مرغ کو دانہ ملا، ہنس نے پایا گوہر
پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت   غرق ہے آب میں پر، تر نہیں اصلاً گوہر
ہے دلِ صاف کو عزلت میں بھی گردوں سے غبار   گرد آلودِ یتیمی ہواء تنہا گوہر
اور باطن کو ہوگیا جوہرِ دانش کی شناخت   کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر
غیر پُر مایہ، نہ کم مایہ سے ہو ضبطِ ہوس   بہ گیا ژالہ، ہو الگ کے، نہ پگھلا گوہر
جوہر خوب کو درکار ہے آرائشِ خوب   خوب تو آب کی خوبی سے ہے ٹھہرا گوہر
سرکشی کرتے ہیں بے مغز نہ پُرمغز وقار   جز حباب، آب سے سر کھینچے نہ بالا گوہر
ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد   ہو نہ ہم صحبتِ تارِ رگِ خدا گوہر
دل خراش اور ہے، طاقتِ دہِ دل ہے کچھ اور   کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو، نہ ہیرا گوہر
فیض کو عالم بالا کے ہے شرط استعداد   قطرہ یک جا ہے طبا شیر، تو یک جا گوہر
صدق اور کذب پہ، ہر نکتے کے ہے شرط نظر   کور کیا جانے، یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر
صاف باطن کی ہو جب قدر کہ ظاہر ہو درست   مول بھی ٹوٹ گیا، صاف جو ٹوٹا گوہر

ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی — تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر
خلشِ خار جنوں سے ہے، پروتا کیا کیا — ہر قدم پر، قدمِ آبلہ فرسا گوہر
دلِ عاشق میں کرے، کیوں کہ نہ آنسو، سوراخ — اسی الماس سے، جاتا ہے یہ بیندھا گوہر

ذوق موقوف کر اندازِ غزل خوانی کو
ڈھونڈھ اس بحر میں، اب تو کوئی اچھا گوہر

غوطہ دریائے سخن میں ہے لگانا بہتر — آگے تقدیر سے خرمہرہ ملے یا گوہر
اثرِ مدح سے اس خسروِ دریا دل کی — کر سخن قابلِ گوشِ دلِ دانا گوہر
وہ بہادر شہِ غازی کہ بہ رنگِ نیساں — روز برسائے ہے ابرِ کرم اس کا گوہر
جشن سے اس کے ہے اک فیض کا دریا جاری — بہتے پھرتے ہیں برنگِ کفِ دریا گوہر
زیور آراہوں اگر صحن چمن میں گل و سرو — بیضۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر
پہنچے گر، گوشِ صدف تک، یہ نویدِ عشرت — اتنا بالیدہ بہ خود ہو کہ ہو بینا گوہر
کہتا ہے قطرۂ نیساں بھی کہ اس دور میں کاش — ہوتا میں دانۂ انگور، نہ ہوتا گوہر
جدولِ آب نے کثرت سے حبابوں کی بھرے — مانگ میں مثلِ بت خویشتن آرا گوہر
ٹوٹا ہے کشمکشِ عیش سے جو صبح کا ہار — بکھرے شبنم سے ہیں گلزار میں کیا کیا گوہر
گلِ بشگفتہ میں یہ قطرۂ باراں سے بہار — بھر دیے دُرجکِ یاقوت میں گویا گوہر
موجِ گوہر میں بھی ہے طرزِ تبسم پیدا — کوئی دم میں، روشِ غنچہ، ہنسے گا گوہر
رخِ گل رنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ — کیا تماشا ہے کہ بن جائے ہے مونگا گوہر
قطرۂ آب، لطافت سے ہے ٹپکا پڑتا — گوشِ خوبانِ سمن بر میں، مصفا گوہر

مدحِ حاضر میں کروں، میں کوئی مطلع تحریر
آج ہے خامہ مرا منہ سے اگلتا گوہر

مطلع ثانی

آج وہ دن ہے کہ اے خسروِ والا گوہر — کوہ دے نذر تجھے لعل، تو دریا گوہر
بحر و بر میں ہیں شہا تیرے مہیائے نثار — سیم سے زر تلک اور لعل سے لے تا گوہر
ہو ترے فیضِ قدم سے، جو زمیں، گوہر خیز — ہو نصیبِ صدف نقشِ کفِ پا گوہر
مشتری کہتے ہیں جس کو وہ اٹھا لایا چرخ — ٹوٹ کر، جو تری سمرن سے گرا تھا گوہر
صبحِ اقبال و سعادت کا ستارہ چمکا — جو ترے طرۂ دستار کا چمکا گوہر

تیرے آویزۂ سہ پیچ کا اے قبلۂ خلق　　صاف، قندیلِ در مسجدِ اقصا گوہر

حلبِ خلق میں ہے، سینہ ترا آئینہ　　عدنِ علم میں ہے قلبِ مصاف گوہر

پرورشِ دیوے چمن کو، جو ترا ابرِ کرم　　موتیا میں، عوضِ غنچہ ہو، پیدا گوہر

ماہ کہنے کے لیے ہے، نہ کہ گہنے کے لیے　　تیرے گہنے کا، کہوں کیا اسے زیبا گوہر

درفشانی سے تری، اتنے گہر ہیں ارزاں　　لکھتے ہیں نسخۂ مفلس میں اطبا گوہر

ق

عکس سے نیرِ اقبال کے، دریا میں ترے　　اے محیطِ کرم وجود کے، یکتا گوہر

آبِ گوہر ہو تہِ آب یہ اعجاز نما　　کفِ دریا کو بنائے یدِ بیضا گوہر

کوہ کا زہرہ کرے آب، تری ہیبت عدل　　گر یہ سن پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر

طبعِ نازک پہ تری، بارِ گہر ہو جو گراں　　پوستِ بیضۂ ماہی سے، ہو، ہلکا گوہر

آبِ دریائے کرم سے ہو جو تیرے سیراب　　ابرِ مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر

آج محفل میں تری، وہ گہر افشانی ہے　　لگنِ شمع میں ہیں، آنسوؤں کی جا گوہر

دستِ فراش میں جاروب ہے ریشِ فرعون　　فرش پر، تیلیوں میں الجھے جو صدہا گوہر

تیرے دورانِ حفاظت میں کہاں رنج وگزند　　حق میں بیمار کے، تبخالہ ہے لب کا گوہر

افعیِ زلف کے کاٹے کو ہے، جوں مہرۂ مار　　گوشِ خوباں میں نہیں، زلفِ سمن سا گوہر

سینہ صافی کا ترے ایک ہے نقشہ دریا　　دلِ روشن کا ترے، ایک نمونا گوہر

نقرۂ خنگ ترا، ایسا بہ رنگِ شفاف　　روبرو جس کی صفائی کے، ہو میلا گوہر

غرق دریائے جواہر میں ہے وہ کوہ گراں　　گل ہیں منہدی کی جھڑاں لعل پنا گوہر

پیل تیرا ہے، بلندی میں فلک سے افزوں　　جھول میں جس کی ہیں انجم سے زیادہ گوہر

لے کے خرطوم میں جو آب ہو وہ قطرہ فشاں　　دیوے جوں ابرِ بہاراں ابھی برسا گوہر

ہے ترے قطرۂ پیکاں سے، دم بارش تیر　　جگرِ چاکِ عدو میں، صدف آسا گوہر

تیرا نیزہ ہے وہ طائر کہ عوض دانے کے　　مہرہ پشت سے، دشمن کے ہے چنتا گوہر

شعلۂ برقِ غضب سے ترے، شاہا تہِ آب　　مثلِ مریخ ہو اک سرخ ستارا گوہر

مہر داروں میں ترے، ایک ہے ناچیز عقیق　　آب داروں میں ترے، ایک ہے ادنا گوہر

گرجے گردوں کی طرح سے وہ بہ آواز مہیب　　جوہری جس کو کہ بتلائے ہے، گرجا گوہر

ہو تری کلکِ کرم جب کہ شہا گوہر بار　　جیبِ محتاج کے، دامن میں ہو نقطا گوہر

نقطہ قافِ قلم سے جو ہو تیرے ہم سر
قاف تک قاف سے ہو بیضۂ عنقا گوہر

سینہ صافی سے ترے، ہووے صفا ایسی عام
دلِ کافر میں بھی ہو، خالِ سویدا گوہر

ہو جو روشن گرِ عالم ترا نور دانش
موے چینی میں پرویا کرے اعما گوہر

خسروا میں جو کہوں سب ترے اوصاف نکو
تو سدا منہ سے مرے، پھول جھڑیں یا گوہر

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
تا کہ ہو سنگ سے لعل، آب سے پیدا گوہر

ارہے پنجۂ خورشید پہ ہر روز طلا
تا گرہ میں رکھے، شب عقدِ ثریا گوہر

دانۂ انجم گردوں سے پروے جب تک
رشتۂ کاہ کشاں میں شبِ یلدا گوہر

جب تلک جوش بہاراں سے ہوا ہے دمِ صبح
ٹانکے شبنم سے بہ سرِ دامنِ صحرا گوہر

ہر برس جشن ترا تجھ کو مبارک ہووے
برسیں نیسانِ کرم سے ترے شاہا گوہر

دوستوں کو ہو ترے گنجِ گہر روز نصیب
ہو نہ خدا شک سرِ دامنِ اعدا گوہر



مثنوی کا فن

- مثنوی کے لغوی معنی دو۔دو کے ہیں۔
- مثنوی اس طویل نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی قصہ یا کوئی واقعہ تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہو۔
- مثنوی ایک بیانیہ صنف ہے۔
- مثنوی کو بیانیہ شاعری کی معراج بھی کہا جاتا ہے۔
- لفظ مثنوی عربی زبان کا لفظ ہے لیکن بحثیت صنف سخن مثنوی کی ایجاد فارسی میں ہوئی۔اردو نے اسے فارسی ہی سے مستعار لیا۔
- مثنوی کے لیے سات اوزان مقرر ہیں۔مثلاً بحر ہزج، رمل سریع، خفیف، متقارب متدارک۔
- عام طور سے رزمیہ مثنوی کے لیے بحر متقارب اور بزمیہ کے لیے بحر ہزج یا بحر سریع مستعمل ہے۔
- جس مثنوی میں جنگ کا بیان ہو اسے رزمیہ مثنوی کہتے ہیں جیسے مثنوی علی نامہ۔
- جس مثنوی میں عشق و محبت کی داستان بیان ہو اسے بزمیہ مثنوی کہتے ہیں جیسے: قطب مشتری۔
- عناصر مثنوی حسب ذیل ہیں:
  * حمد و نعت * مدح فرماں روائے وقت * تعریف شعر و سخن
  * قصہ یا اصل موضوع * خاتمہ
- حالی نے مثنوی کو سب سے زیادہ کارآمد صنف قرار دیا ہے۔
- فنی اعتبار سے مثنوی کا امتیاز ہر شعر کے مصرعوں کا ہم قافیہ ہونا ہے۔
- مثنوی میں ہر شعر کا قافیہ جدا جدا ہوتا ہے۔
- مثنوی میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں ہوتی ہے۔
- مثنوی میں غزل کی طرح ردیف و قوافی کی پابندی نہیں ہوتی۔
- مثنوی کی خصوصیات میں سے ایک واقعات نگاری بھی ہے۔



مثنوی کا آغاز اور ارتقا

- دیگر اصناف سخن کی طرح مثنوی کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی ہے۔
- محققین نے سب سے پہلا مثنوی نگار فخر دین نظامی کو اور پہلی مثنوی اس کی تصنیف کدم راؤ پدم

راؤ کو قرار دیا ہے۔

دکن میں مثنوی کا ارتقا

- یاد رہے کہ دکن میں اردو شاعری کی باضابطہ ابتدا مثنوی نگاری سے ہی ہوئی تھی۔
- اردو میں سب سے پہلے دکن میں ہی مثنوی لکھی گئی تھی۔

بہمنی دور کی مثنویاں

- فخر دین نظامی: کدم راؤ پدم راؤ (1421 اور 1435 کا درمیانی حصہ)
- میراں جی شمس العشاق: خوش نامہ، خوش نغز، شہادت التحقیق
- سید شاہ اشرف بیابانی: لازم المبتدی، واحد باری نوسر ہار (واقعۂ کربلا سے متعلق)

عادل شاہی دور (بیجاپور) کی مثنویاں

- برہان الدین جانم: ارشاد نامہ، حجت البقا، وصیت الہادی، بشارت الذکر، منفعت الایمان اور پنج گنج
- عبدل: ابراہیم نامہ (1021ھ 1603، ابراہیم عادل شاہ ثانی معروف بہ جگت گرو کے فرمائش)
- میرزا محمد مقیم مقیمی: چندر بدن ومہیار، فتح نامہ بکھیری (رزمیہ مثنوی)
- امین: بہرام وحسن بانو
- حسن شوقی: فتح نامہ نظام شاہ، میزبانی نامہ
- سید حسن شاہ محی الدین صنعتی: قصۂ بے نظیر، گلدستۂ عشق
- کمال خان رستمی: خاور نامہ (اردو کی سب سے طویل مثنوی 24 ہزار اشعار اور 222 عنوانات پر مشتمل)
- ملک خوشنود: یوسف زلیخا، بازار حسن، ہشت بہشت (جنت سنگار)
- محمد نصرت نصرتی: گلشن عشق (1068ھ 1657ء عشقیہ مثنوی)،
- علی نامہ (1076ھ 1665ء، رزمیہ مثنوی)، تاریخ اسکندری (فتح نامہ بہلول خان 1083ھ 1672ء)
- سید میراں ہاشمی: معراج نامہ، عشقیہ مثنوی، مثنوی یوسف زلیخا

قطب شاہی دور (گولکنڈہ) کی مثنویاں

- قطب الدین قادری فیروز بیدری: پرت نامہ
- شیخ احمد شریف گجراتی: یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں
- ملا اسد اللہ وجہی: قطب مشتری
- شیخ بہاء الدین غواصی: مینا ستونتی، سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ
- ابن نشاطی: پھول بن (1744 اشعار پر مشتمل)
- احمد جنیدی: ماہ پیکر
- طبعی: بہرام وگل اندام

مغل دور کی مثنویاں

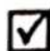
- شاہ حسن ذوقی: وصال العاشقین، نزہت العاشقین
- قاضی محمود بحری: من لگن (موضوع تصوف) (1112ھ 1700ء)
- ولی ویلوری: روضۃ الشہدا
- سید محمد خان عشرتی: دیپک پتنگ، چت لگن
- سید محمد فراقی: مراۃ الحشر
- سید محمد والہ موسوی: طالب و موہنی
- شاہ عشق اللہ عاشق: اشارت الغافلین
- سید اشرف: جنگ نامۂ حیدر
- ولی دکنی: در تعریف شہر سورت
- سراج اورنگ آبادی: بوستان خیال (عشقیہ مثنوی)، سوز و گداز، مناجات، نالۂ ہجر، نامۂ شوق، احوال فراق، خط بندگی، مطلب دل، حمد باری تعالیٰ، مناجات، درنعت حضرت رسالت

شمالی ہند میں مثنوی کا ارتقا

- یاد رہے کہ شمالی ہند کی پہلی مکمل و مستند مثنوی افضل کی بکٹ کہانی ہے۔
- محمد افضل افضل: بکٹ کہانی
- عبداللہ امین: فقۂ ہندی
- محبوب عالم عرف شیخ جیون: محشر نامہ، دردنامہ
- اسماعیل امروہی: تولد نامہ، بی بی فاطمہ، قصۂ معجزۂ انار
- فائز دہلوی: مناجات، در مدح شاہ ولایت، تعریف، پنگھٹ، تعریف، ہولی، در وصف بھنگیڑ ن درگاہ قطب، رقعہ، در وصف حسن، رقعہ، رقعۂ محبوب، تعریف جوگن، بیان میلہ مہتہ، در وصف کا چھن، تعریف بتولن، تعریف نہان، نکبود، ماکن، گوجری۔
- ظہور الدین حاتم: مثنوی سراپا، ساقی نامہ، وصف قہوہ، وصف تمباکو و حقہ، مثنوی بہاریہ مسمی بہ بزم عشرت
- شاہ آیت اللہ جوہری: گوہر جوہری
- جعفر زٹلی: ظفر نامہ اورنگ زیب شاہ عالم گیر بادشاہ غازی، در صفت پیری، صفت جلوس اعظم شاہ بعد عالم گیر، مرثیہ اورنگ زیب، سپس نامہ، طوطی نامہ
- محمد فقیہ دردمند: ساقی نامہ
- شاہ مبارک آبرو: آرائش معشوق، موعظت
- سودا: قصہ پسر شیشہ گروزرگر پسر (عشقیہ مثنوی)
- میرا: (نو مثنویاں) خواب و خیال، معاملات عشق، دریائے عشق، شعلۂ عشق، جوش عشق، اعجاز عشق، حکایت عشق، جوان و عروس، مولا نامہ
- غلام علی راسخ عظیم آبادی (20 مثنویاں): کشش عشق، نیرنگ محبت، جذب عشق، حسن و عشق، ناز و نیاز، اعجاز عشق، گنجینۂ حسن، مراۃ الجمال، مکتوب الشوق، مثنوی در بیان انقلاب زمانہ، سبیل

نجات، نورالانظار، شرح حال، مثنوی در مدح راشد صاحب، مثنوی مدحیہ، مثنوی عابد کہ دوزوجہ داشت، حکایت در بیان احوال تاجر، حکایت در بیان تاجر، اس شہر میں اچکّا ہے۔

- میر اثر: خواب وخیال
- میر حسن: 12 مثنویاں، سحرالبیان؛
- غلام ہمدانی مصحفی: (20 مثنویاں) طفل حجام، ہجو چارپائی، در ہجو افراط کھٹمل، وصف اجوائن خراسانی، جذبۂ عشق، درافراط سرما، درافراط گرما، درافراط آتش، شعلۂ شوق، درہجو مکانے، گلزار شہادت، مرغ نامہ، قوم شیخ، بحرالمحبت وغیرہ۔
- جرأت: (32 مثنویاں): نامۂ عاشق بجانب معشوق، مثنوی کارستان الفت، مثنوی شعلۂ شوق، مثنوی حسن وعشق، مکتوب چل قلم لکھ شکایت جاناں، مثنوی سراپائے عشق، مثنوی ہجو نزلہ وزکام، مثنوی درہجو خارش، مثنوی درہجو کریلا بھانڈ وغیرہ۔
- انشا: (آٹھ مثنویاں) مرغ نامہ، مثنوی زنبور، مثنوی کھٹمل، ہجو پشہ، مثنوی مگس، شکایت نامہ، مثنوی فیل، مثنوی گیان چند ساہوکار
- پنڈت دیاشنکر نسیم: گلزار نسیم
- تصدق حسین شوق لکھنوی: فریب عشق، بہار عشق، زہر عشق،
- ناسخ: نظم سراج
- غالب: مثنوی درصفت انبہ
- مومن: (12 مثنویاں) شکایت ستم، قصۂ غم، قول غمیں، کف آتشیں، حسنین مغموم، آہ زاریِ مظلوم، مثنوی جہاد، اسرارِ عشق
- واجد علی شاہ: دریائے تعشق، افسانۂ عشق، بحرالفت
- امیر مینائی: ابر کرم، نور تجلی، کارنامۂ عشرت
- تسلیم: شام غریباں، صبح خنداں
- داغ دہلوی: فریاد داغ
- شوق قدوائی، ترانۂ شوق، حسن بہار، برسات، عالم خیال
- حفیظ جالندھری: شاہنامۂ اسلام
- محمد حسین آزاد: شب قدر، ابر کرم
- نظم طباطبائی: ساقی نامہ
- محسن کاکوروی: (5 مثنویاں) صبح تجلی، چراغ کعبہ، شفاعت ونجات، فغانِ محسن، نگارستانِ الفت
- حالی: شکوہ ہند، برکھارت
- شاد: (آٹھ مثنویاں) نالۂ شاد، نغمۂ جاں فزا، یاد حبیب، چشمۂ کوثر، ثمرۂ زندگی، فغانِ دل کش، نوید ہند (مادر ہند)، نالۂ دل کش



اردو کے اہم مثنوی نگار اور ان کی مثنویاں

نظامی بیدری اور کدم راؤ پدم راؤ

(زمانۂ تصنیف 825ھ اور 839ھ مطابق 1421ء 1435ء کا درمیانی حصہ)

- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اردو زبان کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ بہمنی دور کے پہلے شاعر فخر دین نظامی کی تخلیق ہے۔ جس کا تخلص نظامی ہے۔
- جمیل جالبی کے مطابق نظامی سلطان احمد شاہ بہمنی (نواں بادشاہ) کے دور میں بیدر میں سکونت پذیر تھے۔
- نصیرالدین ہاشمی کے مطابق نظامی سلطان احمد شاہ کے درباری شاعر تھے۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ احمد شاہ بہمنی کے دور ہی میں لکھی گئی۔
- اس کا زمانۂ تصنیف 825ھ 1421ء اور 839ھ 1435ء کا درمیانی حصہ ہے۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا تعارف سب سے پہلے مجلّہ معارف میں نصیرالدین ہاشمی نے کرایا اور اس کا نام بھی تجویز کیا۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کو جمیل جالبی نے ترتیب دے کر ایک طویل مقدمے کے ساتھ 1973ء میں انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی سے شائع کرایا تھا۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں اشعار کی تعداد 1032 ہے اور 1033 واں شعر نامکمل ہے۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ بحر متقارب مثمن محذوف الآخر یا مقصور الآخر یعنی فعول فعولن فعول فعل یا فعول کے وزن میں لکھی گئی ہے۔
- مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں ہندی اور مقامی الفاظ کی بہتات ہے۔
- جمیل جالبی نے کدم راؤ پدم راؤ کی اولیت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے:

  ''اس دور کی سب سے پہلی تصنیف جواب تک دریافت ہوئی ہے فخر دین نظام کی کدم راؤ پدم راؤ ہے۔''

- مثنوی کے دو مرکزی کرداروں کے نام پر اسے کدم راؤ پدم راؤ نام دے دیا گیا ہے۔

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کا خلاصہ

اس مثنوی کا قصہ کدم راؤ اور پدم راؤ کے کرداروں پر مشتمل ہے۔ کدم راؤ ہیرانگر کا راجا ہے اور

پدم راؤ اس کا وزیر جو ایک ناگ ہے اور کدم راؤ کی عنایت سے اس کے سر پر پدم بھی موجود ہے۔ایک دن کی بات ہے کہ کدم راؤ دیکھتا ہے کہ ایک اعلا ذات کی ناگنی ایک ادنی سے سانپ کوڑیال سے جوٹ یعنی میل کھا رہی ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر کدم راؤ آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور تلوار سے سانپ کو مار دیتا ہے جس سے ناگنی کی بھی دم کٹ جاتی ہے۔اور وہ پاس کی ایک جھاڑی میں چلی جاتی ہے۔کدم راؤ وہاں سے پژمردہ ملول ہو کر اپنے محل میں آتا ہے اور چپ چاپ اپنے بستر پر لیٹ جاتا ہے۔رانی جب کدم کی یہ حالت دیکھتی ہے تو وہ اس کے پاس جا کر اس کی اداسی کا سبب پوچھتی ہے۔رانی کے بہت اصرار کے بعد وہ اس سے ناگنی اور کوڑیال کا چشم دید واقعہ سناتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ عورت ذات کی وفاداری سے اس کا بھروسہ اٹھ گیا ہے۔رانی کدم راؤ کو بہت سمجھاتی ہے کہ ہر عورت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ وہ تو ہمیشہ اس کی وفادار داسی بن کر رہی ہے لیکن رانی کی باتوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اور وہ دنیا سے بیزار ہو جاتا ہے اور جوگیوں اور سنیاسیوں کی صحبت اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔وہ لوگوں سے کسی باکمال جوگی کو ڈھونڈھ کر لانے کا حکم دیتا ہے۔لوگ اکھر ناتھ نام کے جوگی کو اس کے پاس لاتے ہیں۔اکھر ناتھ اس کے سامنے اپنا کمال دکھاتا ہے اور لوہے کو سونا بنا دیتا ہے۔کدم راؤ اس سے بہت خوش ہوتا ہے اور اسے انعام و اکرام سے نوازتا ہے اور اس سے یہ فن سکھانے کی فرمائش کرتا ہے۔ جوگی اکھر ناتھ کدم راؤ کو دھنور بید اور امر بید سکھاتا ہے۔اور راجا سے ایک طوطا لانے کو کہتا ہے۔راجا محل سے رانی کے پالے ہوئے طوطے کو پھل کھلاتے ہوئے جوگی کے پاس لاتا ہے۔جوگی اکھر ناتھ اپنی روح کو کدم راؤ کے جسم میں اور کدم راؤ کی روح کو طوطے کے جسم میں منتقل کر دیتا ہے۔اور خود جوگی اکھر ناتھ راجا بن کر حکومت کرنے لگتا ہے۔کدم راؤ طوطا بن کر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا ہے۔ایک دن اڑتے اڑتے اسے اپنا محل نظر آتا ہے اور وہ محل میں پدم راؤ کے پاس آتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ راجا کدم راؤ ہے لیکن پدم راؤ کو اس کی بات پر یقین نہیں آتا ہے۔تب وہ اس سے ساری راز و نیاز کی باتیں بتاتا ہے جو صرف کدم راؤ اور پدم راؤ ہی کو معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سن کر پدم راؤ اپنا پھن کدم راؤ کے قدموں میں ڈال دیتا ہے اور دونوں آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں۔ایک رات جب اکھر ناتھ گہری نیند میں سو رہا ہوتا ہے تو پدم راؤ چپکے سے اس کے انگوٹھے میں ڈس لیتا ہے جس سے اس کی موت ہو جاتی ہے۔کدم راؤ امر بید کی مدد سے پھر اپنے جسم میں اپنی روح منتقل کر لیتا ہے اور اپنے اصلی روپ میں آ کر اپنی حکومت سنبھال لیتا ہے۔اس خوشی میں چھ مہینے تک جشن منانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

کرداروں کی پہچان

مثنوی کدم راؤ پدم راؤ میں اہم کردار کدم راؤ، پدم راؤ اور اکھر ناتھ جوگی ہیں۔



ملا اسد اللہ وجہی

(پیدائش 1566ء۔ وفات 1659ء)

- نام اسد اللہ اور تخلص وجہی تھا۔
- ملا وجہی کے تخلص کے سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا ماننا ہے کہ انہوں نے وجہی، وجیہی اور وجیہہ تینوں تخلص استعمال کیے ہیں۔
- جمیل جالبی کے مطابق قطب مشتری میں ہر جگہ تخلص وجیہی آیا ہے لیکن سب رس میں ہر جگہ وجہی لکھا ہے۔
- وجہی ابراہیم قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ میں 1566ء میں پیدا ہوئے۔
- وجہی نے اپنے ایک فارسی شعر میں اپنی جائے پیدائش ہندوستان اور آبائی وطن خراسان بتایا ہے۔
- جمیل جالبی کے مطابق وجہی کی تاریخ وفات 1070ھ مطابق 1659ء ہے۔
- وجہی محمد قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔
- قلی قطب شاہ نے وجہی کو ملک الشعرا کے اعزاز سے نوازا تھا۔
- وجہی نے چار بادشاہوں یعنی (1) ابراہیم قطب شاہ (2) محمد قلی قطب شاہ (3) محمد قطب شاہ (4) عبد اللہ قطب شاہ کا زمانہ دیکھا تھا۔
- وجہی کو نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔
- سب رس میں وجہی نے اپنی زبان کو زبان ہندوستان کہا ہے۔
- طبعی وجہی کا بہت بڑا مداح تھا۔

وجہی کے کارنامے

(1) قطب مشتری 1018ھ 1609 گولکنڈہ کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے۔

(2) سب رس 1045ھ 1635 اردو کی پہلی نثری تمثیلی کتاب ہے۔

(3) تاج الحقائق کو بھی مولوی عبد الحق نے وجہی کی نثری تصنیف قرار دیا ہے لیکن کسی نے یہ تحقیق پیش کی ہے کہ یہ گجرات کے ایک بزرگ شاہ وجہہ اللہ کا کارنامہ ہے۔

- ان کے علاوہ ایک فارسی دیوان ''دیوان وجہیہ'' ہے۔

قطب مشتری

(1018ھ مطابق 1609ء)

- قطب مشتری گولکنڈہ کی پہلی طبع زاد مثنوی ہے۔
- قطب مشتری ملا اسد اللہ وجہی نے 1018ھ مطابق 1609ء میں بادشاہ یعنی قلی قطب شاہ کی فرمائش پر لکھی۔
- وجہی نے اس کا سن تصنیف مندرجہ ذیل شعر میں بیان کیا ہے:

تمام اس کیا دیس بارا منے
سنہ یک ہزار ہور اٹھارا منے

1018

- چونکہ اس مثنوی میں قلی قطب شاہ اور مشتری کے عشق کی داستان ہے۔ اسی لیے اس کا نام قطب مشتری رکھا گیا ہے۔
- قطب مشتری کو سب سے پہلے مولوی عبدالحق نے مرتب کیا۔
- مثنوی قطب مشتری میں فن شاعری کے متعلق ایک باب بعنوان ''در شرح شعر گوید'' بھی ہے۔
- مثنوی قطب مشتری میں قصے کے درمیان کئی غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں۔ یہ غزلیں قطب شاہ اور مشتری کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اور یہ غزلیں ہندی گیتوں کے رنگ میں ہیں۔
- ملا وجہی نے قطب مشتری میں فرضی داستان کو بیان کیا ہے۔ لیکن حقیقی واقعہ اس سے مختلف ہے۔

حقیقی واقعہ

حقیقی واقعہ مختصراً یوں ہے کہ گولکنڈہ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ایک بستی چچلم کے نام سے آباد تھی جہاں اب چار مینار، جامع مسجد، مکہ مسجد لاڑ بازار اور شاہ علی بنڈہ وغیرہ واقع ہے۔ قطب شاہ زمانۂ شہزادگی میں گھوڑے پر سوار ہو کر یہاں اکثر شکار و تفریح کے لیے آیا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اس کی نظر بھاگمتی پر پڑی اور وہ اس کے حسن و جمال کو دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ پھر اس کا معمول بن گیا اور وہ روزانہ تفریح کے بہانے یہاں آنے لگا۔ ایک دفعہ موسم برسات میں رود موسی میں بڑی طغیانی آئی جب وقت مقررہ پر وہ قلعہ سے نکل کر ندی کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ ندی زور و شور سے بہہ رہی ہے۔ اور اس کا ندی پار کرنا امر محال ہے۔ لیکن جذبۂ عشق سچا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا اور اپنے محبوب سے جا ملا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب شہزادہ کے والد ابراہیم قطب شاہ کو ملی تو وہ پریشان ہو گیا اور اس نے فوری

حکم دیا کہ موسی ندی پر ایک پل تعمیر کیا جائے چنانچہ موجودہ پرانا پل 986ء اس واقعۂ عشق کی یادگار ہے۔
شہزادہ جب بادشاہ ہوا تو اس نے بھاگمتی سے شادی کر لی اور اس کی محبت میں 998ء میں ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی۔ بھاگمتی کے نام پر اس نے اس نئے شہر کا نام بھاگ نگر رکھا۔ اور شادی کے بعد محمد قلی قطب شاہ نے بھاگ متی کو رواج کے مطابق مشتری کا خطاب دیا۔

- وجہی نے مثنوی میں اصل واقعات کو ذرا سا بدل کر بیان کیا ہے اور یہ تبدیلیاں بھی قلی قطب شاہ کی ہی خواہش پر کی گئی ہیں۔

مثنوی قطب مشتری کا خلاصہ

ابراہیم قطب شاہ کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ دعاؤں کے بعد ایک چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ جوان ہوا تو اس کے حسن اور بہادری کی دھوم مچ گئی۔ ایک رات خواب میں اس نے ایک پری رو کو دیکھا اور ہزار جان سے خوابوں کی شہزادی پر عاشق ہو گیا۔ اب جو آنکھ کھلی تو عجب عالم تھا۔ سوائے رونے کے اسے کوئی چیز نہیں بھاتی تھی۔ بادشاہ کو معلوم ہوا تو بہت پریشان ہوا۔ شہزادے کے لیے کرناٹک، گجرات، چین اور ایران کی دوشیزاؤں کو جمع کیا اور کہا:

قطب شہ کو ں جو کوئی تہ رجھائے گی   بڑا مرتبہ سب میں وہ پائے گی

لیکن شہزادہ پر کسی کا جادو نہ چلا۔ بادشاہ نے شہزادہ سے کرید کرید کر پوچھا تو اس نے خواب کا واقعہ سنایا۔ اب تو بادشاہ کو اور فکر دامن گیر ہوئی اس نے مشورہ کے لیے عطارد کو طلب کیا۔ عطارد اپنے زمانے کا لاثانی مصور اور ساری دنیا کا سفر کیے ہوئے تھا جس کا دلچسپ مشغلہ عورتوں کی تصویریں جمع کرنا تھا۔ بادشاہ کی بات سن کر عطارد نے کہا کہ اس وقت دنیا کی حسین ترین دوشیزہ بنگالے کی شہزادی مشتری ہے۔ اس کی ایک بہن زہرہ ہے جو حضرت داؤد سے زیادہ خوش الحان ہے۔ اس نے کہا کہ مشتری کی ایک تصویر بھی اس کے پاس ہے۔ تصویر لا کر بادشاہ کو دکھائی۔ بادشاہ نے شہزادہ کو دکھائی۔ شہزادہ تصویر دیکھ کر پہچان گیا کہ یہی وہ خوابوں کی پری ہے۔ اب شہزادہ اور عطارد سوداگر بن کر سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ کہیں پہاڑ جیسے اژدہوں سے مقابلہ ہوتا ہے کہیں عامل و عابد سے ملاقات ہوتی ہے اور کہیں بادشاہ مغرب کی بیٹی سے۔ چلتے چلتے ایک ایسے مقام سے بھی گزرتے ہیں جہاں ایک راکشش رہتا تھا۔ شہزادہ اس کے قلعے کی طرف جاتا ہے تو وہاں اسے ایک آدم زاد ملتا ہے۔ وہ اسے بتاتا ہے کہ یہ راکشش جہاں بھی آدم زاد کو دیکھتا ہے پکڑ لیتا ہے اسے بھی اسی نے قید کر رکھا ہے۔ اور وہ حلب کے بادشاہ سرطان خان کے وزیر اعظم اسد خان کا بیٹا ہے۔ مریخ خان نام ہے۔ خواب میں ایک پری رو کو دیکھ کر عاشق و دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور اسی پری رو کی تلاش میں جس کا نام زہرہ ہے اور جو بنگالے کی شہزادی ہے، نکلا ہے۔ جو

لوگ ساتھ تھے وہ دغا دے گئے۔اب میں اکیلا اس خرابے میں قید ہوں۔پوچھنے پر محمد قلی نے بھی اپنا حال بیان کیا اور کہا کہ اب ہم دونوں دوست ہیں۔اوران دو مچھلیوں کی طرح ہیں جو ایک ہی جال میں پھنس گئی ہوں۔ابھی یہ باتیں ہورہی تھیں کہ سامنے سے راکشش آتا دکھائی دیتا ہے۔شہزادہ آیۃ الکرسی کا حصار باندھتا ہے۔اور جنگ کر کے راکشس کو قتل کر دیتا ہے۔

اب پھر یہ سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔اور قلعہ گلستان میں پہنچتے ہیں جو پریوں کا علاقہ ہے۔یہاں مہتاب پری شہزادہ پر عاشق ہو جاتی ہے۔اور شہزادے کو محل میں بلاتی ہے۔شہزادہ دوران ملاقات راکشس کو ہلاک کرنے کا واقعہ بیان کرتا ہے۔یہ سن کر مہتاب پری خوش ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ آج وہ بھی آزاد ہوگئی ہے۔اس پر محفل عیش کا حکم دیا جاتا ہے اور شراب کا دور چلتا ہے۔شہزادہ مہتاب پری کے ساتھ عیش وعشرت میں مشغول ہو جاتا ہے تو عطارد قطب شاہ سے بنگالہ جانے کی اجازت طلب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ جلد شہزادہ کو وہاں بلوائے گا۔عطارد بنگالہ پہنچتا ہے اور شہزادی کے محل کے قریب ایک جگہ پر مصوری شروع کر دیتا ہے۔اس کے کمال فن کی شہرت سارے ملک میں پھیل جاتی ہے اور مشتری اسے بلوا کر محل کو آراستہ کرنے کا حکم دیتی ہے۔عطارد دن رات لگ کر محل کو آراستہ کرتا ہے۔مشتری دیکھتی ہے تو دنگ رہ جاتی ہے۔اتنے میں اس کی نظر ایک تصویر پر پڑتی ہے جسے دیکھ کر مشتری دیوانی سی ہو جاتی ہے۔اور پوچھتی ہے کہ یہ کس کی تصویر ہے؟ عطارد بتاتا ہے کہ قطب شاہ کی تصویر ہے لیکن ایک پری اس پر عاشق ہوگئی ہے۔مشتری یہ سن کر رونے لگتی ہے عطارد یہ دیکھ کر کہتا ہے کہ وہ اسے جلد بلوا دے گا۔اور شہزادے کو بلوانے کے لیے ایک آدمی بھیجتا ہے۔جیسے ہی شہزادے کو اطلاع ملتی ہے وہ مہتاب پری سے اجازت لے کر روانہ ہو جاتا ہے مہتاب پری اسے بطور نشانی ''ترنگ بادپا'' گھوڑا دیتی ہے۔بنگالہ پہنچ کر مشتری سے ملاقات ہوتی ہے۔شراب کا دور چلتا ہے اور دونوں اتنے مست ہو جاتے ہیں کہ عطارد کو کہنا پڑتا ہے کہ اے شہزادے!

ترا مال ہے توں اُتاول نہ کر

شہزادہ قطب شاہ مریخ خان کا حال بھی بیان کرتا ہے اور طے ہوتا ہے کہ زہرہ سے شادی کر کے بنگالہ کی بادشاہی مریخ خان کو دے دی جائے۔اس کے بعد قطب شاہ مشتری کے ہمراہ دکن روانہ ہوتا ہے۔اورروہاں دونوں کی شادی دھوم دھام سے ہوتی ہے۔اور باپ قطب شاہ کو اپنی سلطنت دے دیتا ہے۔اس طرح بقول وجہی:

ملے قطب ہور مشتری ایک ٹھار   ہوا آج جگ میں آنند بے شمار

کرداروں کی پہچان

ج مثنوی قطب مشتری میں شہزادے کا نام قطب ہے اور اسی مناسبت سے مشتری، زہرہ، عطارد،

مریخ، مہتاب بہت سے نام ہیں جو کہ سیاروں کے نام ہیں۔

- قطب مشتری کو وجہی نے صرف 12 دن میں مکمل کیا تھا۔
- مثنوی قطب مشتری کے کردار بھی 12 ہیں۔

* ابراہیم قطب شاہ ہیرو کے والد ہیں۔
* محمد قلی قطب شاہ ہیرو ہے۔
* مشتری ہیروئن ہے جو مثنوی میں بنگالے کی شہزادی ہے۔
* زہرہ جو حضرت داؤد سے زیادہ خوش الحان ہے، مشتری کی بہن ہے اور ساتھ ہی مریخ خاں کی محبوبہ بھی۔
* مریخ خاں جو حلب کے بادشاہ، شاہ سرطان کے وزیر اعظم اسد خاں کا بیٹا ہے۔
* عطارد جو اپنے زمانے کا لاثانی مصور، ہیرو کا راز دار اور مشیر ہے جس کی رہنمائی سے قطب شاہ اور مشتری کے درمیان کٹھن منزلیں طے پاتی ہیں۔
* اسد خاں جو حلب کے بادشاہ کا وزیر اعظم اور مریخ کا باپ ہے۔
* شاہ سرطان حلب کا بادشاہ ہے۔ * میروان: مشتری کی دائی اور رازدار ہے۔
* مہتاب پری جو شہزادہ پر عاشق ہوئی تھی۔
* سلکھن پری جو کہ مہتاب پری کی کنیز اور رازدار ہے وہ مہتاب کی خدمت میں ستارہ بن کر رہتی تھی۔
* مریخ خاں راکشش کے قید میں تھا۔
* قلی قطب شاہ مریخ خاں کے ساتھ بنگالہ روانہ ہوا تھا۔
* بکٹ پہاڑ جہاں پر ایک بڑا اژدہا رہتا تھا۔
* قلعہ جہاں ایک راکشش رہتا تھا جس میں سمندر جیسی سات خندقیں تھیں۔
* شہزادہ بارہ افراد کو لے کر قلعہ کی طرف روانہ ہوا تھا۔
* شہزادے نے خنجر سے اژدہے کو مارا تھا۔
* شہزادہ اور عطارد سوداگر بن کر سفر پر روانہ ہوئے تھے۔
* قطعہ گلستان جو پریوں کا علاقہ ہے یہاں مہتاب پری شہزادے پر عاشق ہو جاتی ہے۔
* شہزادہ نے مہتاب پری کو اپنی انگوٹھی نشانی کے طور پر دی تھی۔
* مشتری عطارد کے ساتھ اپنی پسند کے سیاہ گھوڑے پر سوار ہو کر شہزادے سے ملنے گئی تھی۔



ابن نشاطی

(1040ھ اور 1045ھ کے درمیان)

- نام شیخ محمد مظہر الدین تھا اور والد کا نام شیخ فخر الدین تھا۔
- ابن نشاطی 1040ھ اور 1045ھ کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔
- ابن نشاطی گولکنڈہ کا باشندہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔
- ابن نشاطی کے نام کے ساتھ بطور سابقہ شیخ المشائخ لگایا جاتا تھا۔
- ابن نشاطی اپنے دور کا دوسرا بڑا شاعر ہے۔
- گیان چند جین کے مطابق اس کا سن وفات پردہ خفا میں ہے۔
- ابن نشاطی کو نثر و نظم پر مہارت حاصل تھی۔
- ابن نشاطی بنیادی طور پر انشا پرداز ہے۔
- پھول بن ابن نشاطی کی مشہور مثنوی ہے۔

پھول بن

(1066ھ مطابق 1655ء (جمیل جالبی))

- پھول بن محمد مظہر الدین ابن محمد فخر الدین ابن نشاطی کی تصنیف ہے۔
- پھول بن ایک عشقیہ مثنوی ہے اور اس کے اشعار کی تعداد 1744 ہے۔
- گوپی چند نارنگ کے مطابق پھول بن احمد حسن دبیر عیدروسی کے فارسی قصے 'بساتین الانس' سے ماخوذ ہے۔
- نصیر الدین ہاشمی (دکن میں اردو)، محی الدین قادری زور (دکنی ادب کی تاریخ) اور جمیل جالبی (تاریخ ادب اردو جلد اول) کے مطابق پھول بن کا سن تصنیف 1066ھ مطابق 1655ء ہے۔
- عبدالقادر سروری کے مطابق 1076ھ ہے۔
- سید احمد خاں ہنر نے پھول بن کے جواب میں ''نیہ درپن'' لکھی تھی۔
- پھول بن میں قصے سے قصے پیدا کرنے والی داستانی روایت ملتی ہے۔
- مثنوی پھول بن میں انتالیس (39) صنعتیں استعمال کی گئی ہیں۔
- پھول بن کے قصے اپنی ترتیب کے لحاظ سے ''الف لیلہ'' سے زیادہ مشابہ ہیں۔
- مثنوی پھول بن میں عموماً ایک قصہ دوسرے قصے کے اختتام کے بعد شروع ہوتا ہے۔

- مثنوی پھول بن قصہ در قصہ کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔
- فن قصہ در قصہ کے ادنی نمونے وہ ہوتے ہیں جن میں کسی بادشاہ یا امیر کے سامنے اس کا کوئی وزیر یا ندیم یا کوئی جہاں دیدہ شخص، یکے بعد دیگر چند قصے بیان کرتا ہے۔ جیسے پھول بن کے قصے۔
- پھول بن میں تین مرکزی بسیط قصوں کے علاوہ تین تعارفی قصے بھی ہیں جو ان قصوں کے لیے تعارف کا کام دیتے ہیں۔ یہ تمام قصے درویش کی شخصیت سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح مثنوی پھول بن میں تین مرکزی اور تین ضمنی قصے ہیں یعنی کل چھ قصے ہیں۔

مثنوی پھول بن کا خلاصہ

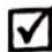
پھول بن کا اصل قصہ کنچن پٹن کے بادشاہ کا ہے، جو ایک درویش کو خواب میں دیکھتا ہے اور خادم کو بھیج کر اسے طلب کرتا ہے۔ کنچن پٹن مشرق میں ایک شہر تھا جو ندی کے کنارے اس طرح آباد تھا کہ ندی اس کے حصار کی خندق معلوم ہوتی تھی۔ شہر کنچن پٹن کی ہر چیز کنچن یعنی سونے کی تھی۔ شہر کنچن پٹن کی ہوا کی یہ تاثیر تھی کہ سدا نشو و نما کا ہنگامہ رہتا تھا۔ اگر کوئی سوکھی لکڑی لاکر گاڑتا تو وہ سبز ہو جاتی اور اس میں شاخیں نکلنے لگتیں۔ جس درویش کو بادشاہ نے خواب میں دیکھا تھا اس کے جسم پر سفید سا پیرہن تھا اور ایک باریک سیلے سے کمر بندھی ہوئی تھی۔ سر پر شملہ کے عوض دستار اور ہاتھ میں ایک رنگین طرحدار عصا تھا۔ وہ ہاتھ میں مصلٰی لیے ہوئے تھا۔ کنچن پٹن کے بادشاہ کا قصہ بذات خود کوئی بسیط اور طویل قصہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے قصوں کے تعارف کا کام دیتا ہے۔ درویش سے قصہ گوئی کا کام لیا گیا ہے۔ وہی درویش کنچن پٹن کے بادشاہ کو اپنے باپ ملک خراسان کے پردھان سے کشمیر کے بادشاہ اور گل و بلبل کی سنی ہوئی حکایت کو سناتا ہے۔ کشمیر کے بادشاہ کی بارگاہ میں باغباں ایک ایسا گل لاتا ہے جس پر ایک کالا بلبل عاشق رہتا ہے۔ کشمیر کے بادشاہ کے استفسار پر بلبل اپنا اور گل کا قصہ سناتا ہے کہ وہ ختن کے سوداگر کا بیٹا ہے اور گل گجرات کے عابد و زاہد پارسا کی بیٹی ہے جس پر بلبل فریفتہ ہے۔ زاہد پارسا کی بد دعا سے یہ دونوں گل و بلبل بن گئے ہیں۔ کشمیر کا بادشاہ گل و بلبل کو انگوٹھی اور آیۃ الکرسی کی مدد سے واپس انسانی شکل میں لاتا ہے۔ سوداگر کا بیٹا یعنی بلبل بھی کشمیر کے بادشاہ کے سامنے ایک قصہ بیان کرتا ہے کہ کسی بادشاہ کے سامنے چین کے نقاش کے وارد ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چین کا نام سنتے ہی بادشاہ غم زدہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک وزیر بادشاہ کا غم دور کرنے کے لیے نقل روح کا قصہ بیان کرتا ہے کہ ایک راجا جو جوگیوں کا معتقد تھا اسے ایک جوگی نقل روح کا منتر سکھا دیتا ہے۔ اس کا مکار وزیر بھی راجا سے نقل کا منتر سیکھ لیتا ہے۔ وزیر مکاری سے نقل روح کے ذریعہ راجا بن بیٹھتا ہے۔ اور رانی ستونتی کی عفت و عصمت سے کھیلنا چاہتا ہے۔ رانی ستونتی پاک دامنی میں مشہور تھی۔ راجا جو پہلے ہرنی پھر طوطا

بن گیا تھا رانی ستونتی کی مدد سے وزیر کو قمری بنوا کر مار دیتا ہے اور پھر راجا بن جاتا ہے۔اسی غم زدہ بادشاہ یعنی کشمیر کے بادشاہ کے سامنے ایک اور وزیر ملک عجم کے بادشاہ کی بیٹی سمن بر اور مصر کا شہزادہ ہمایوں فال کی داستانِ محبت بیان کرتا ہے جو پھول بن کا اہم ترین قصہ ہے۔ ہمایوں فال سمن بر کو گھر سے بھگا لاتا ہے اور دونوں شہر سند میں جو اصل ہند تھا گنگا کے کنارے ایک محل ''بیت العاشقین'' میں قیام پذیر ہوتے ہیں۔شہر سند کا بادشاہ ایک مالنی کے ذریعہ سمن بر کے حسن کی تعریف سن کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور ہمایوں فال کو شطرنج میں ہرا کر دھوکے سے اسے مچھلی کی خوراک بنا دیتا ہے۔طلسم لکھے ہوئے مچھلی کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ ہمایوں کو مچھلی سمن کے جزیرہ پر جا کر اگل آئی ہے اور وہ پریوں کی قید میں ہے۔سمن بر شہزادہ ہمایوں فال کی تلاش میں جوگن بن کر گلے میں کنٹھال ڈال کر نکلتی ہے اور ایک جزیرے تک پہنچتی ہے۔سمن بر پرستان کی رانی ملک آراء کی مدد سے اپنے عاشق ہمایوں فال سے پھر مل جاتی ہے۔

کرداروں کی پہچان

* کنچن پٹن کا بادشاہ: جو خواب میں ایک درویش کو دیکھتا ہے۔
* درویش — ملک خراسان کے پردھان کا بیٹا ہے۔
* کشمیر کا بادشاہ — جس کی بارگاہ میں ایسا گل لایا جاتا ہے جس پر کالا بلبل عاشق ہو جاتا ہے۔
* بلبل — ختن کے سوداگر کا بیٹا ہے۔ * گل: گجرات کے عابد زاہد کی بیٹی ہے۔
* جوگی — جو بادشاہ کو نقل روح کا منتر سکھاتا ہے۔ *رانی ستونتی: جو پاکدامنی میں مشہور تھی۔
* سمن بر — ملک عجم کے بادشاہ کی بیٹی ہے اور ہمایوں فال کی محبوبہ ہے۔
* ہمایوں فال — مصر کا شہزادہ ہے اور سمن بر کا عاشق۔
* ملک آرا — پرستان کی رانی ہے۔ * دیدبانو: جو کہ پری ہے ملک آرا کی خادمہ ہے۔

- مثنوی پھول بن میں جوگیوں کے معتقد بادشاہ کا وزیر ایک کردار ہے، جو بدمعاش Villan کی سیرت کی نمائندگی کرتا ہے۔
- اس کے مقابلے میں رانی ستونتی کا نیکی کا کردار ہے، جس کی عفت، پاکدامنی اور فراست کو مثالی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔
- ہمایوں فال اور سمن بر کے قصے میں ملک سند کے ناعاقبت اندیش بادشاہ اور اس کے مکار ذلیل وزیر کے کردار کے درمیان سمن بر غیر شعوری طور پر ایک حد تک زندہ کردار بن گئی ہے جس کی حیات محبت، وفا شعاری اور پاکدامنی کا سبق دیتی ہے۔



افضل جھنجھانوی اور بکٹ کہانی

- بکٹ کہانی محمد افضل، افضلؔ کا لکھا ہوا 'بارہ ماسہ' ہے جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔
- یاد رہے کہ بکٹ کہانی کو بارہ ماسہ بھی کہتے ہیں۔
- بارہ ماسہ ایک ہندی صنف سخن ہے جس میں ایک ایسی فراق زدہ ہندو عورت کے جذبات اسی کی زبان میں پیش کیے جاتے ہیں جس کا شوہر اسے چھوڑ کر کہیں باہر چلا گیا ہے اور وہ اس کے فراق میں تڑپتی ہے۔ سال کے ہر مہینے میں وہ اپنی تڑپ طرح طرح سے اپنی زمانی بولی میں ظاہر کرتی ہے۔
- عموماً یہ بارہ ماسے اساڑھ یا ساون کے مہینے سے شروع ہوتے ہیں۔
- 'بکٹ کہانی' کا صحیح سال تصنیف معلوم نہیں، لیکن افضل نے 1035ھ مطابق 26-1625ء جو اس کا سال وفات ہے سے قبل اسے مکمل کر لیا تھا یعنی بکٹ کہانی سترہویں صدی کی تصنیف ہے۔
- افضل کی بکٹ کہانی کے سلسلے میں پہلا مستند اشارہ اکرم رہتکی قطبی کے 'تیرہ ماسہ' میں ملتا ہے۔
- بکٹ کہانی میں کل 321 اشعار ہیں۔
- مسعود حسین خاں نے 325 بکٹ کہانی کے کل اشعار بتائے ہیں جو بکٹ کہانی کے اشعار کے شمار کرنے پر غلط ثابت ہوتے ہیں۔
- بکٹ کہانی شمالی ہند کی باضابطہ پہلی مثنوی تسلیم کی جاتی ہے۔
- افضل کی بکٹ کہانی شمالی ہند کی اردو شاعری کے لسانی تناظر کو نشان زد کرتی ہے۔
- بکٹ کہانی میں جو راوی ہے وہ ایک فراق زدہ عورت ہے جو اپنی سکھیوں سے اپنے دکھڑے کا بیان کرتی ہے۔
- بکٹ کہانی میں ہندوستانی تیوہاروں کا ذکر جا بہ جا ملتا ہے۔ افضل نے تیوہاروں کا ذکر مہینوں کی مناسبت سے کیا ہے۔
- بکٹ کہانی بھی زبان کی بنیاد کھڑی بولی پر قائم ہے لیکن اس میں برج بھاشا، اودھی اور پنجابی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔
- بکٹ کہانی 'بارہ ماسہ' میں ایک برہمنی یا فراق کی ماری عورتوں کو ساون کے مہینے سے لے کر آخر سال تک اپنے شوہر کی یاد میں تڑپتے دکھایا گیا ہے۔ ہر مہینے میں موسم کے اعتبار سے جو طبعی تبدیلیاں ہوتی ہیں یا جو تہوار سال کے مختلف مہینوں میں منائے جاتے ہیں ان سب کو پس منظر

میں پیش کرتے ہوئے شاعر نے اس میں برہمنی کے جذبات اور فراق کی شدت کو مختلف طریقوں سے ظاہر کیا ہے۔ بارہویں مہینے یعنی اساڑھ میں برہمنی کا ساجن پردیس سے واپس آجاتا ہے اور فراق مبدل بہ وصال ہو جاتا ہے۔

- بکٹ کہانی کو نورالحسن ہاشمی اور مسعود حسین خاں نے مل کر ترتیب دیا ہے۔
- بکٹ کہانی کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

سنو سکھیو! بکٹ میری کہانی — بھئی سوں عشق کے نجم سوں دِوانی
نہ مجھ کوں بھوک دن، نا نیند راتا — بِرَہ کے درد سوں سینہ پراتا
تمامی لوک مجھ بَوری کہی ری — خرد گم کردہ، مجنوں ہو رہی ری

- بکٹ کہانی کا آخری شعر یہ ہے:

بہ یادِ دل ربا خوش حال می باش — گہے افضل گہے گوپال می باش

- بکٹ کہانی میں افضل نے تمہیدی اشعار کے بعد بارہ مہینوں کے حالات و جذبات کو بارہ عنوانات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان بارہ مہینوں کے عنوانات اور باب کے ابتدائی دو دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔

ہر باب کے ابتدائی دو دو اشعار

- در بیانِ ماہ اوّل: ساون

رسیدہ برسر ہنگام برسات — سجن پردیس میں ہیہات! ہیہات!
چڑھا ساون بجا مار و نقارہ — سجن بن کون ہے ساتھی ہمارا

- در بیانِ ماہ دوم: بھادوں

سکھی! بھادوں نیٹ تپتی پڑے ری — تمامی تن بدن میرا جری ری
سیہ بادر چہاروں اُور چھائے — لیا مجھ گھیر پیوا جھوں نہ آئے

- در بیانِ ماہ سوم: کنوار

سنو سکھیو! کہرت آسوج آئی — پیارے کی خبر اب لگ نہ پائی
کہو کیسے جیویں پیو باج ناری — جنھیں رووت گئی ہے عمر ساری

- در بیانِ ماہ چہارم: کاتک

گیا آسوج کاتک مانس آیا — سلونے شیام کوں پردیس بھایا
گئی برسات رت، نکھرا فلک سب — نمی دانم کہ ساجن گھر پھریں کب

- **دربیان پنجم: اگھن**

سکھی! اگھن سیہ رو مانس آیا — سجن آئے نہ کاگد لکھ پٹھایا
بھیا موسم جنک، سردی بھئی رے — اجھوں لگ غم اگن تن مفتوح رہی رے

- **دربیان ماہ ششم: پوس**

اگھن دکھ دے گیا اب پوس آیا — پیا کی چاہ نے غلبہ اٹھایا
پڑے پالا کرے تھر تھر مری دیہہ — سکھی! کس بدگھڑی لاگا مرا نیہ

- **دربیان ماہ ہفتم: ماگھ**

گیا پوس اے سکھی اب ماہ آیا — پیا نے جائے کر پر دیس چھایا
فراق اب ماہ نے مجھ کو دیا ہے — پیا نے نہیں اجھوں پھیرا کیا ہے

- **مدربیان ماہ ہشتم: پھاگن**

گیا جب ماگھ پھاگن مانس آیا — سکھی! ہے ہے پیا اس رت نہ آیا
جو آیا ماہ پھاگن کیا کروں ری — سجن پردیس، میں نت دکھ بھروں ری

- **دربیان ماہ نہم: چیت**

سکھی ری، چیت رت آئی سو آئی — اجھوں امید میری برنہ آئی
بہ عالم پھولیاں پھلواریاں سب — کریں سیراں پیا سنگ ناریاں سب

- **دربیان ماہ دہم: بیساکھ**

سنو سکھیو! کہ اب بیساکھ آیا — کویل نے انبہ پر چڑھ شور لایا
سنی آواز کویل اور پپیہا — رہے دن رین کیوں کر میرا جیا

- **دربیان یازدہم: جیٹھ**

لگا یہ جیٹھ اب دھوپاں پڑیں ری — ہمن حیراں و سرگرداں پھریں ری
ہمن اک آگ غم کی میں جلت ہیں — علاوہ دوسرے نو، واں چلت ہیں

- **دربیان ماہ دوازدہم: اساڑھ**

سنو اساڑھ ماس آیا سکھی ری — کرم میرے نہ جانوں کیا لکھی ری
سنو دن رین کی میری کہانی — کمر کو توڑ کر بیٹھی نمانی

بکٹ کہانی کے بارے میں مختلف آراو خیالات

- مسعود حسین خاں نے شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا مستند نمونہ بکٹ کہانی کو قرار دیا ہے۔

- اسلوب شعر کے نقطۂ نظر سے بکٹ کہانی اس عہد کی ریختہ گوئی کا مکمل نقش ہے۔ (مسعود حسین خاں)
- لسانی نقطۂ نظر سے سترہویں صدی کے اواخر کی سب سے اہم تصنیف محمد افضل افضلؔ کی بکٹ کہانی ہے۔ (مسعود حسین خیان)
- یہ (بکٹ کہانی) بارہ ماسہ شمالی ہند کی اردو کا پہلا مربوط اور مسلسل کارنامہ ہے۔ جس میں بارہ ماسے کی ہندوستانی روایت اور خسرو کی ریختہ گوئی کے تجربے دونوں کی آمیزش ملتی ہے۔ (مسعود حسین خان)
- افضل کی بکٹ کہانی اس جدید اردو کا پہلا ادبی ولسانی نقش ہے۔ (مسعود حسین خان)
- بکٹ کہانی کی زبان عہد اکبری کی کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جو دہلی اور اس کے نواح سے نکل کر برج، اودھی اور ہریانوی کے علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ (مسعود حسین خان)
- اس (بکٹ کہانی) کی زبان دکنی سے مختلف اور صاف ہے۔ (محمود شیرانی، پنجاب میں اردو)
- بکٹ کہانی ہندی شاعری کی روایت کے عین مطابق لکھی گئی ہے۔ جس میں اظہارِ عشق اور تخاطب عورت کی جانب سے ہوتا ہے اور مرد کی حیثیت بت خاموش کی سی ہوتی ہے۔ (خلیل احمد بیگ)



میر حسن

(1199ھ مطابق 85-1784ء)

- نام میر غلام حسن تھا اور تخلص حسن۔
- میر حسن 1737ء میں دہلی کے محلّہ سید واڑہ میں پیدا ہوئے۔
- میر حسن کا انتقال لکھنو میں 1786ء میں ہوا اور محلّہ مفتی گنج لکھنؤ ہی میں قاسم علی خاں کے باغ کے پیچھے دفن کیے گئے۔
- میر حسن کے والد کا نام میر غلام حسین تھا اور تخلص ضاحکؔ جو اپنے دور کے مشہور و معروف ہجو گو شاعر تھے۔
- میر حسن کے اجداد شاہجہاں کے زمانے میں ہرات سے آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے۔ (ان کے جد اعلیٰ کا نام میر امام ہروی تھا)۔
- میر حسن میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد تھے۔ سودا سے بھی اصلاح لی۔
- میر حسن اپنے والد غلام حسین ضاحک کے ساتھ فیض آباد آئے تھے اور پھر آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آئے۔
- میر حسن کی ساری زندگی غربت میں گذری تھی۔ حسینوں کی طرف خاص رغبت تھی۔
- مصحفی نے میر حسن کی تاریخ وفات ''شاعر شریں بیان'' سے نکالی ہے۔

1786ء

میر حسن کے کارنامے

- میر حسن نے اردو کا ایک تذکرہ بعنوان تذکرہ شعرائے اردو اور ایک دیوان چھوڑا ہے۔

مثنویاں:

- میر حسن نے چھوٹی بڑی بارہ مثنویاں لکھی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

(1) نقل کلاونت (2) نقل زن فاحشہ (3) ہجو قصائی (4) نقل قصائی

(5) مثنوی شادی آصف الدولہ 1183ھ۔1769ء

(6) مثنوی رموز العارفین 1188ھ۔1774ء

(7) مثنوی ہجو حویلی 1189ھ۔1190ھ۔76-1775ء

(8) مثنوی گلزار ارم 1192ھ۔1778

(9) مثنوی در تہنیت عید 1199ھ۔ 85-1784ء

(10) مثنوی در وصف کشف جوہر 1199ھ۔ 85-1784ء

(11) مثنوی در خوان نعمت 1199ھ۔ 85-1784ء

(12) مثنوی سحرالبیان 1199ھ۔ 85-1784ء

قصائد:

- میر حسن نے کل سات قصیدے لکھے ہیں۔
- جن میں سے ایک قصیدہ حضرت علی اور ایک حضرت امام حسین کی منقبت میں ہے۔
- دو قصیدے نواب آصف الدولہ کی مدح میں ہیں۔
- ایک ایک قصیدہ سالار جنگ جواہر علی خاں اور آفریں علی خاں کی تعریف میں ہے۔

مثنوی سحرالبیان

- میر حسن نے مثنوی سحرالبیان بمعنی (بیان کا جادو) 1199ھ۔ مطابق 85-1784ء میں آصف الدولہ کے عہد میں لکھی۔
- مثنوی کے آخر میں قطعاتِ تاریخ ہیں جن میں سے آخری قطعہ ہے:

سنی جب کہ ماہر نے یہ مثنوی   تو محظوظ ہو، فکرِ تاریک کی
یہ مصرع پڑھا وہیں پاکر فرح   ''ہے اس مثنوی کی یہ نادر طرح''

1199ھ

- مثنوی سحرالبیان بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف یعنی فعولن فعولن فعولن فعول میں ہے۔
- مثنوی سحرالبیان میر حسن کی آخری اور طبع زاد مثنوی ہے۔
- مثنوی سحرالبیان گل کرسٹ کی فرمائش پر میر شیر علی کے مقدمہ کے ساتھ 1805ء میں ہندوستانی پریس کلکتہ سے چھپی (یہ کام فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ہوا)
- مثنوی سحرالبیان کو رشید حسن خاں نے مرتب کیا ہے۔
- سحرالبیان کو مثنوی میر حسن، مثنوی بدر منیر، قصۂ بدر منیر و شاہزادہ بے نظیر وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔
- سحرالبیان میں شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عشق کی داستان بیان ہوئی ہے۔
- مثنوی سحرالبیان کے دیباچے میں میر شیر علی افسوس نے اسے اسم با مسمّیٰ مثنوی کہا ہے۔
- مثنوی سحرالبیان میں اس عہد کی تصویر کشی اور معاشرت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

- مثنوی سحر البیان لکھ کر میر حسن نے ایک قصیدہ کے ساتھ آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے بدلے ایک دوشالے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا تھا۔
- محمد حسین آزاد نے سحر البیان کے متعلق لکھا ہے کہ:

"زمانے نے اس کی سحر بیانی پر تمام شعرا اور تذکرہ نویسوں سے محضر شہادت لکھوایا۔"

- میر حسن نے سحر البیان کی ادبی حیثیت متعین کرنے میں مرزا قتیل کی فارسی تاریخ کا حوالہ دیا ہے۔
- گلزار نسیم کے برخلاف سحر البیان میں جزئیات نگاری زیادہ ہے۔
- سحر البیان کا دیباچہ شیر علی افسوس نے لکھا ہے۔
- محمد حسین آزاد نے سحر البیان کے لیے کہا تھا کہ اس مثنوی کی زبان سو سال بعد کے انسانوں کی زبان کے مشابہ ہے۔

سحر البیان کا خلاصہ

کسی شہر میں کوئی بادشاہ تھا۔ اسے ہر طرح کا عیش حاصل تھا۔ مگر وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں اس نے دنیا ترک کرنے کی ٹھانی۔ نجومیوں اور جوتشیوں کو بلا کر مشورہ کیا، انہوں نے اس کے یہاں اولاد ہونے کی پیشین گوئی کی اور یہ بھی بتلایا کہ بچہ پیدائش کے بارہویں سال آفات و مشکلات سے دوچار ہوگا۔ گولڑکے کی جان کو کوئی خطرہ نہیں مگر کوئی پری اس پر عاشق ہوگی اور اسے اڑا لے جائے گی۔ نجومیوں کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اور بادشاہ کے یہاں ایک خوبصورت بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام بے نظیر رکھا گیا۔ سارے ملک میں خوشیاں منائی گئیں۔ چوتھے برس دودھ چھڑا کر ایک نہایت خوش نما باغ میں اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا گیا۔ سوءِ قسمت نجومیوں کی کہی ہوئی تاریخ یاد نہ رہی۔ بادشاہ نے اس خیال سے کہ بارہ سال بیت گئے شہزادہ کو محل بلوالیا اور محل کے بالا خانے میں رات گزارنے کا اہتمام کیا۔ حسن اتفاق سے یہ رات بارہویں برس میں شامل تھی چنانچہ نجومیوں کے کہنے کے مطابق ماہ رخ نامی پری کا ادھر سے گزر ہوا شہزادہ کو دیکھ کر اس پر عاشق ہوگئی اور اسے اڑا کر پرستان لے گئی۔ محل میں شہزادے کے جانے سے کہرام مچ گیا۔

ادھر ماہ رخ پری نے شہزادے کے آرام و آسائش اور اس کے دل بہلانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن شہزادہ کسی طور اس سے مانوس نہ ہوسکا۔ آخر کار ماہ رخ پری نے شہزادہ پر ترس کھا کر اسے 'کل' کا گھوڑا دیا اور سیر و سیاحت کی اجازت دے دی۔ شہزادہ اس کل کے گھوڑے پر سوار ہو کر صبح شام تفریح کے لیے نکل جایا کرتا۔ ایک دن اتفاق سے شہزادے کا گزر شہزادی بدر منیر کے محل کے قریب سے ہوا۔ شہزادہ اس کے باغ میں اتر پڑا جہاں بدر منیر بھی موجود تھی۔ بے نظیر اور بدر منیر دونوں ایک دوسرے

کو دیکھ کر ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ اور ماہ رخ پری کے غیاب میں آپس میں ملنے جلنے لگے۔ اور جب ماہ رخ کو ان ملاقاتوں کی خبر ایک دیو کے ذریعے ہوئی تو وہ بہت برہم ہوئی۔ اس نے مارے غصے کے شہزادہ بے نظیر کو کوہ قاف کے راستے میں پڑنے والے کنواں (چاہ الم) میں قید کر دیا۔ شہزادے کے حال سے بے خبر بدر منیر اس کے فراق میں بے چین رہنے لگی، سوتے جاگتے اسے شہزادے کی صحبتوں کا خیال رہتا۔ اسی دوران اس نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ شہزادہ ایک کنویں میں قید ہے۔ وہ سخت بے قرار ہوگئی۔ اس نے اپنا خواب اپنی سہیلی وزیر زادی نجم النسا کو سنایا۔ نجم النسا کو بدر منیر پر رحم آیا اور وہ جوگن بن کر بے نظیر کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی۔ راستے میں جنوں کے بادشاہ کے بیٹے فیروز شاہ سے ملاقات ہوئی۔ فیروز شاہ نجم النسا کے حسن پر فریفتہ ہوگیا۔ لیکن نجم النسا نے صرف اس شرط کے ساتھ اس سے ملنے کا وعدہ کیا کہ وہ شہزادہ بے نظیر کو ڈھونڈ نکالنے میں اس کی مدد کرے۔ فیروز شاہ نے جنوں کو بلا کر بے نظیر کی کھوج پر معمور کیا۔ اور ایک سکندر نژاد دیو نے کنوے سے بے نظیر کو نکالا اس طرح فیروز شاہ کی مدد سے ماہ رخ پری کی قید سے بے نظیر آزاد ہوگیا۔ فیروز شاہ اور نجم النسا دونوں بے نظیر کو لے کر بدر منیر کے محل میں آئے۔ بدر منیر کا باپ مسعود شاہ کو بے نظیر کی شادی کا پیغام دیا۔ بدر منیر اور بے نظیر کی شادی ہوگئی۔ چوتھی کے دن نجم النسا اور فیروز شاہ کی بھی شادی ہوگئی۔ شہزادہ بے نظیر بدر منیر کو لے کر اپنے ملک واپس ہوا اور نجم النسا فیروز شاہ کے ساتھ پرستان چلی گئی۔

کرداروں کی پہچان

* مثنوی میں بہت سے کردار ہیں مگر ان میں سے چھ بہت اہم ہیں۔
* "شہزادہ بے نظیر" ملک شاہ کا لڑکا اور اس قصے کا ہیرو ہے۔
* "شہزادی بدر منیر" اس قصے کی ہیروئن ہے جو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کا بھی ذوق رکھتی ہے۔
* وزیر زادی نجم النسا بدر منیر کی سہیلی ہے جو ایک ذہین عورت ہے۔ ہر مشکل میں تدابیر پیش کرتی ہے۔ نجم النسا کا کردار تمام کرداروں میں زیادہ فعال، جاندار اور دل کش ہے۔
* ماہ رخ پری جو شہزادہ بے نظیر کے عشق میں گرفتار رہتی ہے اور وہی شہزادے کو کنویں میں قید کراتی ہے۔
* فروز شاہ: جو جنوں کے بادشاہ کا بیٹا ہے وہ اس وقت نجم النسا پر عاشق ہو جاتا ہے جب وہ جوگن کے بھیس میں بے نظیر کی تلاش میں نکلتی ہے۔
* مسعود شاہ بدر منیر کا باپ ہے۔



پنڈت دیا شنکر نسیم

(1845-1811)

- نام پنڈت دیا شنکر کول تھا اور تخلص نسیم
- والد کا نام گنگا پرشاد کول تھا۔
- نسیم کا خاندان کشمیر سے آ کر لکھنؤ میں آباد ہوا تھا۔
- نسیم لکھنؤ میں 1811ء میں پیدا ہوئے۔
- رشید حسن خاں کے مطابق 34/برس کی عمر میں 1845ء میں نسیم کا انتقال ہوا۔ (مقدمہ گلزار نسیم ص:11) میرے خیال سے بھی یہی درست ہے جبکہ نور الحسن نقوی کے مطابق 32/سال کی عمر میں 1843ء میں نسیم کا انتقال ہوا۔ (تاریخ ادب اردو: ص133)
- دیا شنکر نسیم نے امجد علی شاہ کے عہد میں ہوش سنبھالا تھا۔
- نسیم نے بیس سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور خواجہ حیدر علی آتش کی شاگردی اختیار کی۔
- نسیم کی غزلوں میں استاد کا رنگ جھلکتا ہے۔
- دنیا کی بے ثباتی اور خودداری نسیم کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔
- زبان کا لطف، محاورے کی صحت کا خیال، صنائع کے استعمال کا شوق نسیم کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔
- نسیم کا تعلق دبستان لکھنو سے ہے۔

لائے اس بت کا التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے   (نسیم)

گلزار نسیم

(1254ھ مطابق 1839ء)

- مثنوی گلزار نسیم پنڈت دیا شنکر نسیم کی لکھی ہوئی ایک عشقیہ مثنوی ہے جو لکھنوی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔
- مثنوی گلزار نسیم کی کہانی ''قصہ گل بکاؤلی'' کے نام سے مشہور ہے۔
- مثنوی گلزار نسیم میں گل بکاؤلی کی مشہور داستان عشق بیان ہوئی ہے۔
- اصل قصہ عزت اللہ بنگالی نے 1134ھ مطابق 1722ء میں قصہ بکاؤلی کے نام سے لکھا جو فارسی

نثر میں ہے۔

- منشی نہال چند لاہوری نے 1803ء میں گل کرسٹ کی فرمائش پر ''مذہب عشق'' کے نام سے اسے اردو میں منتقل کیا۔
- پنڈت دیاشنکر نسیم نے 1254ھ مطابق 1839-1838ء میں اردو نظم کا لباس پہنا کر مثنوی گلزار نسیم کے روپ میں پیش کیا۔
- مثنوی گلزار نسیم پہلی بار 1844 میں شائع ہوئی تھی۔
- پنڈت دیاشنکر نسیم نے 28 سال کی عمر میں یہ مثنوی مکمل کی۔
- نسیم نے جب یہ مثنوی پہلی بار لکھی تو بہت طویل تھی۔ استاد یعنی آتش کے کہنے پر اس میں سے بے جا طوالت کم کی۔
- مثنوی گلزار نسیم کو رشید حسن خاں نے مرتب کیا ہے۔
- مثنوی گلزار نسیم میں زبان و بیان کا وہی رنگ پایا جاتا ہے جو فسانہ عجائب میں موجود ہے یعنی صنائع و بدائع، تشبیہات و استعارات، مشکل و ثقیل بندش اور رعایتوں کا استعمال۔
- مثنوی گلزار نسیم میں آورد کا انداز پایا جاتا ہے۔
- مثنوی گلزار نسیم میں رعایت لفظی کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔
- مثنوی گلزار نسیم کی بڑی خصوصیت اس کا اختصار ہے۔
- مثنوی گلزار نسیم بحر ہزج مسدس اخرب مقبوض مقصور یا محذوف میں ہے یعنی مفعولن مفاعلن فعولن۔
- 1905ء میں مثنوی گلزار نسیم کو چکبست نے ایک مقدمے کے ساتھ شائع کیا تھا جو ایڈیشن معرکہ چکبست و شرر کی بنیاد بنا۔
- مثنوی گلزار نسیم میں دیگر مثنویوں کے مقابلے میں مافوق الفطرت عناصر کی کثرت ہے۔
- پوری مثنوی میں پریاں اڑتی ہیں اور دیو اپنی کرامات دکھاتے ہیں۔
- مثنوی گلزار نسیم کا مقابلہ اکثر میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے کیا جاتا ہے۔
- رشید احمد صدیقی نے اس مثنوی کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''شعر و شاعری کے جن پہلوؤں کے اعتبار سے لکھنؤ بدنام ہے۔ گلزار نسیم نے انہی پہلوؤں سے لکھنؤ کا نام اونچا کیا ہے۔ زبان کو شاعری اور شاعری کو زبان بنا دینا کوئی آسان کام نہیں۔''

- پروفیسر احتشام حسین نے مثنوی گلزار نسیم کو شاعرانہ اور فن کارانہ تخلیق کا معجزہ کہا ہے۔

☜ تاریخ اختتام تصنیف از مصنف

این نامہ کہ خامہ کرد بنیاد — گلزار نسیم نام بنہاد
پشنید و نوید ہا تفے داد — توقیع قبول روزیش باد

1254ھ

مثنوی 'گلزارِ نسیم' کا خلاصہ

پورب کا بادشاہ سلطان زین الملوک کے پانچواں بیٹا ہونے پر نجومیوں نے پیشین گوئی کی کہ اگر سلطان کی نظر اس پر پڑے گی تو اندھا ہو جائے گا۔ چند برس بعد ایک دن اتفاقاً باپ بیٹے کا سامنا ہوگیا۔ باپ کی آنکھیں جاتی رہیں۔ ایک معالج نے بتایا کہ گلزار ارم میں بکاؤلی کا پھول ہے، وہ اگر آنکھوں کو لگایا جائے تو بینائی عود کر آئے گی۔ چاروں شہزادے گل بکاؤلی کی تلاش کو نکلے اور پہلی ہی منزل پر دلبر بیسوا سے چوسر کا کھیل ہار گئے اور اس نے انھیں قید میں ڈال دیا۔ پانچویں بیٹے یعنی تاج الملوک نے دلبر بیسوا کو مات دی اور دوسری منزل پر ایک دیو سے مقابلہ کر کے اسے بھی رام کیا۔ دیو کی بہن حمالہ دیونی مددگار ثابت ہوئی۔ اس کی بنائی ہوئی سرنگ کے ذریعے تاج الملوک گلزار ارم میں پہنچا اور گل بکاؤلی توڑ لانے میں کامیاب ہوگیا۔ وطن کو لوٹتے ہوئے تاج الملوک کی بڑے بھائیوں سے مٹھ بھیڑ ہوئی تو انھوں نے دھوکے اور فریب سے بکاؤلی کا پھول تاج الملوک سے چھین لیا۔ پھول سلطان کی آنکھوں کو لگایا گیا، جس سے اس کی کھوئی ہوئی بینائی واپس آ گئی۔ ادھر جب بکاؤلی نے گلزار ارم سے اپنے پھول کو غائب پایا تو بہت سٹ پٹائی۔ چور کی تلاش میں وہ سراغ لگاتے لگاتے سلطان کے دربار تک پہنچی اور مرد کی صورت اختیار کر کے اس کی وزیر بن گئی۔ پھول ہاتھ سے نکل جانے کے بعد تاج الملوک شہر کے قریب جادو کے زور سے گلشن نگاریں بنا کے رہنے لگا لیکن یہ راز زیادہ مدت تک پوشیدہ نہ رہا۔ بکاؤلی کو بھی پتا چل گیا کہ اصل چور تاج الملوک ہے۔ وہ اس کی شجاعت، دلیری اور مردانگی کی قائل تو تھی ہی، پہلی ملاقات میں دل ہار گئی۔ عشق کی ابتدا ہوئی اور وہ دونوں ساتھ ساتھ گلزار ارم میں دادِ عیش دینے لگے۔ بکاؤلی کی ماں جمیلہ پری کو یہ احوال معلوم ہوا تو اس نے بکاؤلی کو قید کر دیا اور تاج الملوک کو طلسم کے جنگل میں پھنکوا دیا۔ تاج الملوک نے تمام آفات کا نہایت ہمت اور جرأت سے مقابلہ کیا اور طلسم سے رہائی حاصل کی۔ آخر بکاؤلی سے اس کا بیاہ ہوا اور دونوں گلشن نگاریں میں آ کر مزے میں زندگی بسر کرنے لگے۔ درحقیقت بکاؤلی اندر لوک کی پری تھی۔ وہ ہر رات اڑ کر اندر لوک پہنچتی اور صبح تاج الملوک کی آنکھ کھلنے سے پہلے واپس آ جاتی۔ ایک رات تاج الملوک تاڑ گیا اور پکھاوجی بن کے بکاؤلی

کے ہمراہ اندرلوک پہنچا۔ بکاؤلی نے اس رات اتنا عمدہ رقص کیا کہ راجا اندر نے بے اختیار اس کی منہ مانگی مراد پوری کرنے کا وعدہ کرلیا۔ بکاؤلی نے تاج الملوک کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی اجازت چاہی، مگر اسے سنتے ہی راجا کے غیظ وغضب کی انتہا نہ رہی اور بکاؤلی کو نصف پتھر کی بنا کر ایک مٹھ میں قید کر دیا۔ کچھ مدت بعد راجہ چترسین کی بیٹی چتراوت بھی تاج الملوک پر عاشق ہوگئی۔ اسے تاج الملوک کا روز روز مٹھ جانا اور بکاؤلی سے باتیں کرنا شاق گزرا۔ اس نے وہ مٹھ ہی کھدوا ڈالا۔ مٹھ کے انہدام کے بعد اس زمین میں سرسوں پیدا ہوئی جس کے تیل سے ایک دہقان کی بیوی کے حمل رہ گیا اور بکاؤلی نے نیا جنم پایا۔ دہقان کے گھر جوان ہوکر بکاؤلی پھر تاج الملوک سے ملی اور دونوں کے دلوں کی مراد پوری ہوئی۔

کرداروں کی پہچان

* زین الملوک پورب کا بادشاہ تھا۔
* تاج الملوک جو کہ شہزادہ ہے زین الملوک کا سب سے چھوٹا اور پانچواں بیٹا تھا۔
* بکاؤلی جو کہ ہیروئن ہے اور پری ہے وہ شہزادے سے محبت کرتی ہے اور بکاؤلی ہی زین الملوک اور تاج الملوک سے ملاقات کے وقت فرخ نام سے وزیر بنتی ہے۔
* جمیلہ پری بکاؤلی کی ماں ہے۔
* فیروز بکاؤلی کا باپ ہے۔
* سمن پری بکاؤلی کی سہیلی ہے۔
* بہرام جو کہ تاج الملوک کا وزیر زادہ ہے وہ روح افزا پری پر عاشق ہے۔
* روح افزا جس پر بہرام عاشق ہے اور جو بکاؤلی کی سہیلی ہے۔
* حسن آرا روح افزا پری کی ماں ہے۔
* محمودہ حمالہ دیونی کی منہ بولی بیٹی ہے۔
* راجا اندر جس کی بددعا سے بکاؤلی نصف پتھر بن گئی تھی اور جس کے دربار کی رقاصہ بکاؤلی ہے۔
* حمالہ دیونی جس کے بنائے ہوئے سرنگ کی مدد سے شہزادہ تاج الملوک گلزار ارم پہنچا تا ہے۔
* دیگر کردار رانی چتراوت، چترسین، دلبر بیسوا وغیرہ۔



مرثیے کا فن

- مرثیہ عربی زبان کا لفظ ہے جو 'رثا' سے نکلا ہے۔
- رثا 'بین' یعنی آہ و بکا کو کہتے ہیں۔
- 'رثا' ان اشعار کو کہتے ہیں جن میں مرنے والوں کا ماتم کیا جائے۔
- مرثیہ اصطلاح میں بالعموم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کسی مرنے والے کی خوبیاں بیان کر کے اس کی موت پر افسوس کیا جائے اور بالخصوص مرثیے کا اطلاق اس نظم پر ہوتا ہے جس میں امام حسین کی شہادت یا اس سے متعلق کوئی واقعہ غم انگیز پیرائے میں بیان کیا جائے۔
- میر ضمیر نے مرثیے کی شکل اور اس کے اجزائے ترکیبی متعین کیے۔
- سودا نے پہلی بار مسدس کی ہیئت میں مرثیہ لکھا اور مرثیے کو مسدس کی ہیئت عطا کی۔
- مرثیے کے اجزائے ترکیبی 8 ہیں:

(1) چہرہ: مرثیے کا ابتدائی حصہ جس میں تمہید کے طور پر ایسے مضامین بیان کیے جائیں جن کا مرثیے کے ہیرو سے براہِ راست واسطہ نہ ہو۔

(2) سراپا: اس میں ہیرو کا ناک نقشہ، قد و قامت، شجاعت و نیک خوئی کا بیان ہوتا ہے۔

(3) رخصت: ہیرو کا میدان میں جنگ کرنے کی اجازت لینا اور عزیزوں سے رخصت ہونا۔

(4) آمد: ہیرو کا میدان جنگ میں آنا۔

(5) رجز: عرب کے آداب جنگ کے مطابق، ہیرو کا مقابل فوج کو فخریہ انداز مین اپنے آبا و اجداد کے نام اور کارناموں سے واقف کرانا اور اپنی بہادری و برتری کا اظہار کرنا۔

(6) جنگ: ہیرو کا کسی پہلوان سے دست بدست، کبھی فوج کے کبھی دستے سے ہیرو کا جنگ کرنا۔

(7) شہادت: ہیرو کا زخمی ہونا اور شہید ہونا (8) بین: ہیرو کی موت پر اظہار رنج و ملال

- مرثیے کو سودا نے تشبیب سے متعارف کرایا تھا جو آگے چل کر چہرہ سے منسوب ہوئی۔
- چہرے میں براعتِ استہلال کی صورت ملتی ہے۔
- میر انیس نے مرثیے کے بارے میں یہ مصرع کہا ہے ع

''لفظ مغلق نہ ہوں، گنجلک نہ ہوں، تعقید نہ ہو''

مرثیے کا آغاز وارتقا

- اردو میں مرثیہ نگاری کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی تھی۔
- اشرف بیابانی کو اردو کا پہلا مرثیہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے جنھوں نے 1503ء میں 'نوسرہار' لکھی تھی۔
- شمالی ہند کا پہلا مرثیہ نگار روشن علی (عاشورہ نامہ) کو قرار دیا جاتا ہے۔

دکن میں اردو مرثیے کا ارتقا

* اشرف بیابانی * شاہ برہان الدین جانم * نوری * حضرت شاہ راجو
* غواصی * وجہی * حسینی * سید شاہ ندیم اللہ ندیم
* محمد قلی قطب شاہ * عبداللہ قطب شاہ * شاہی * ہاشم علی برہانپوری
* درگاہ قلی خان * ناظم * غلام علی خان * لطیف
* محمد افضل افضل * برہان * مظفر * قاضی محمود بحری
* محمد صدیق * قیس حیدر

شمالی ہند میں اردو مرثیے کا ارتقا:

* روشن علی * فضل علی فضلی * عبداللہ مسکین * محب
* یکرنگ * سودا * میر * میر ضاحک
* میر حسن * شاہ محمد ہدایت اللہ * مہربان خان رند
* مرزا ظہور علی خلیق دہلوی * شاہ نور الحق تپاں عظیم آبادی
* قلندر بخش جرأت * غلام ہمدانی مصحفی * میر شیر علی افسوس * میاں سکندر

لکھنؤ میں مرثیہ نگاری کا پہلا دور:

* مرزا پناہ علی بیگ * افسردہ حیدر آبادی * گدا * احسان

لکھنؤ میں مرثیے کا دور تعمیر:

- انیسویں صدی کے آغاز کو مرثیے کا دور تعمیر کہا جاتا ہے۔

* چھنو لعل دلگیر * مرزا جعفر علی فصیح * میر مستحسن خلیق * میر مظفر حسین ضمیر
* انیس * دبیر

انیس کے بعد اردو مرثیہ:

* سلیس * نفیس * میر خورشید علی رئیس * سید علی محمد عارف
* میر عشق * تعشق * پیارے صاحب رشید * مرزا محمد جعفر علی اوج

جدید مرثیہ:

- جوش نے 'آوازِ حق' کے عنوان سے مرثیہ لکھ کر 1918ء میں جدید مرثیے کی داغ بیل ڈالی تھی۔
- لیکن جوش نے 'آل رضا' کو جدید مرثیے کا بانی قرار دیا ہے۔

* جوش (نو مراثی) * آل رضا (بیس مراثی) * جمیل مظہری
* نجم آفندی * وحید اختر * امید فاضلی



اردو کے اہم مرثیہ نگار اور ان کے مراثی

اردو کا ہومر

میر ببر علی انیس

(1802ء-1874ء)

- نام میر ببر علی تھا اور تخلص انیس، ابتدائی تخلص حزیں۔
- انیس فیض آباد میں 1217ھ مطابق 1802ء میں پیدا ہوئے۔ بعض لوگوں نے 1218ھ مطابق 1803 بھی لکھا ہے۔ (انیس صفحہ 11 از نیر مسعود)
- انیس کا انتقال 29 شوال مطابق 10 دسمبر 1874ء کو لکھنؤ میں ہوا۔
- انیس کے والد کا نام میر محمد مستحسن خلیق، دادا کا نام میر غلام حسن معروف بہ میر حسن صاحب سحر البیان اور پردادا کا نام میر غلام حسین ضاحک تھا جو اپنے دور کے مشہور ہجو گو شاعر تھے۔ انیس کے بڑے چچا احسن خلق صاحب دیوان غزل گو تھے۔
- غزل کی طرح مرثیے میں بھی انیس کے استاد خلیق تھے۔ انیس کے مرثیوں پر ان کی دو اصلاحیں ملتی ہیں۔
- انیس نے ابتدائی تعلیم اپنے والد خلیق سے حاصل کی تھی۔
- انیس نے عربی فارسی کی تعلیم میر نجف علی فیض آبادی اور مولوی حیدر علی لکھنوی سے حاصل کی تھی۔
- انیس فن سپہ گری اور شہ سواری سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔
- انیس کی شادی انیس برس کی عمر میں فاطمہ بیگم سے 1237ھ مطابق 1822 کے آس پاس ہوئی تھی۔
- میر انیس کے تین بیٹے میر نفیس، میر جلیس اور میر سلیس اور دو بیٹیاں تھیں۔
- انیس کو عمدہ کتابیں رکھنے اور پڑھنے اور کبوتر اور بلی پالنے کا شوق تھا۔
- انیس نے تیرہ سال کی عمر میں شعر گوئی شروع کی تھی۔
- انیس نے اپنی شاعری کا آغاز غزل گوئی سے کیا تھا۔
- والد میر مستحسن خلیق کے کہنے پر مرثیہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔
- میر انیس نے اپنی پہلی غزل والد خلیق کے کہنے پر ناسخ کو دکھائی تھی۔
- انیس نے ایک مرثیہ میں خدا سے دعا کی تھی کہ مجھے ایسی مہارت عطا فرما کہ ''خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صف جنگ۔'' دعا قبول ہوئی اور انیس نے جو واقعہ بیان کیا اس کی تصویر کھینچ دی۔

- میر انیس نے 32-1231ھ میں تیرہ چودہ سال کی عمر میں پہلا مرثیہ زنانی مجلس کے لیے کہا تھا۔
- انیس نے 1237ھ بمطابق 1822 تک مشاعروں میں غزل گو کی حیثیت سے شرکت کی۔
- اردو شاعری میں سب سے زیادہ الفاظ و محاورات انیس نے استعمال کیے ہیں۔
- انیس پہلے حزیں تخلص کرتے تھے۔ ناسخ کے کہنے پر 1231ھ بمطابق 1816 میں انیس تخلص اختیار کیا۔
- ہوا یوں کہ 1816 میں اپنے والد خلیق اور ناسخ کے سامنے انیس نے جب یہ مطلع پڑھا'' کھلا باعث یہ اس بے درد کے آنسو نکلنے کا'' تو ناسخ نے بہت تعریف کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ ان کا تخلص حزیں کے بجائے کچھ اور ہو تو بہتر ہے۔ اس پر خلیق نے کہا کہ آپ ہی ان کے لیے کوئی تخلص تجویز فرمایئے تو ناسخ نے کہا کہ مجھے انیس پیارا لگتا ہے۔ تب سے میر ببر علی نے حزیں کے بجائے انیس تخلص اپنا لیا۔
- انیس نے فیض آباد کے ایک رئیس مرزا سیدو کے یہاں کی مجلس میں پہلے پہل اپنا کہا ہوا 'سلام' سنایا تھا۔
- انیس 1237ھ میں مرزا سیدو کے یہاں دو سو روپے سالانہ پر مجالس پڑھنے پر مقرر ہوئے تھے۔
- انیس کم خوراک تھے۔ انتقال سے دس بارہ برس پہلے سے ہی ہاضمہ کی شکایت کے باعث رات میں انیس کھانا نہیں کھاتے تھے صرف چند بادام رگڑ کر کھا لیا کرتے تھے۔
- انیس مرثیہ پڑھنے سے پہلے خلوت میں آئینہ کے سامنے مشق کیا کرتے تھے۔
- میر انیس اور مرزا دبیر میں معاصرانہ چشمک تھی۔
- میر انیس پر سب سے زیادہ کام مسعود حسن رضوی ادیب نے کیا ہے۔
- انیس نے لکھنؤ میں پہلی مجلس اکرام اللہ خان کے امام باڑے میں پڑھی تھی۔
- انیس کا مستقل قیام لکھنؤ میں امجد علی شاہ کے زمانے میں ہوا۔
- انیس کی ملاقات غالب سے لکھنؤ میں ہوئی تھی۔
- غازی الدین حیدر کی بیگم مبارک محل نے انیس کے لیے نسلاً بعد نسل چالیس روپیہ ماہوار امام باڑہ شاہ نجف میں مجلس پڑھنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ اور انیس وہاں سال میں ایک مجلس پڑھتے تھے)
- انیس ناسخ کو 'جگت استاذ' کہتے تھے۔
- انیس کی ملاقات محمد حسین آزاد سے 58-1857 میں ہوئی تھی۔
- انیس کے مرثیے کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستانی اور اور سیکولر عناصر کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔
- میر انیس کے مرثیوں کی ہیئت مسدس ہے۔
- انیس نے فیض آباد، لکھنؤ، عظیم آباد، بنارس اور حیدر آباد کی مجلسوں میں مرثیے پڑھے تھے۔
- انیس عظیم آباد (پٹنہ) آتے جاتے بنارس میں رک کر مرثیہ پڑھتے تھے۔

- انیس نے عظیم آباد کا پہلا سفر 1274ھ/ 1858 میں عظیم آباد کے نامی رئیس نواب سید قاسم علی خان کے بیٹے سید احمد حسین کی مجلس چہلم میں مرثیہ پڑھنے کی غرض سے کیا تھا۔
- میر انیس کو شریف العلما سید شریف حسین خان کی تحریک پر نواب تہور جنگ بہادر نے حیدرآباد میں مدعو کیا تھا۔
- میر انیس کے لیے پہلے پہل تہور جنگ کی طرف سے بطور نذرانہ تین ہزار روپے مقرر ہوئے تھے جسے انیس نے نامنظور کر دیا تھا۔ پھر چار ہزار روپیہ طے ہوا۔
- انیس نے حیدرآباد کا سفر 1871 میں چھ آدمیوں کے ساتھ کیا تھا جن میں ان کے دو بیٹے رئیس اور سلیس بھی تھے۔
- انیس نے صرف ایک بار حیدرآباد کا سفر کیا تھا۔
- حیدرآباد میں سر آسمان جاہ نے انیس کے سر پر حیدرآبادی دستار رکھ کر مجلس پڑھنے کی فرمائش اور اس کے صلے میں تین ہزار روپے کی پیش کش کی تھی جسے انیس نے قبول نہیں کیا تھا۔
- میر انیس نے تنگنائے غزل کی شکایت کی ہے۔
- میر انیس نے دعوی کیا ہے کہ:

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں   پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

میر انیس کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- کون بے وقوف کہتا ہے کہ تم محض مرثیہ گو ہو واللہ ثم باللہ تم شاعر گر ہو اور شاعری کا مقدس تاج تمہارے ہی سر پر زیب دیتا ہے۔ خدا مبارک کرے۔ (خواجہ حیدر علی آتش)
- انیس کے ہر لفظ اور ہر محاورے کے آگے سب کو سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ (حالی)
- میر انیس صفائی کلام، لطیف بیان، چاشنی محاورہ، خوبی بندش، حسن اسلوب، مناسبت مقام، طرزِ ادا اور سلسلے کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے۔ (محمد حسین آزاد- آب حیات)
- ''حالی اور سید ین کی نثر کو اخلاقی نثر کا نام دیا جاسکتا ہے'' تو انیس کے تمام تر کلام کو، یا اس کے بیشتر حصے کو ہم اخلاقی نظم کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ (ڈاکٹر مسعود حسین خان)
- میر خلیق کا لونڈا آفتیں ڈھا رہا ہے۔ (آتش)
- انیس کے مرثیوں کو 'معجز بیانی' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
- صحرائے کربلا کی دوپہر کی شدت اور رات کے سناٹے کو انیس نے مبصر کے احساس اور مصور کی نظر سے دیکھا ہے۔ (جعفر)

- انیس کا مرثیہ "آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے" لکھنو سے دہلی پہنچا تو شیفتہ نے کہا تھا کہ انیس نے خواہ مخواہ پورا مرثیہ لکھ دیا یہی ایک مصرعہ کافی تھا۔
- میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ (عبدالحلیم شرر)

میر انیس کا داخل نصاب مرثیہ

نمک خوانِ تکلم ہے فصاحت میری

نمک خوان تکلم ہے، فصاحت میری — ناطقے بند ہیں سن سن کے بلاغت میری
رنگ اڑتے ہیں وہ رنگین ہے عبارت میری — شور جس کا ہے وہ دریا ہے طبیعت میری
عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں — بحرِ مواج فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذروں کو انجم کر دوں — گنگ کو، ماہر انداز تکلم کر دوں
درد سر ہوتا ہے بے رنگ نہ فریاد کریں
بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہیں کیا کیا مداح — جدِّ اعلیٰ سے نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح
باپ مداح کا مداح ہے دادا مداح — عم ذی قدر ثنا خوانوں میں یکتا مداح
جو عنایات الٰہی سے ہوا نیک ہوا
نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

طبع ہر ایک کی موزوں قد زیبا موزوں — صورت سرو ازل سے ہیں سراپا موزوں
نثرِ بے سجع نہیں، نظم معلیٰ موزوں — کہیں سکتہ نہیں آ سکتا، کجا ناموزوں
تول لے عقل کی میزاں میں جو فہمیدہ ہے
بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

خلق میں مثل خلیق اور تھا خوش گو کوئی کب — نام لے دھو لے زباں کوثر و تسنیم سے جب
بلبل گلشن زہرا و علی عاشق رب — متبع مرثیہ گوئی میں ہوئے جس کے سبب
ہو اگر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے
اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

بھائی خوش فکرت و خوش لہجہ و پاکیزہ خصال جن کا سینہ گہر علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت، یہ بلاغت، یہ سلاست یہ کمال معجزہ گر نہ اسے کہیے تو ہے سحر حلال
اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطف حضرت کا یہ ہے رحمت یزدانی ہے
کیوں نہ ہو بندۂ موروثی مولا ہوں میں قلزم رحمت معبود کا قطرہ ہوں میں
جس میں لاکھوں درومرجاں ہیں وہ دریا ہوں میں مدح خوانِ پسرِ حضرتِ زہرا ہوں میں
وصف جوہر کا کروں یا صفت ذات کروں
اپنے رتبے پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں
مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب شوقِ مداحِ شبیر عطا کر یارب
سنگ ہو موم وہ تقریر عطا کر یارب نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یا رب
جد و آبا کے سوا اور کوئی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہوں گنجلک نہ ہوں تعقید نہ ہو
وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہل شعور ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کششِ مو قلم طرۂ حور صاف ہر رنگ سے ہو صنعت صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیریں سمجھے
نقشِ ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے
قلمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ خوں برستا نظر آئے جو دکھاؤں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی
روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے، صنعت ہو وہی یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے   تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے   زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد
بزم کا رنگ جدا، رزم کا میداں ہے جدا   یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو، تو ہر نامے کا عنواں ہے جدا   مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو، مصائب بھی ہوں، توصیف بھی ہو
دل بھی محفوظ ہوں، رقت بھی ہو تعریف بھی ہو
ماجرا صبحِ شہادت کا بیان کرتا ہوں   رنج و اندوہ و مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں   جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں، ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہوں گے، نہ صاحب ایسا
صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور   زمزمے کرنے لگے یادِ الٰہی میں طیور
مثلِ خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور   یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخِ مولا سے ظہورِ حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا، چاند کا چہرہ فق تھا
ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیاباں وہ سحر   دم بدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر   لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی
بلبلوں کی وہ صدائیں، وہ گلوں کی خوشبو   دل کو الجھاتے تھے، سنبل کے وہ پرخم گیسو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یاہو یاہو   فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی، کوکوکو
وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب، حمد و ثنا کرتے تھے

Scanned by CamScanner

آئے سجاد طاعت پہ امامِ دو جہاں　　اس طرف طبل بجا یاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں　　وہ نمازی کہ جو ایمان کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے، ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

عرشِ اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں ان کی　　وجد کرتے تھے ملک، سن کے صدائیں ان کی
وہ عمامے، وہ قبائیں، وہ عبائیں ان کی　　حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں ان کی
ذکرِ خالق میں لب ان کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے، سبحان اللہ　　کیا رفیقانِ وفادار تھے، سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرار تھے، سبحان اللہ　　زاہد و عابد و ابرار تھے، سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی، مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے　　عجب اسوار تھے بے مثل، عجب تازی تھے
لائقِ مدح و سزاوارِ سر افرازی تھے　　گو بہت کم تھے، پہ آمادۂ جاں بازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ آ گئی جاں ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

زہد میں حضرت سلماں کے برابر کوئی　　دولتِ فقر و قناعت میں ابوذر کوئی
صدقِ گفتار میں عمار کا ہمسر کوئی　　حمزۂ عصر کوئی مالکِ اشتر کوئی
ہوں گے ایسے ہی محمد کے جو شیدا ہوں گے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا، نہ وہ پیدا ہوں گے

گو مصیبت میں تلاطم میں، تباہی میں رہے　　سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز، وہ سب لشکرِ شاہی میں رہے　　جس طرح تیغِ دو دم دستِ سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی ان کو
آبرو ساقیِ کوثر نے عطا کی ان کو

وہ تخشع، وہ تضرع، وہ قیام اور وہ قعود   وہ تذلل وہ دعائیں وہ رکوع اور وہ سجود
یادِ حق دل میں، تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود   یہ دعا خالقِ اکبر سے کہ اے ربِ ودود
یوں لٹیں ہم کہ، نہ آل اور نہ اولاد رہے
مگر احمد کے نواسے کا گھر آباد رہے

موم فولاد ہو آوازوں میں وہ سوز و گداز   اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلیٰ پہ نماز   شیر دل منتخبِ دہر وحید و ممتاز
چاند شرمندہ ہو، چہرے متجلی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلی ایسے

جب فریضے کو ادا کر چکے وہ خوش کردار   کس کے کمروں کو بصد شوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار   علمِ فوج کو عباس نے کھولا اک بار
دشت میں نکہت فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہر وہ سبز پھریرے کی، وہ پنجے کی چمک   شرم سے ابر میں چھپ جاتا تھا خورشید فلک
کہتے تھے صلِ علیٰ چرخ پہ اٹھ اٹھ کے ملک   دنگ تھے سب وہ سماں سے تھا سماں تا بہ فلک
کہیے پستی اسے جو اوج ہما نے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

اس طرح جب علمِ دلبرِ زہرا جائے   کس سے پھر معرکۂ رزم میں ٹھہرا جائے
سانپ دشمن کی نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے   لہر میں تا بہ فلک جس کا پھریرا جائے
رفع شر کو، علم خیر بشر آیا تھا
سورہ نصر پئے فتح و ظفر آیا تھا

وہ علم دار کہ جو شیرِ الٰہی کا خلف   گوہر بحرِ وفا، نیرِ دیں درِ نجف
فخرِ حمزہ سے نمودار کا جعفر کا شرف   کس طرح چاند کہوں، چاند میں ہے عیب کلف
کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم ان کے لیے
یہ علم کے لیے تھے اور علم ان کے لیے

سرو شرمائے، قد اس طرح کا، قامت ایسی　　اسد اللہ کی تصویر تھے، صورت ایسی
شیر نعروں سے دہل جاتے تھے، صولت ایسی　　جا کے پانی نہ پیا نہر پہ ہمت ایسی
جان جب تک تھی اطاعت میں رہے بھائی کی
تھے علم دار، مگر بچوں کی سقائی کی

وہ بہشتی نے کیا، جس کو وفا کہتے ہیں　　ہم انہیں عاشقِ شاہِ شہدا کہتے ہیں
ان کو قبلہ تو انہیں قبلہ نما کہتے ہیں　　جو بہادر ہیں، وہ شمشیرِ خدا کہتے ہیں
عشقِ سردار و علمدار کا افسانہ ہے
وہ چراغِ رہِ دیں ہے تو یہ پروانہ ہے

اک طرف اکبرِ مہرو سا جوانِ نایاب　　کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمدِ ایامِ شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب　　آنکھیں ایسی کہ رہا، نرگسِ شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں، محبوبِ خدا کو دیکھا

اے خوشا حسنِ رخِ یوسفِ کنعانِ حسن　　راحتِ روحِ حسین، ابن علی، جانِ حسن
جسم میں زورِ علی، طبع میں احسانِ حسن　　ہمہ تن خلقِ حسن، حسنِ حسن، شانِ حسن
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں سہانی پوشاک

اللہ اللہ اسدِ حق کے نواسوں کا جلال　　چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے بال
نیچے کاندھوں پہ رکھے ہوئے، مانندِ ہلال　　گرچہ بچپن تھا، پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکرِ کفار کے ہٹ جاتے تھے

آستینوں کو چڑھائے ہوئے آمادۂ جنگ　　وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ، وہی ڈھنگ
سرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ　　ولولہ صف کے الٹنے کا، لڑائی کی امنگ
جسم پر تیر چلیں، نیزۂ خونخوار چلے
شوق اس کا تھا کہ جلدی کہیں تلوار چلے

یک بیک طبل بجا فوج میں گرجے بادل　　کوہ تھرائے، زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلواروں کے پھل　　مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل
واں کے جاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

شور میدانیوں میں تھا، کہ دلیرو نکلو!　　نیزہ بازی کرو، رہواروں کو پھیرو نکلو!
نہر قابو میں ہے، اب پیاسوں کو گھیرو نکلو!　　غازیو! صف سے بڑھو غول سے شیرو نکلو!
رستمو! دادِ وغا دو، کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدر کرار کی اولاد کا ہے

شور سادات میں تھا، یا شہِ مرداں مددے　　کعبۂ دیں مددے، قبلۂ ایماں مددے
قوتِ بازوے پیغمبرِ ذی شاں مددے　　دم تائید ہے، اے فخرِ سلیماں مددے
تیسرا فاقہ ہے، طاقت میں کمی ہے مولا!
طلب قوتِ ثابت قدمی ہے مولا!

پیاس میں حرف نہ شکوے کا زباں پر لائیں　　دم بدم سینوں پہ فاقوں میں سنانیں کھائیں
دل نہ تڑپے، جو دمِ نزع نہ پانی پائیں　　تیرے فرزند کی تائید کریں، مرجائیں
لاشے مقتل میں ہوں لاشِ شہ دلگیر کے پاس
سر ہوں نیزے پہ سرِ حضرتِ شبیر کے پاس

سامنے بڑھ کے یکایک صفِ کفار آئی　　جھوم کر تیرہ گھٹا، تاروں پہ اک بار آئی
روزِ روشن کے چھپانے کو شبِ تار آئی　　تشنہ کاموں کی طرف، تیروں کی بوچھار آئی
ہنس کے منہ بھائی کا شاہِ شہدا نے دیکھا
اپنے آقا کو بہ حسرت رفقا نے دیکھا

عرض عباس نے کی جوش ہے جراروں کو　　تیر سب کھاتے ہیں، تولے ہوئے تلواروں کو
میہمانوں کا نہیں پاس، ستمگاروں کو　　مصلحت ہو تو رضا دیجیے، غمخواروں کو
رد سیاہوں کو مٹا دیں کہ بڑھے آتے ہیں
ہم جو خاموش ہیں وہ منہ پہ چڑھے آتے ہیں

شہ نے فرمایا، مجھے خود ہے شہادت منظور　　نہ لڑائی کی ہوس ہے، نہ شجاعت کا غرور
جنگ منظور نہ تھی ان سے پہ اب ہوں مجبور　　خیر، لڑ لو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور
ذبح کرنے کے لیے لشکرِ ناری آئے
کہیں جلدی مرے سر دینے کی باری آئے

حکم پانا تھا کہ شیروں نے اڑائے تازی　　مثلِ شہباز گیا ایک کے بعد اک غازی
واہ ری حرب، خوشا ضرب، زہے جانبازی　　اڑ گیا ہاتھ بڑھا جو پئے دست اندازی
لوٹتے رن میں سر و جسم نظر آتے تھے
ایک حملے میں قدم فوج کے جم جاتے تھے

جس پہ غصہ میں گئے صید پہ شہباز گرا　　یہ کماں کٹ کے گری، وہ قدر انداز گرا
جب گرا خاک پہ گھوڑے سے، تو ممتاز گرا　　نہ اٹھا پھر کبھی، جو تفرقہ پرداز گرا
ہاتھ منہ کٹ گئے، سر اڑ گئے جی چھوٹ گئے
مورچے ہو گئے پامال، پرے ٹوٹ گئے

بعد غیروں کے عزیزوں نے کیا عزمِ نبرد　　سر کو نہیوڑا کے بھرا سبطِ نبی نے دم سرد
ہوک اٹھی کبھی سینے میں، تو دل میں کبھی درد　　سرخ ہوتا تھا کبھی چاند سا چہرہ کبھی زرد
کوئی گل رو تو کوئی سرو سہی بالا تھا
وہ بچھڑنے لگے، گودی میں جنہیں پالا تھا

زلفوں والا تھا کوئی، کوئی مرادوں والا　　کوئی بھائی کا پسر، کوئی بہن کا پالا
چاند سا منہ جو کسی کا تھا تو گیسو ہالا　　کوئی قامت میں بہت کم کوئی قد میں بالا
نوجواں کون سا خوش رو و خوش انداز نہ تھا
کتنے ایسے تھے کہ سبزہ ابھی آغاز نہ تھا

یہی ہنگامہ رہا صبح سے، تا وقتِ زوال　　لاش پر لاش گری، بھر گیا میدانِ قتال
سرخرو خلق سے اٹھے، اسد اللہ کے لال　　مورچے سب تہہ و بالا تھے، پرے سب پامال
کھیت ایسے بھی کسی جنگ میں کم پڑتے ہیں
جو لڑا سب یہی سمجھے کہ علی لڑتے ہیں

قاسم و اکبر و عباس کا اللہ رے جہاد　　غل ہر اک ضرب پہ تھا اب، ہوئی دنیا برباد
الاماں کا تھا کہیں شور کہیں تھی فریاد　　دے گئے خلق میں مردانگی حرب کی داد
گو وہ دنیا میں نہیں، عرش مقام ان کا ہے
آج تک عالمِ ایجاد میں نام ان کا ہے

دوپہر میں وہ چمن بادِ خزاں نے لوٹا　　پتا پتا ہوا تاراج تو بوٹا بوٹا
باپ بیٹے سے چھٹا، بھائی سے بھائی چھوٹا　　ابنِ زہرا کی کمر جھک گئی بازو ٹوٹا
پھر سے نہ یاور، نہ وہ جان باز نہ وہ شیدا تھے
ظہر کے وقت حسین ابنِ علی تنہا تھے

ساتھ جو جو کہ بہادر تھے، وطن سے آئے　　سامنے سوتے تھے ریتی پہ سنائیں کھائے
دھوپ میں پیاس سے مثلِ گلِ تر مرجھائے　　مرگئے پر نہ غریبوں نے کفن تک پائے
دھوپ پڑتی تھی یہ دن چرخ نے دکھلایا تھا
نہ تو چادر تھی کسی لاش پہ نے سایا تھا

صاحبِ فوج پہ طاری تھا عجب رنج و ملال　　زرد تھا رنگ، تو آنکھیں تھیں لہو رونے سے لال
کبھی بھائی کا الم تھا، کبھی بیٹے کا خیال　　کبھی دھڑکا تھا کہ لاشیں نہ کہیں ہوں پامال
کبھی بڑھتے تھے وغا کو، کبھی رک جاتے تھے
سیدھے ہوتے تھے کبھی، اور کبھی جھک جاتے تھے

بڑھ کے چلاتے تھے بے درد کہ اب آپ آئیں　　جوہر تیغِ شہنشاہِ نجف دکھلائیں
مرنے والے نہیں جیتے جو سنائیں کھائیں　　کاٹ لیں آپ کا سر تن سے تو فرصت پائیں
پسرِ سعد سے وعدہ ہے، صلا لینے کا
حکم ہے خیمۂ اقدس کے جلا دینے کا

شہ نے فرمایا کہ سر کاٹ لو، حاضر ہوں میں　　نہ تو لڑنے میں، نہ مرجانے میں قاصر ہوں میں
فوج بھی اب نہیں بے یاور و ناصر ہوں میں　　شہر و صحرا بھی تمہارا ہے، مسافر ہوں میں
لوٹ لو پھونک دو، تاراج کرو بہتر ہے
کلمہ گویو! یہ تمہارے ہی نبی کا گھر ہے

کئی سیدانیاں خیمے میں ہیں پردے والی　　جن کا رتبہ ہے زمانے میں ہر اک پر حالی
اب نہ وارث کوئی سر پر ہے، نہ کوئی والی　　ان کو دیجو! کوئی رہ جائے جو خیمہ خالی
یہ نبی زادیاں بے پردہ نہ ہوئیں جس میں
ایک گوشہ ہو کہ سب بیٹھ کے روئیں جس میں

سن کے ان باتوں کا اعدا نے دیا جو کہ جواب　　گر لکھوں اس کو تو ہو جائے جگر سنگ کا آب
قلب تھرا گیا ہرگز نہ رہی ضبط کی تاب　　دیکھ کر رہ گئے گردوں کو، شہ عرش جناب
اشک خالی اسے کرتے ہیں جو دل بھر آئے
آپ رونے کے لیے خیمے کے در پر آئے

تھم کے چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم　　تم سے رخصت کو پھر آیا ہے حسینِ مظلوم
آ مرے قتل کے درپے ہے یہ سب لشکرِ شوم　　ہاں جگادو اسے غش ہو جو سکینہ معصوم
نہیں ملتا جو زمانے سے گزر جاتا ہے
کہہ دو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہے

یہ صدا سن کے حرم خیمے سے، مضطر دوڑے　　شہ کی آواز پہ سب بے کس و بے پر دوڑے
گر پڑیں سر سے ردائیں تو کھلے سر دوڑے　　بچے روتے ہوئے ماؤں کے برابر دوڑے
رو کے چلائی سکینہ شہ والا آؤ!
میں تمہیں ڈھونڈتی تھی، دیر سے بابا آؤ!

آؤ اچھے مرے بابا، میں تمہاری واری　　دیکھو تم بن ہیں گلے تک مرے آنسو جاری
آج یہ کیا ہے کہ بھولے مرے خاطر داری　　ہاتھ پھیلا کے کہو! آ مری بیٹی پیاری
منہ چھپانے کی ہے کیا وجہ نہ شرماؤ تم
اب میں پانی بھی نہ مانگوں گی، چلے آؤ تم

دیکھ کر پردہ سے یہ کہنے لگی، زینب زار　　ابنِ زہرا تری مظلومی و غربت کے نثار
آؤ چادر سے کروں پاک، میں چہرے کا غبار　　شہ نے فرمایا، بہن مر گئے سب مونس و یار
تم نے پالا تھا جسے، ہم اسے رو آئے ہیں
علی اکبر سے جگر بند کو کھو آئے ہیں

منہ دکھائیں کسے، سب سے ہے ندامت زینب گھر میں آنے کی نہیں، بھائی کو مہلت زینب
کھینچ لائی ہے سکینہ کی محبت زینب بھائی جاتا ہے، دکھا دو ہمیں صورت زینب
نہ تو سر کھولو، نہ منہ پیٹو، نہ فریاد کرو
بھول جاؤ ہمیں، اللہ کو اب یاد کرو

صبر سے خوش ہے خدا، اے مری غم خوار بہن سہل ہوجاتا ہے، جو امر ہو دشوار بہن
اپنی ماں کا ہے طریقہ، تمہیں درکار بہن پھر میں کہتا ہوں سکینہ سے خبردار بہن
ناز پرور ہے مرے بعد الم اس پہ نہ ہو
بُندے کانوں سے اتارو کہ ستم اس پہ نہ ہو

کہیو عابد سے یہ پیغام مرا بعد سلام غش تھے تم پھر گئے دروازے تلک آ کے امام
قید میں پھنس کے نہ گھبرائیو اے گل اندام کاٹیو صبر و رضا سے، سفرِ کوفہ و شام
ناؤ منجدھار میں ہے شور طلاطم جانو!
نا خدا جاتا ہے، گھر جانے اور اب تم جانو!

کہہ کے یہ باگ پھرآئی طرفِ لشکرِ شام پڑ گیا خیمہ ناموس نبی میں کہرام
رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آئے جو امام رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام
سر جھکے ان کے جو کامل تھے زباں دانی میں
اڑ گئے ہوش فصیحوں کے رجز خوانی میں

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں مجھ کو پہچانو! کہ خالق کا شناسا ہوں میں
زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراساں ہوں میں تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں
چین کیا چیز ہے، آرام کسے کہتے ہیں؟
اس پہ شکوہ نہیں کچھ، صبر اسے کہتے ہیں

اس کا پیارا ہوں جو ہے ساقیِ حوضِ کوثر اس کا بیٹا ہوں، جو ہے فاتحِ بابِ خیبر
اس کا فرزند ہوں کی جس نے مہم بدر کی سر اس کا دلبر ہوں میں، دی جس کو نبی نے دختر
صاحبِ تخت ہوئے، تیغ ملی، تاج ملا
دوش احمد پہ انہیں رتبہ معراج ملا

بے وطن ہوں نہ مسافر کو ستاؤ اللہ قتل کیوں کرتے ہو تم، کون سا میرا ہے گناہ
اب نہ یاور ہے کوئی ساتھ نہ لشکر نہ سپاہ تم کو لازم ہے غریبوں پہ ترحم کی نگاہ
ہاتھ آئے گا نہ انعام، نہ زر پاؤ گے
یاد رکھو! مرا سر کاٹ کے پچھتاؤ گے

نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر حجت اللہ کے فرزند پہ چلنے لگے تیر
چوم کر تیغ کے قبضے کو پکارے شبیر لو خبردار! چمکتی ہے علیؑ کی شمشیر
پسرِ فاتحِ صفین و حنین آتا ہے
لو صفیں باندھ کے روکو تو حسینؑ آتا ہے

لو کھنچی تیغِ دوسر، فوج پہ آفت آئی لو ہلا، قائم عرش، قیامت آئی
فتح تسلیم کو، آداب کو نصرت آئی فخر سے غاشیہ برداری کو شوکت آئی
چوم لوں پاؤں، جلال اس تگ و دو میں آیا
ہاتھ جوڑے ہوئے اقبال جلو میں آیا

آپ سیدھے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور دونوں آنکھیں ابل آئیں کہ ڈرے بانیِ شر
تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا، دُم کو چنور مثلِ طاؤس اڑا، گاہ اِدھر، گاہ اُدھر
دم بدم گرد نسیمِ سحری پھرتی تھی
جھوم کر پھرتا تھا، گویا کہ پری پھرتی تھی

ابر ڈھالوں کا اٹھا تیغِ دو پیکر چمکی برق چھپتی ہے، یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی، کبھی سر پر چمکی کبھی انبوہ کے اندر، کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن اسے ڈستے دیکھا
مینہ سروں کا صفِ دشمن میں برستے دیکھا

دھار ایسی کی رواں ہوتا ہے دھارا جیسے گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو میں دیکھا
کبھی ایسا نہیں دم خم مہ نو میں دیکھا

اک اشارے میں، برابر کوئی دو تھا کوئی چار   نہ پیادہ کوئی بچتا تھا سلامت نہ سوار
برق گرتی تھی کہ چلتی تھی صفوں پر تلوار   غضب اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار
موت ہر غول کو برباد کیے جاتی تھی
آگ گھیرے ہوئے دوزخ میں لیے جاتی تھی

تیغیں آری ہوئی ڈھالوں کے اڑے پرکالے   بند سب بھول گئے خوف سے نیزوں والے
جو بڑھے ہاتھ سرِ دست قلم کر ڈالے   تیغ کہتی تھی، یہ سب ہیں مرے دیکھے بھالے
صف بہ صف باندھ کے نیزوں کو عبث تولے ہیں
ایسے عقدے مرے ناخن نے بہت کھولے ہیں

جب کبھی جائزۂ فوج ستم لیتی ہوں   موت سے رحم نہ کرنے کی قسم لیتی ہوں
دو زبانوں سے سدا کارِ قلم لیتی ہوں   چہرے کٹ چکتے ہیں، لشکر کے تو دم لیتی ہوں
بر طرف ہو کے، عدم کے سفری ہوتے ہیں
طبلقیں کٹتی ہیں، چہرے نظری ہوتے ہیں

وہ برش وہ چمک اس کی وہ صفائی اس کی   کسی تلوار نے تیزی نہیں پائی اس کی
اس کا بازو جو اڑایا، تو کلائی اس کی   مل گئی جس کے گلے سے اجل آئی اس کی
صورتِ مرگ کسی نے بھی نہ آتے دیکھا
سر پہ چمکی تو کمر سے اسے جاتے دیکھا

کبھی ڈھالوں پہ گری اور کبھی تلواروں پر   پیدلوں پر کبھی آئی کبھی اسواروں پر
کبھی ترکش پہ رکھا منہ، کبھی سوفاروں پر   کبھی سر کاٹ کے آ پہنچی کمانداروں پر
گر کے اس غول سے اٹھی تو اس انبوہ میں تھی
کبھی دریا میں، کبھی بر میں، کبھی کوہ میں تھی

کبھی چہرہ کبھی شانہ، کبھی پیکر کاٹا   کبھی در آئی جگر میں، تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر، کبھی جوشن، کبھی بکتر کاٹا   طول میں راکب و مرکب کا برابر کاٹا
برشِ تیغ کا غسل، قاف سے تا قاف رہا
پی گئی خون ہزاروں کا، پہ منہ صاف رہا

نہ رکی خود پہ وہ، اور نہ سر پر ٹھہری نہ کسی تیغ پہ دم بھر، نہ سپر پر ٹھہری
نہ جبیں پر نہ گلے پر، نہ جگر پر ٹھہری کاٹ کر زین کو، گھوڑے کی کمر پر ٹھہری
جان گھبرا کے تنِ دشمنِ دیں سے نکلی
ہاتھ بھر ڈوب کے تلوار، زمیں سے نکلی

کٹ گئی، تیغ تلے جب صفِ دشمن آئی یک بیک فصلِ فراقِ سر و گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی
غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں
زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

وہ چمک اس کی، سُروں کا وہ برسنا، ہرسو گھاٹ سے تیغ کے، اک حشر بپا تھا لبِ جو
آب میں صورتِ آتش تھی، جلا دینے کی خو اور دم بڑھتا تھا، پیتی تھی جو اعدا کا لہو
کبھی جوشن، تو کبھی صدرِ کشادہ کاٹا
جب چلی ضربتِ سابق سے زیادہ کاٹا

تنِ تنہا شہ دیں لاکھ سواروں سے لڑے بے سپر برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورتِ شیر خدا، ظلم شعاروں سے لڑے دو سے اک لڑنہیں سکتا، یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب، تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جانِ علیِ ابن ابی طالب ہو

تیسرے فاقے میں یہ جنگ، یہ حملے یہ جدال پیاس وہ پیاس کہ نیلم تھے سراسر لب لعل
دھوپ وہ دھوپ کہ سوکھے ہوئے تھے تازہ نہال لُو وہ لُو جس کی حرارت سے پگھلتے تھے جبال
سنگ ریزوں میں، تب و تاب تھی انگاروں کی
سر پہ یا دھوپ تھی، یا چھاؤں تھی تلواروں کی

شیر سے تھے کبھی جنگل میں، ترائی میں کبھی ڈھال کو چہرے پہ روکا نہ لڑائی میں کبھی
تیغ حیدر نے کمی کی نہ صفائی میں کبھی فرق آیا نہ سر و تن کی جدائی میں کبھی
کبھی ابرو کا بھی ایسا نہ اشارا دیکھا
جس پہ اک وار کیا اس کو دوبارا دیکھا

رخش وہ رخش، کہ سب برق کی سرعت جس میں | آنکھ وہ آنکھ کہ شیروں کی جلالت جس میں
ہاتھ وہ ہاتھ، ید اللہ کی طاقت جس میں | تیغ وہ تیغ، عیاں موت کی صورت جس میں

روک لے دار، جگر کیا کسی بے پیر کا ہے
زور وہ، جس میں اثر فاطمہ کے شیر کا ہے

تنِ تنہا کی وغا، لشکرِ کیں سے پوچھو | جنگ میں پیاس کا صدمہ شہ دیں سے پوچھو
ضربِ شمشیر دو سر، روحِ امیں سے پوچھو | زلزلہ دشت پہ آفت کا، زمیں سے پوچھو

باپ اس فوج میں تنہا، پسر اس لشکر میں
کربلا میں یہ تلاطم ہوا، یا خیبر میں

وہی حملے تھے، وہی زور، وہی تھی تلوار | اسد اللہ کے صدقے، شہ والا کے نثار
مورچے فوج کے، حضرت نے بھی توڑے کئی بار | فتحِ حیدر نے کیا جنگ میں خیبر کا حصار

کیوں نہ ہو احمدِ مرسل کے نواسے تھے حسینؑ
فرق اتنا تھا کہ دو روز کے پیاسے تھے حسینؑ

ہم نے دیکھی ترے ہاتھوں کی صفائی مولا! | ہر طرف فوج میں غل تھا کہ دہائی مولا!
آپ کرتے ہیں بروں سے بھی بھلائی مولا! | الاماں خوب سزا جنگ کی پائی مولا!

ہاتھ ہم باندھتے ہیں پھینک کے شمشیروں کو
بخشیے امتِ نا اہل کی تقصیروں کو

یہ وغا تیسرے فاقے میں، بشر کا نہیں کام | آئی ہاتف کی یہ آواز کہ اے عرشِ مقام
لوحِ محفوظ پہ مرقوم ہے، صابر ترا نام | اے محمدؐ کے جگر بند، امام ابنِ امام

اب نہیں حکم لعینوں سے وغا کرنے کا
ہاں! یہی وقت ہے وعدے کے وفا کرنے کا

نخل سرسبز ہیں فردوس میں نہریں جاری | آج ہے آٹھوں بہشتوں کی نئی تیاری
خانہ دوست میں ہے، دوست کی مہانداری | شب سے حوریں ہیں مکلل بجواہر ساری

پیشوائی کو رسول الثقلین آتے ہیں
عرش تک شور یہی ہے کہ حسینؑ آتے ہیں

تھم گئے سن کے یہ آوازِ شہِ جن و بشر   روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانیِ شہ   شمرِ اظلم ہے کدھر کھینچ کے آئے خنجر
ہے وہ عاشق جو فدا ہونے کو موجود رہے
بس مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

کہہ کے یہ میان میں مولا نے رکھی تیغِ دو دم   ہاتھ اٹھا کر یہ اشارہ کیا گھوڑے کو کہ تھم
رہ گیا سر کو جھکا کر فرسِ تیز قدم   چار جانب سے مسافر پہ چلے تیرِ ستم
نیزے یوں گرد تھے جیسے گلِ تر خاروں میں
گھر گئے سبطِ نبی، ظلم کی تلواروں میں

پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھاتی چھانی   نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی
سر پہ تلواریں چلیں، زخمی ہوئی پیشانی   خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخِ نورانی
جسم سب چور تھا، پرزے تھے زرہ جامے کے
پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

برچھیاں مارتے تھے، گھاٹ پہ جو تھے پہرے   کس طرف جائے، کہاں تیغوں میں بیکس ٹھہرے
ایک ہزار اور کوئی سو زخم تھے تن پر گہرے   دیکھنے والوں کے ہو جاتے تھے، پانی زہرے
خوں میں ڈوبا ہوا وہ مصحفِ رخ سارا تھا
جزو ہر اک تن شبیر کا سی پارا تھا

ہاتھ سے باگ جدا تھی، تو رکابوں سے قدم   غش میں سیدھے کبھی ہوتے تھے فرس پر کبھی خم
بہتے تھے پہلوؤں سے، خوں کے دڑیڑے پیہم   کوئی بیکس کا مددگار نہ تھا ہائے ستم
مارے تلواروں کے مہلت تھی نہ دم لینے کی
کوششیں ہوتی تھیں کعبے کے گرا دینے کی

دشت سے آتی تھی زہراؑ کی صدا ہائے حسینؑ   میرے بیکس، میرے بے بس، مرے دکھ پائے حسینؑ
در سے چلاتی تھی زینبؑ مرے ماں جائے حسینؑ   کون تیغوں سے بچا کر تجھے لے آئے حسینؑ
فاطمہؑ رو رہی ہیں، ہاتھوں سے پہلو تھامے
حکم گر ہو تو بہن دوڑ کے بازو تھامے

ہائے سیدا ترا تن اور ستم کے بھالے کس کو چلاؤں کہ جیتے نہیں مرنے والے
اس پہ یہ ظلم دکھوں سے جسے زہراؑ پالے کون سر سے ترے تلواروں کی آفت ٹالے
کون فریاد سنے بے سر و سامانوں کی
یاں تو بستی بھی نہیں کوئی مسلمانوں کی

نہ رہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا گر پڑا خاک پہ، وہ عرش خدا کا تارا
غش سے کچھ دیر میں چونکا جو علیؑ کا پیارا نیزہ سینے پہ، سناں ابنِ انس نے مارا
واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی
یاں بہن خیمے کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو ہٹا دشمنِ دیں جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں
تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمر لعیں آسماں ہل گئے تھرا گئی مقتل کی زمیں
کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پر رکھا
پاؤں قرآں پہ رکھا، حلق پہ خنجر رکھا

ڈھانپ کر ہاتھوں سے منہ بنتِ علی چلائی ذبح ہوتے ہو مرے سامنے ہے ہے بھائی
ضربِ اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی
آنکھ کھولی تھی کہ ہنگامہ محشر دیکھا
سر اٹھایا تو سرِ شہ کو سناں پر دیکھا

رو کے چلائی کہ ہے ہے مرے مظلوم حسینؑ فوجِ اعدا میں، ترے قتل کی ہے دھوم حسینؑ
کچھ مجھے آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم حسینؑ ہائے میں رہ گئی دیدار سے محروم حسینؑ
مڑ کے دیکھو کہ مصیبت میں پڑی ہوں بھائی
ننگے سر بلوہ اعدا میں کھڑی ہوں بھائی

بس انیس آگے نہ لکھ زینبِ ناشاد کے بین قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں تھی لاشِ حسینؑ
قبر میں بھی نہ ملا احمدِ مختار کو چین گھر جلا، قید ہوئی، آلِ رسول الثقلین
کتنے گھر شاہ کے مر جانے سے برباد ہوئے
لٹ گئے یوں کہ نہ سادات پھر آباد ہوئے



مرزا اسلامت علی دبیر

(1803ء-1875ء)

- نام مرزا اسلامت علی تھا اور تخلص دبیر
- دبیر محلہ، بلی ماران متصل لال ڈگی دہلی میں 11 جمادی الاول 1218ھ مطابق 29 اگست 1803ء میں پیدا ہوئے۔ 'بخت دبیر' سال ولادت ہے۔
- دبیر کا انتقال لکھنؤ میں 1875 بمطابق 1292ھ میں ہوا۔
- دبیر کے والد کا نام مرزا غلام حسین تھا۔
- مرزا دبیر کے آبا و اجداد کا وطن شیراز ایران تھا۔ دبیر کے جد اعلیٰ ملا اہلی شیرازی مصنف مثنوی سحر حلال کے برادر عینی ملا ہاشم شیرازی تھے۔
- دبیر سات برس کی عمر میں ہی دہلی سے لکھنؤ چلے آئے تھے اور محلہ نخاس کے مکان میں رہنے لگے تھے۔
- مرزا دبیر دن میں صرف ایک بار غذا تناول کرتے تھے اور رات میں صرف چائے پیتے تھے۔ دبیر کے درسی تعلیم کے اساتذہ: مولوی ضامن، مولوی مرزا کاظم علی، ملا مہدی مجتہد مازندانی، مولوی فدا علی اخباری تھے۔
- دبیر نے گیارہ بارہ برس کی عمر میں 1229ھ یا 1230ھ میں اپنے والد کے ساتھ میر مظفر حسین ضمیر کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی شاگردی اختیار کی۔
- میر مظفر حسین ضمیر ہی نے مرزا اسلامت علی کا تخلص دبیر تجویز فرما کر کہا تھا ''میر دبیران روشن ضمیر مخفی و محتجب نماند'' اور پھر مسکرا کر فرمایا تھا کہ ''صاحبزادے میں نے اپنے نفس و نام پر تم کو مقدم کر دیا کہ اس مشہور جملہ میں دبیر اول اور ضمیر بعد کو ہے۔''
- میر مظفر حسین ضمیر فخراً اپنے آپ کو استاد دبیر کہتے تھے۔

پہلے تو یہ شہرہ تھا ضمیر آیا ہے
اب کہتے ہیں استادِ دبیر آیا ہے

- دبیر نے بارہ سال کی عمر میں مرثیہ کہنا شروع کیا۔
- دبیر کی شادی انشا کی حقیقی نواسی اور سید معصوم علی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔
- دبیر کے دو لڑکے مرزا محمد جعفر اوج اور مرزا محمد ہاشمی عطارد اور ایک لڑکی تھی۔
- دبیر غازی الدین حیدر کے تخت نشینی کے وقت 11 برس کے تھے اور اس کے انتقال کے وقت

24 برس کے۔

- جب تک لکھنؤ کی سلطنت قائم رہی دبیر ملک اودھ سے کہیں باہر نہیں گئے۔ حالانکہ باہر سے بلاوے بھی آئے مگر ہمیشہ انکار کیا۔
- دبیر نے سیتاپور، لکھنؤ، بنارس، الہ آباد، فیض آباد اور عظیم آباد کے مجلسوں میں مرثیے پڑھے تھے۔
- مرزا دبیر نے عظیم آباد کا سفر پہلے پہل نواب جعفر حسین خان فیض کی استدعا پر 1276ھ بمطابق 1859 میں کیا تھا۔
- مرزا دبیر نے میر انیس کی تاریخ وصال کہی تھی اور اسے میر باقر تاج کے امام باڑہ کی مجلس میں پڑھا تھا۔
- دبیر نے کلکتہ کا سفر آنکھوں کے علاج کی غرض سے واجد علی شاہ کے بلانے پر 1290ھ بمطابق 1874 میں کیا تھا۔

دبیر کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- دبیر کا رنگ سیاہ ہونے کی وجہ سے میر انیس انھیں حضرت یوسف کہتے تھے۔
- واجد علی شاہ نے دبیر کے بارے میں لکھا ہے:

میں کم سنی سے عاشق نظم دبیر ہوں والله لطفِ شعر میں اس کے اسیر ہوں

- غالب نے دبیر کے کچھ بند پڑھ کر کہا تھا "واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے۔ دوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔"
- سلامت علی سا طبیعت دار خلاق مضامین نہ ہوا ہوگا۔ بلا کی طبیعت پائی ہے۔ لطیف تخیل یہی ہے کہ شاعر جو دعویٰ کرے اس کو ثابت کر دے۔ کیا ثابت کیا ہے۔" (ناسخ)
- "انیس و دبیر نے اردو رباعی نگاری کی شرم رکھ لی۔" (امداد امام اثر)
- خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شدت مبالغہ ان کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ (شبلی)

دبیر کا داخل نصاب مرثیہ

نوٹ: نصاب میں دبیر کے جس مرثیہ کی نشان دہی کی گئی ہے وہ دبیر کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ وہ میر انیس کا مرثیہ ہے، یہاں تک کہ وہ مصرعہ بھی درست نہیں ہے۔ آئندہ نصاب میں تبدیلی ہونے پر دبیر کے مرثیے کو ان شاء اللہ شامل کتاب کیا جائے گا۔



غالب کا لکھا ہوا مرثیہ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائے گا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا
ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہ شب چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد وستاں کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہ ہر حال یہ مدت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور



جمیل مظہری

- جمیل مظہری کا نام سید کاظم علی تھا اور جمیل تخلص۔
- جمیل کی پیدائش 1905 میں حسن پورہ سارن میں ہوئی۔ (بحوالہ پروفیسر کوثر مظہری) (کچھ لوگوں نے موتیہاری بھی جاے پیدائش بتایا ہے)
- جمیل مظہری کا انتقال 23 جولائی 1980 میں مظفر پور میں ہوا تھا۔
- جمیل مظہری کے والد بزرگوار کا نام سید خورشید حسنین اور دادکا نام سید مظہر حسن مظہر تھا۔
- جمیل نے دادا ہی کی نسبت سے تخلص کے ساتھ مظہری کا اضافہ کیا تھا۔
- جمیل مظہری کے دادا سید مظہر حسن غزل میں نواب جعفر حسین خان کے اور مرثیہ گوئی میں دبیر کے شاگرد تھے۔
- دادا سید مظہر حسن کے شاد سے دوستانہ مراسم تھے۔
- جمیل مظہری نے ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ اور موتیہاری ضلع اسکول میں حاصل کی تھی۔
- جمیل مظہری نے 1922 میں کلکتہ سے فرسٹ ڈویژن سے میٹرک پاس کیا تھا۔
- جمیل مظہری نے 1928 میں اسلامیہ کالج کلکتہ سے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔
- جمیل مظہری نے 1931 میں فارسی اور تاریخ اسلام میں کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔
- جمیل مظہری نے والدہ کے اصرار پر 1945 میں شادی کی تھی۔
- جمیل مظہری کے شاعری کے استاذ وحشت کلکتوی تھے۔
- جمیل مظہری نے اخبار 'الہند' اور روزنامہ 'عصر جدید' کلکتہ میں کالم لکھ کر ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا تھا۔
- جمیل مظہری کی تقرری بہار کے محکمہ نشر واشاعت کے پبلسی آفیسر کی حیثیت سے 1937 میں ہوئی تھی۔
- جمیل مظہری پبلسی آفیسر پروفیسر عبدالباری اور مولانا آزاد کی سفارش سے مقرر ہوئے تھے۔
- جمیل مظہری نے 1939 میں اپنے عہدہ سے استعفا دینا چاہا تھا مگر ڈاکٹر راجندر پرشاد کے مشورے پر انھوں نے یہ خیال ترک کر دیا تھا۔
- جمیل مظہری نے گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد 12 اگست 1942 کو ان الفاظ کے ساتھ اپنا استعفا دیا تھا۔

شہیدوں کے خون کی روشنائی میں اپنا قلم ڈبو کر میں حکومت برطانیہ کی پبلسی نہیں کرنا چاہتا۔

- جمیل مظہری کو اس بنیاد پر Sacurity act کے تحت گرفتار کرلیا گیا تھا۔
- جمیل مظہری نے فلمی دنیا سے 1943 سے 1947 تک وابستہ رہے تھے۔
- جمیل مظہری کی تقرری اردو پروفیسر کی حیثیت سے پٹنہ کالج میں 1950 میں ہوئی تھی۔
- جمیل مظہری کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں غالب ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

جمیل مظہری کا داخل نصاب مرثیہ

مضراب شہادت

جنبش سے میرے خامۂ افسوں طراز ہے (73 بند)، تصنیف: 1951

درحالِ جناب سید الشہدا علیہ السلام تاریخ

جنبش سے میرے خامۂ افسوں طراز کی   کھلتی ہے آنکھ اُس گرہِ نیم باز کی
دم جس کا گھُٹ رہا تھا کشاکش سے راز کی   سطریں نہیں، شکن ہیں حجاباتِ ناز کی
دل کے دیے جلیں گے محبت کے دیس میں
نکلا ہے حسن، لفظ و معانی کے بھیس میں

آواز میں بھی حسن ہے اور خامشی میں بھی   تنظیم میں بھی حسن ہے، آشفتگی میں بھی
یوں تو ظہور حسن کا ہے راستی میں بھی   اک بانکپن ضرور ہے لیکن کجی میں بھی
سچ پوچھیے اگر، تو بصیرت میں حسن ہے
آنکھوں میں روشنی ہو تو ظلمت میں حسن ہے

لیکن شعور حسن کا اِس آگہی کے ساتھ   ممکن نہیں ہے طبع کی آشفتگی کے ساتھ
پہنچے گا خاک ذوقِ نظر مفلسی کے ساتھ   ہوتی ہے فن کی نشو و نما زندگی کے ساتھ
سو بھینٹ چڑھ رہے ہوں جہاں چار کے لیے
اس ملک میں جگہ نہیں فن کار کے لیے

ظلمت کدے میں ہند کے محشر بپا ہے آج   تہذیب اپنے خون سے رنگیں قبا ہے آج
رفتارِ وقت مدعیِ ارتقا ہے آج   لیکن جو ہورہا تھا وہی ہورہا ہے آج
جنسِ خودی جہاں میں ہے اُرزاں اُسی طرح
انسان کا غلام ہے انساں اُسی طرح

ہے حکمران عقل پہ دولت ابھی تلک ایماں کی ہورہی ہے تجارت ابھی تلک
جاگیر اہرمن کی ہے جنت ابھی تلک ابلیس ہے معلمِ فطرت ابھی تلک
پامالیِ حقوق کا تہذیب نام ہے
انسانیت کی روح کا اک قتلِ عام ہے

چھائی ہے دل پہ موت کی سردی اُسی طرح ہے چہرۂ حیات پہ زردی اُس طرح
پائے ہوس کی دشت نوردی اُسی طرح ذوقِ طلب کی میکدہ گردی اُسی طرح
احساس کا زوال وہی، پستیاں وہی
ساقی وہی ہے، جام وہی، مستیاں وہی

فطرت وہی ہے گردشِ لیل و نہار کی سمٹی ہے ایک باغ میں رونق بہار کی
مٹھی میں ایک شخص کے قسمت ہزار کی توہین ہے عدالتِ پروردگار کی
بدلا نہیں نظامِ مشیت ابھی تلک
کروٹ ہی لے رہی ہے قیامت ابھی تلک

عالم خرابِ فلسفۂ ناؤ نوش ہے شاعر ہے اور ماتمِ تمکین و ہوش ہے
احساس کو جمود ہے، فتنوں کو جوش ہے ہر موج حادثات کی طوفاں بدوش ہے
دنیا تلاش کرتی ہے ساحل نجات کا
دکھلا دے کوئی اِس کو کنارہ فرات کا

جس طرح آج قسمتِ انساں کو ہے زوال دورِ یزید میں تھا یہی کچھ عرب کا حال
روحوں کو کردیا تھا غلامی نے پائمال مردانِ حق پرست کی تھی زندگی و بال
ایماں فروش مستِ طرب انجمن میں تھے
اصحابِ خیر، منزلِ دار و رسن میں تھے

حاکم ہو راہزن تو رعایا کو کیا ہو چین تھا ہر طرف غریبوں کی دُنیا میں شور وشین
افزوں مگر تھی قصرِ خلافت کی زیب و زین اللہ کی زمین پہ تا حدِ مشرقین
لہرا رہا تھا گرچہ پھریرا نشان کا
در بند ہوگیا تھا مگر آسمان کا

جوشِ عمل، نہ ولولۂ خدمتِ اُمم شیرانِ رزم بن گئے تھے آہوے حرم
اتنا جھکے کہ آ ہی گیا گردنوں میں خم ملتا تھا سب کو بادۂ تسلیم بیش و کم
بھٹی کھلی تھی قصرِ خلافت پناہ میں
خاک اُڑ رہی تھی میکدۂ لاالٰہ میں
اک عالمِ سکوت میں تھی بزمِ آب و گل قدرت کا ساز جس کو کہیں آدمی کا دل!
پھر ہو رہا تھا اپنی خموشی سے منفعل تاروں سے آ رہی تھی یہ آواز متصل
روحِ عمل کو لرزشِ بے تاب چاہیے
مضراب چاہیے ہمیں مضراب چاہیے
مضراب بڑھ کے کردی مہیا حسینؑ نے خوں اپنا نبضِ وقت کو بخشا حسینؑ نے
خوابیدہ قوتوں کو جھنجھوڑا حسین نے فطرت کو کردیا تہہ و بالا حسینؑ نے
اللہ رے صبر سنگ کا دل آب ہوگیا
ہر ماجرا فسانۂ مضراب ہوگیا
کعبہ سے وہ سفر، وہ محبوں کا اضطراب وہ سخت منزلیں، وہ کٹھن جادۂ صواب
وہ قاصدوں کا قتل، وہ کوفے کا انقلاب وہ انتشارِ فوج، وہ فہمائشِ جناب
وہ حکم دوستوں کو امامِ غریب کا
انصار کا وہ جوش وہ خطبہ حبیب کا
تقسیمِ آب و لشکرِ حرِ خوش اعتقاد ریتی پہ نصبِ خیمہ و رفعِ شر و فساد
پہرے فرات پر بہ رضائے بنِ زیاد اک مشکِ آب کے لیے عباسؑ کا جہاد
درسِ وفا مکالمہ ہر ایک عون کا
نعرے وہ امّ وہب کے فقرہ وہ جون کا
بچوں کی پیاس سعی وہ اصحابِ خیر کی بہتی ہوئی وہ خاک پہ محنت بریر کی
جرأت وہ سعد کی وہ سعادت عمیر کی طاعت وہ ظہر کی وہ اطاعت زہیر کی
وہ رنج دوستوں کا امامؑ غریب کو
وہ ابنِ عوسجہ کی وصیت حبیب کو

تاریخ میں وہ صبحِ شہادت ہے یادگار بچوں کے خوں نے جس میں بھرا رنگِ اعتبار
ماؤں کی آرزو، کہ یہ امت پہ ہوں نثار انسانیت کو ہے انہیں قدروں سے افتخار
رفتارِ ارتقا پہ یہ قدریں گواہ ہیں
تہذیب کے سفر میں یہی زادِ راہ ہیں

سینے سپر کئے وہ بنوعبدِ مُطّلب سولہ پہر کی پیاس میں دریا سے مجتنب
چھوٹے سے نیچے وہ نیاموں میں مضطرب عارض کے پھول جوشِ شجاعت سے ملتہب
وہ رخصتیں جدال کی ہاتھوں کو جوڑ کے
وہ پھینکنا دغا میں نیاموں کو توڑ کے

تھی دوپہر، شباب پہ تھا رنگِ داستاں کھولے ہوئے سیاہ علَم لشکرِ گراں
وہ گرم لو، وہ دھوپ کی تیزی، کہ الاماں سورج بھی لے رہا تھا دلیروں کا امتحاں
لیکن تپش سے کیا خطر اُن کی نگاہ کو
رد کردیا جنہوں نے سپر کی پناہ کو

اپنی نظر پہ کیا ہو مؤرخ کو اعتبار صحرا عرب کا خونِ محمدؐ سے لالہ زار
دیکھی نہ ہوگی چرخ نے ایسی کبھی بہار تربیتِ پیمبرِ بطحا کے شاہکار
گلگوں کفن مرقعِ کرب و بلا میں تھے
صف بستہ امتحاں گہہِ صبر و رضا میں تھے

بہنوں کا ماما کو وہ بھائی پہ وارنا بیٹوں کو وہ بھتیجے پہ صدقے اُتارنا
سقے کا وہ ترائی میں تلوار مارنا بچی کا در سے اپنے چچا کو پکارنا
نظریں سوے خیام چچا کی اِک آس پر
آنسو نکل رہے تھے بھتیجی کی پیاس پر

وہ اک جواں کا حملۂ کفار روکنا بڑھتے ہوئے ہجوم کا ہر بار روکنا
بچے کا بن کے شہ کی سپر وار روکنا وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں پہ تلوار روکنا
مضرابیں تھیں جمیل اسی ساز کے لیے
سو امتحاں، اک عاشق جاں باز کے لیے

وہ بے کسی وہ تشنہ لبی وہ ہجومِ غم   بچوں کی اور جوانوں کی وہ میتیں بہم
وہ اقتلو کا شور وہ بے تابیِ حرم   خیمے سے العطش کی وہ آواز دمبدم
وہ اک جواں کی لاش پہ سجدہ حسینؑ کا
فطرت بھی دیکھتی تھی کلیجہ حسینؑ کا

اس تشنگی میں نہر پہ دوبار جا کے آئے   موجوں کو اپنے صبر کی طاقت دکھا کے آئے
آئے حرم سرا میں تو گھر کو لٹا کے آئے   پیری میں نوجوانوں کے لاشے اُٹھا کے آئے
زینبؑ کو دی صدا کہ مشیت خدا کی ہے
لے آؤ آخری جو امانت خدا کی ہے

لائیں رباب گود میں بچے کو مرحبا   دولت کو ان کی لے کے چلے شاہِ کربلا
آواز دی بہن نے کہ بھیا یہ کیا کیا   فرمایا مُڑ کے، قرض ابھی تک نہیں چکا
کیا پوچھتی ہو تم کہ ارادہ کہاں کا ہے
زینبؑ دعا کرو کہ یہ وقت امتحاں کا ہے

جب تک کہ امتحان کا یہ وقت ٹل نہ جائے   سینوں میں ظالموں کے کلیجہ پگھل نہ جائے
آہن کی روح، سنگ کی فطرت بدل نہ جائے   پیشانیِ غرور سے جب تک کہ بل نہ جائے
سینے پہ اپنے داغ لیے جائے گا حسینؑ
فدیہ اسی طرح سے دیے جائے گا حسینؑ

ہے یہ مقام صبر کا اے زینبؑ حزیں   ممکن ہے اس کو ذبح کریں رَن میں اہلِ کیں
لیکن مجھے بربِّ محمد یہ ہے یقیں   فطرت نہ سہ سکے گی مری ضربِ آخریں
اکھڑے گی سانس ظلم کی اس کے لہو کے ساتھ
میں اس کو لے چلا ہوں بڑی آرزو کے ساتھ

ممکن ہے اِس سے قوم کو کچھ زندگی ملے   غفلت کو حس، جمود کو کچھ بے کلی ملے
غیرت ملے، شعور ملے، آگہی ملے   مستقبلِ حیات کو اک روشنی ملے
میں جانتا ہوں مصلحتِ بے نیاز کو
مضراب چاہیے دلِ انساں کے ساز کو

یہ طفل، جو تمۂ احرار ہے بہن　　فرض آج اِس کے خوں کا طلب گار ہے بہن
یہ سیرتِ حسینؑ کا شہکار ہے بہن　　اس جنگ میں یہی مری تلوار ہے بہن
ہوگی ادا جہاد کی سنت اِسی سے آج
جیتے گی رن خدا کی سیاست اِسی سے آج

بچے کو لائے رن میں جو آقائے دو جہاں　　آواز دی کہ بھائیو سن لو مری فغاں
بچہ یہ میرا پیاس سے لیتا ہے ہچکیاں　　کچھ تم سے کہہ رہا ہے بلک کر یہ بے زباں
بہتے ہیں اشک پیاس سے چہرہ ملول ہے
دیکھو اسے یہ باغِ محمدؐ کا پھول ہے

مجبور ہے جہاں میں بشر حادثات سے　　ماں کی بھی زندگی ہے اسی کی حیات سے
سینے میں مامتا کے تلاطم ہے رات سے　　کیوں میں کہوں کہ دو کوئی قطرہ فرات سے
ہاں اِس کی بیکسی سے اگر کچھ گھلا ہے وہ
پوچھو خود اپنے دل سے کہ کیا کہہ رہا ہے وہ

حضرت کے اس سوال کا جو کچھ ملا جواب　　لکھوں اگر اُسے تو سیاہی ہو آب آب
بس مختصر یہ ہے کہ ہوئے منفعل جناب　　بچہ ہوا فیوض شہادت سے بہرہ یاب
صابر اس امتحاں میں بھی دیکھا جو آپ کو
دی مسکرا کے تہنیت اصغر نے باپ کو

دم توڑنے لگی جو تمنا رباب کی　　چھائی دلِ حزیں پہ گھٹا اضطراب کی
ڈھانپا عبا سے اس کو رسالت مآب کی　　ریشِ سفید اُس کے لہو سے خضاب کی
اِس صبر کا گلہ جو کیا دل نے باپ کے
خاموش کردیا اُسے تیور نے آپ کے

فرمایا کھینچتے ہوئے گردن سے تیر کو　　احسنتُ حرملہ ترے نفسِ شریر کو
نازاں نہ ہو کہ تیر سے مارا صغیر کو　　تونے ہلاک کرلیا اپنے ضمیر کو
لے دیکھ اب تجھے جو سعادت حصول ہے
پیکاں میں تیرے قطرۂ خونِ رسولؐ ہے

میں نے تجھے معاف کیا اے سپاہِ شام — تجت مرا شعار تھا تجت ہوئی تمام
دیکھ ابنِ سعد دیکھ مشیت کا انتظام — لیکن بہت شدید ہے فطرت کا انتقام
آنکھیں تری سپاہ کی گریاں ابھی سے ہیں
مظلومیت کی فتح کے ساماں ابھی سے ہیں

کس منہ سے جاؤں لے کے اسے سوئے خیمہ گاہ — لاشِ پسر تھی ہاتھ پہ اور سوچتے تھے شاہ
لیکن بقولِ عشق نہ کچھ بن پڑا تو آہ — رُک جاتے تھے بڑھا کے قدم کو میانِ راہ
''ننھی سی قبر کھود کے اصغرؑ کو گاڑ کے''
''شبیرؑ اٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے''

مطلع ثانی

قرنا پھنکی ہے جنگ کی پھر فوجِ شام میں — شوخی نہ کیوں ہو خامۂ رنگیں کلام میں
شعلے لپک رہے ہیں زبانِ حسام میں — کب تک رہے گی تیغِ شہِ دیں نیام میں
ممکن ہے آسماں کو یہ شعلے لپیٹ لیں
روح الامیں کدھر ہیں پروں کو سمیٹ لیں

چہرے میں آفتاب کے ہے دشت کا غبار — ہے وقت وہ کہ فوجِ عدو میں ہے خلفشار
مہرِ مبینِ رُخ سے جلالت ہے آشکار — پشتِ فرس پہ چپ ہیں امام فلک وقار
ہے قلبِ مطمئن میں تلاطم فرات کا
کروٹ بدل رہا ہے سمندر حیات کا

طاری ہے فوجِ شام پہ ہیبت حسینؑ کی — آتی ہے اب جلال میں غیرت حسینؑ کی
غالب مگر ہے غیظ پہ رحمت حسینؑ کی — تیور بدل رہی ہے شجاعت حسینؑ کی
گو دستِ رعشہ دار میں طاقت علیؑ کی ہے
لیکن یہ سوچتے ہیں کہ امت نبیؐ کی ہے

بندے کھڑے ہیں سامنے پروردگار کے — لرزش نہ کیوں ہو ہاتھ میں طاعت گزار کے
نرغہ کیے ہیں گرد شہِ ذی وقار کے — ہر سمت سے پرے سیہ بدشعار کے
اس طرح دشمنوں پہ نظر ہے عتاب کی
جیسے گل و ثمر پہ کرن آفتاب کی

فوجوں میں چپ کھڑے ہیں شہنشاہِ بحر و بر افسردہ جیسے تیرگیِ ابر میں سحر
ہے روحِ خیر معرکہ آرا بہ فوجِ شر عالم یہ ہے کہ رُخ پہ نہیں روکتے سپر
پہلو نکل رہے ہیں شجاعت کے صبر سے
تیروں کا مینھ برستا ہے ڈھالوں کے اَبر سے

آنکھوں کا نور کھو جو گیا ہے سپاہ میں ہے اِک ستائے شیر کی ہیبت نگاہ میں
لب ہائے خشک معرکۂ رزم گاہ میں جنباں ہیں ذکرِ اشہد اَن لا الہٰ میں
مطلب یہ ہے سوائے خدا کے خدا نہیں
چوکھٹ پہ اقتدار کے سجدہ رَوا نہیں

ہے مائلِ جہاد خداوندِ ذوالفقار نعرہ یہ ہے کہ ہم ہیں وہ شیرانِ کردگار
جن کی گرج سے بزم عناصر میں خلفشار بخشا ہے ہم نے نبضِ دو عالم کو اضطرار
مہمیز دی ہے ابلقِ لیل و نہار کو
ٹھنڈا کیا ہے فطرتِ برق و شرار کو

درسِ حیات ہم سے لیا روزگار نے مانگا نمو ہمارے لہو سے بہار نے
سجدہ کیا ہمیں نگہِ اعتبار نے ہم وہ ہیں جن کی ہمتِ انجم شکار نے
جھٹکے دیے ہیں شمس و قمر کے نظام کو
گردوں کی پیٹھ خم ہے ہمارے سلام کو

ہم سے جنودِ کفر نے کھائی شکستِ فاش تم کیا ہو، تم تو کفر کی ہو ایک زندہ لاش
فرعونیت کے بت جو ہیں اے قوم بت تراش ہوں گے وہ میری ضربِ کلیمی سے پاش پاش
آتا ہے تم پہ قہر خدائے علیم کا
یہ میری تیغِ تیز عصا ہے کلیم کا

بھاگو عذابِ ربِّ زمین و زماں ہے یہ دوزخ کی سمت راہبر کارواں ہے یہ
سمجھو نہ یہ کہ بادِ سمومِ خزاں ہے یہ امت کے باغ میں تبرِ باغباں ہے یہ
شاخیں نکل چکی ہیں بہت چھانٹتی ہے یہ
لینا ہو جس کو آئے کفن بانٹتی ہے یہ

اس تیغ دو زبان میں طاقت بلا کی ہے   تلوار کیا ہے حجت قاطع خدا کی ہے
کیوں کر نہ شوخ ہو کہ سہیلی قضا کی ہے   ناز اس پہ ہے کہ تیغِ شہِ لافتا کی ہے
چاٹا تھا ظالموں کا لہو نہروان میں
پیاسی ہے جب سے کیوں نہ ہو خشکی زبان میں

اللہ رے تیغِ تیزِ شہنشاہِ بحر و بر   مثلِ کنیز جس کی خواصی میں تھی ظفر
خادم کی طرح تھے ملک الموت ہم سفر   دوڑے اُسی طرف کو اشارہ کیا جدھر
اس طرح کب چلے تھے کسی کی رکاب میں
ساتھ اِس کا چھوٹ چھوٹ گیا اضطراب میں

بن کر گھٹا جو فوجِ ضلالت شعار آئی   اڑتی ہوئی وہ صاعقۂ شعلہ بار آئی
غل تھا جراحتوں کے چمن میں بہار آئی   گلشن لٹاتی لیلیِ گلگوں عذار آئی
بسمل ہیں کشتگانِ ادا جلوہ گاہ میں
زخموں کے پھول بانٹ رہی ہے سپاہ میں

چھائی تھی فوجِ شام کی ہر سو گھٹا سیاہ   دشت و جبل سیاہ تھے ارض و سما سیاہ
چہرے سیاہ، رایتِ اہلِ جفا سیاہ   ڈھالوں سے ہوگئی تھی وہ ساری فضا سیاہ
اور اُس فضائے تار میں جلوہ فگن تھی وہ
ظلمت کدے میں صبح کی پہلی کرن تھی وہ

مڑتے ہی اس کے ہوگئی ہل چل اِدھر اُدھر   چھٹنے لگے سپاہ کے بادل اِدھر اُدھر
بارش یہاں وہاں تھی تو جل تھل اِدھر اُدھر   گرتے تھے کٹ کے نیزوں کے جنگل اِدھر اُدھر
لوہے کی کیا بساط ہے بجلی کی گشت میں
سائے سے اس کے دھوپ بھی کٹتی تھی دشت میں

کب اس سے شان کم فرسِ بادِ پا کی ہے   ٹاپوں سے جس کی چور زمیں کربلا کی ہے
غل تھا کہ مرتجز نہیں قدرت خدا کی ہے   پیکر میں اس کے بند طبیعت ہوا کی ہے
حوریں نثار زین پہ اور زین پوش پر
رف رف دھرا ہوا تھا فرشتے کے دوش پر

گھوڑا ہے یہ نسیم نہیں ہے، صبا نہیں لیکن مزاجِ برق بھی اتنا رسا نہیں
کہتا ہے کون یہ کہ فرس باوفا نہیں دریا کو ہنہنا کے کبھی دیکھتا نہیں
ہر چند تشنگی کا جگر میں وفور ہے
صابر حضور ہیں تو فرس بھی غیور ہے
رن میں سلاح پوش لعینوں کا وہ جماؤ مڑتی ہوئی صفیں تھیں کہ دریا کا تھا چڑھاؤ
اور اُن صفوں کے بیچ سے وہ اس کی آؤ جاؤ پانی کو کاٹتی ہوئی چلتی ہو جیسے ناؤ
حیرت تھی اس کے گشت پہ ہر شیخ و شاب کو
ٹاپوں سے توڑتا تھا سروں کے حباب کو
ہوکر جو تازہ دم سپہ بدشعار آئی پھر تو غضب میں لیلیِ آہو شکار آئی
توڑا جو میمنہ کو تو سوے یسار آئی! سب نشۂ غرورِ شجاعت اتار آئی!
ہر صف الٹ پلٹ سپہِ جنگ جو کی تھی
مینھ پڑرہا تھا باڑھ پہ ندّی لہو کی تھی!
سانس اس کے ڈر سے بند جو بادِ صبا کی تھی حالت تباہ لشکرِ اہلِ جفا کی تھی!
ہر صف میں دھاک فتنۂ محشر بپا کی تھی شعلوں سے اس کے گرم ہوا کربلا کی تھی!
بھڑکی تھی آگ معرکۂ رزم گاہ میں
سہمی ہوئی تھی دھوپ سپر کی پناہ میں
پھر تو سپاہِ اہلِ جفا بھاگنے لگی! آیا جو خوف دلِ میں حیا بھاگنے لگی
گرد اس قدر اڑی، کہ فضا بھاگنے لگی گھوڑوں کے ساتھ ساتھ ہوا بھاگنے لگی
آنکھوں میں دھول جھونک دی بجلی نے کوند کے
بھاگے سوار اپنے پیادوں کو روند کے
کچھ سمتِ کوفہ، کچھ سوے بابِ سقر چلے ایک ایک سے یہ پوچھ رہا تھا، کدھر چلے
کہتے تھے سب کہ بھاگ چلو بس اگر چلے منزل کا کیا سوال ہے گھوڑا جدھر چلے
گھوڑوں نے بوجھ پھینک دیے اپنی زین کے
اک شور تھا الٹ گئے طبقے زمین کے

جنگل کے شیر بھاگ گئے ہانپ ہانپ کے
اللہ رے خوف دور سے خطرے کو بھانپ کے
تھے علم کانپ کانپ کے
چادر ہلا رہے
پرچم جھکے پھریرے سے منہ ڈھانپ ڈھانپ کے
اکھڑے تھے پاؤں وقت کے اس اژدہام میں
ہل چل مچی تھی قافلۂ صبح و شام میں
جاتی تھی خاک تا بہ فلک خاک دان کی
تھی بس کہ زلزلے میں فضا دو جہان کی
تھامے تھے جبرئیل طناب آسمان کی
دیواریں گر رہی تھیں زمان و مکان کی
ٹکرا کے چور ہوتے گرے عالمین کے
لیکن زمیں دبی تھی قدم سے حسینؑ کے
کنکر لیے تھے منہ میں ابابیل اِک طرف
حاضر تھی فوجِ جن پئے تعمیل اِک طرف
حکم خدا لیے ہوئے جبرئیلؑ اِک طرف
مضطر تھی علقمہ صفتِ نیل اک طرف
''منہ سے لگا چکے تھے سرافیل صور کو''
امت پہ رحم آگیا لیکن حضور کو
آجاتا ہے جو زد پہ کوئی ذوالفقار کے
قربان رحمِ سرورِ عالی وقار کے
جمتے نہیں قدم سپہِ بدشعار کے
منہ اپنا پھیر لیتے ہیں تلوار مار کے
حضرت مگر لجامِ فرس پھیرتے نہیں
ڈر کر جو بھاگتا ہے اُسے گھیرتے نہیں
جاتی ہیں اڑ کے خون کی چھینٹیں خیام میں
بھگدڑ مچی ہوئی ہے سوارانِ شام میں
تلوار کو رحیم نے رکھا نیام میں
زخمی کچل کچل جو گئے اژدہام میں
پھر تو صدا یہ آنے لگی مشرقین سے
فطرت کی لاج رہ گئی صبر حسینؑ سے
پشتِ فرس پہ حالتِ غش میں رہے حضور
تلوار روک لی تو ہوا ضعف کا وفور
چہرے پہ آفتاب کے تھی خجلتِ قصور
گرمی سے اس کی بجھ جو رہا تھا خدا کا نور
تھا وقتِ عصر دی جو اذاں فوجِ شام نے
اپنے مصلّیوں کو پکارا امامؑ نے

آواز دی کہ دن ہے تمام اے نمازیو　　اُٹھو کہ اب قریب ہے شام اے نمازیو
دیتے نہیں جوابِ سلام اے نمازیو　　تم کو پکارتا ہے امام اے نمازیو
بھولے ہمیں بھی کیا کہیں اِس خوابِ ناز کو
اُٹھو صفیں جما کے کھڑے ہو نماز کو

غیرت کا آرہا ہے مقام اے مجاہدو　　جاتی ہے فوج سوے خیام اے مجاہدو
ہے آفتابِ دیں لبِ بام اے مجاہدو　　ہاتھوں سے چھوٹتی ہے لگام اے مجاہدو
اُتریں فرس سے تھام لے بازو اگر کوئی
لیتا نہیں غریب کی آکر خبر کوئی

کروٹ بدل کے دیکھ تو لو میرا حالِ زار　　میں جاں بلب ہوں سرد ہے میدانِ کارزار
مہلت مگر نہیں کہ کروں شکرِ کردگار　　نیزے لگا رہے ہیں مسلسل جفاشعار
تیر و سنان و تیغ و تبر روکتے نہیں!
تم اُٹھ کے میرے رُخ پہ سپر روکتے نہیں

تڑپی یہ سن کے لاشِ رفیقانِ ذی وقار　　زینبؑ ہوئیں اُدھر درِ خیمہ پہ بے قرار
آواز دی کہ آپ پہ بھیا بہن نثار　　گر حکم ہو تو خیمے سے نکلے یہ سوگوار
دیتے نہیں جواب جو پیارے حضور کو
آکر بہن فرس سے اتارے حضور کو

پہنچی یہ جاں گداز صداگوشِ شاہ میں　　اِک کیفیت ملال کی اُبھری نگاہ میں
آواز دی کہ ہم ہیں کھڑے وعدہ گاہ میں　　درپیش مرحلہ ہے محبت کی راہ میں
اِس حال میں مریض پسر کے قریں رہو
عابدؑ نکل پڑے گا بہن تم وہیں رہو

اتنے میں پھر پلٹ جو پڑی فوجِ کینہ جو　　دیکھا نگاہِ یاس سے حضرت نے چارسو
گرنے لگے تو بیٹھ گیا اسپِ نیک خو　　اترے فرس سے ہو جو چکا خون سے وضو
عجلت نہ کیوں ہو بندگیِ بے نیاز میں
حسرت یہ ہے کہ سر جو کٹے تو نماز میں

سجدے میں شکر کے ہیں امامِ حجاز بس　　بس اے کمیتِ خامۂ ماتم طراز بس
اُٹھتے ہیں درمیاں سے حجاباتِ راز بس　　طاری ہے دل پہ عالمِ راز و نیاز بس
خم ہیں حضور پیشِ خدا سر لیے ہوئے
قاتل کھڑا ہے پشت پہ خنجر لیے ہوئے

ہر تار سازِ وقت کا جس سے لرز اُٹھا　　مضرابِ آخری کا بھی اب سن لو ماجرا
جنبش ہوئی لبوں کو تو حیرت ہوئی سوا　　شمرِ لعیں جو کاٹ رہا تھا رگِ قفا
جھک کر سنا تو حمدِ خدا کررہے تھے آپ
قاتل کی مغفرت کی دعا کررہے تھے آپ

اسرارِ عشق کیا کہوں قومِ جہول سے　　بس اختصار مظہری بہتر ہے طول سے
وابستہ گو نہیں ہوں خدا و رسولؐ سے　　ظاہر میں منحرف ہوں فروع و اصول سے
لیکن میں پوجتا ہوں شہِ مشرقین کو
کرتا ہے میرا کفر بھی سجدہ حسینؑ کو



Unit-3

اردو غزل

غزل کا فن

- غزل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں عورتوں سے یا عورتوں کی باتیں کرنا، عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا، رسی بنٹا۔
- عرب شعرا جب اپنی معشوقاؤں کا سراپا کھینچتے یا ان کے حسن و جمال کی تعریف کرتے یا ان کی محبت میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے تو اس عمل کو "تغزل" اور ایسے اشعار کو غزل کہتے تھے۔
- ابتداً غزل کا موضوع حسن و عشق ہی ہوتا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ اس کے موضوعات میں ہر طرح کے مضامین شامل ہوتے گئے۔
- غزل کے تمام مصرعے ایک ہی وزن اور ایک ہی بحر میں ہوتے ہیں۔
- دو کلموں کے حرکت و سکون میں برابر ہونے کو وزن کہتے ہیں۔
- لفظ مصرع کا معنی دروازے کا ایک پٹ ہے۔
- ردیف وہ لفظ یا الفاظ کا وہ مجموعہ ہے جسے ہر شعر کے آخر میں دہرایا جائے۔
- قافیہ ان حروف و حرکات کے مجموعے کو کہتے ہیں جو ہم آواز ہوتے ہیں مگر الفاظ بدلے ہوتے ہیں۔ قافیہ ردیف سے پہلے ہوتا ہے۔
- غزل کا پہلا شعر جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں مطلع کہلاتا ہے۔
- غزل کا آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے مقطع کہلاتا ہے۔
- مطلع اور مقطع کے علاوہ باقی اشعار فرد کہلاتے ہیں۔
- غزل میں مطلع اول کے بعد اگر دوبارہ مطلع کی طرح کوئی شعر آتا ہے تو اسے حسن مطلع، زیب مطلع اور مطلع ثانی کہتے ہیں۔
- غزل کے سب سے اچھے شعر کو بیت الغزل، شاہ بیت یا حاصل غزل کہتے ہیں۔
- غزل میں کم سے کم 5 شعر ہوتے ہیں اور زیادہ کی کوئی قید نہیں غزل کی خصوصیات میں سے اختصار و ایجاز ہے۔
- غزل کے اشعار میں مثنوی کی طرح خیالات کا تسلسل نہیں ہوتا بلکہ ہر شعر اپنی جگہ ایک مکمل اکائی ہوتا ہے۔ اور ہر شعر میں ایک پوری بات کہہ دی جاتی ہے۔
- غزل یا نظم کے ردیف و قافیہ کو زمین کہتے ہیں۔ یا وہ بحر اور ردیف و قافیہ جس کی غزل میں پابندی

کی جاتی ہے اس کو غزل کی ''زمین'' کہتے ہیں۔

- جدید غزل کے عناصر اربعہ۔ اصغر، جگر، فانی، حسرت ہیں۔

غزل کا آغاز اور ارتقا

- اردو میں غزل گوئی کی ابتدا فارسی شاعری کے اثر سے ہوئی ہے۔
- بعض لوگوں نے امیر خسرو کو اردو (ہندی) کا پہلا غزل گو شاعر قرار دیا ہے۔
- امیر خسرو سے منسوب ایک غزل بہت مشہور ہے جس کا ایک مصرع فارسی اور ایک مصرع اس وقت کی اردو زبان میں ہے یا آدھا مصرع فارسی ہے اور آدھا اردو۔

زحال مسکیں مکن تغافل درے نیناں بنالے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں! نہ کاہے لیہو لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چون زلف و روز وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

- اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ کو قرار دیا گیا ہے۔
- مسعود حسن رضوی نے (صدرالدین محمد خاں) فائز کو شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر بتایا ہے۔
- یاد رہے کہ اردو شاعری کی ابتدا شمالی ہند سے ہوئی ہے اور اردو کے پہلے شاعر مسعود سعد سلمان ہیں جیسا کہ امیر خسرو نے غرۃ الکمال میں تحریر کیا ہے لیکن ان کے کلام کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہے۔ امیر خسرو پہلے ایسے ہندوی کے شاعر ہیں جن سے اردو (ہندی) کلام منسوب ہے۔
- ولی دکنی اردو کا ایسا پہلا باقاعدہ غزل گو شاعر ہے جن کے کلام کو بنیاد بنا کر بعد کے شعرا نے غزل گوئی کی............

دکن میں اردو غزل کا ارتقا

* فیروز شاہ فیروزی * مشتاق * لطفی * قریشی بیدری
* حافظ دکنی * جعفر * گستاخ * فدائی
* فیروز * خیالی * شیخ محمد گجراتی * حسن شوقی
* محمد قلی قطب شاہ * وجہی * عبداللہ قطب شاہ * غواصی
* برہان الدین جانم * سید شہباز حسینی * خواجہ محمد دیدار فانی * نصرتی

* ہاشمی بیجاپوری * شاہ سلطان * ملک خوشنود * ولی
* سراج اورنگ آبادی

شمالی ہند میں غزل کا ارتقا

دہلی میں اردو غزل کا پہلا دور:

* آبرو * آرزو * ناجی * یک رنگ
* حاتم * مرزا مظہر جانِ جاناں * مضمون * فائز

میر اور سودا کا دور:

* میر * سودا * درد * قائم چاند پوری
* میر سوز * خواجہ میر اثر

لکھنؤ میں اردو غزل کا ارتقا:

* انشا * مصحفی * جرأت * ناسخ
* آتش * وزیر رند * امانت

اردو غزل کا عہد زریں:

* شاہ نصیر * غالب * مومن * ذوق
* ظفر * شیفتہ * مجروح (غالب کے شاگرد)

عہد غالب کے بعد غزل کا ارتقا:

* داغ * امیر مینائی * تسلیم * جلال
* اسیر * حالی * ثاقب * عزیز

جدید غزل کا دور:

* حسرت * فانی * اصغر * یگانہ
* جگر * شاد * چکبست * آرزو
* سیماب اکبرآبادی * آزاد لکھنوی * نظر * ریاض خیرآبادی
* عزیز لکھنوی * صفی لکھنوی * محروم * فراق

بعد کے دیگر غزل گو شعرا:

* ابن انشا * خلیل الرحمٰن اعظمی * ناصر کاظمی * مجروح سلطانپوری

* عبدالحمید عدم * سیف الدین سیف * باقی صدیقی * جمیل مظہری
* حبیب جالب * حفیظ ہوشیارپوری * صوفی غلام مصطفیٰ تبسم
* عزیز حامد مدنی * مجید امجد * منیر نیازی * احمد مشتاق
* سلیم احمد * باقری مہدی * ادا جعفری * مخمور سعیدی
* احمد فراز * وحید اختر * کشور ناہید * شاذ تمکنت
* شہریار * جون ایلیا * پروین شاکر * محمد علوی
* فہمیدہ ریاض * مظہر امام * عرفان صدیقی * اسعد بدایونی
* شہپر رسول * صلاح الدین نیر

غزل کے بارے میں ادبا و شعرا کے خیالات

- غزل جتنی بدنام ہے، اتنی ہی مجھے عزیز ہے : رشید احمد صدیقی
- غزل اردو شاعری کی آبرو ہے : رشید احمد صدیقی
- غزل شاعری نہیں تہذیب بھی ہے : رشید احمد صدیقی
- ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے : رشید احمد صدیقی
- شاعری کا نام آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے : رشید احمد صدیقی
- شاعری زیور کی محتاج ہے اور زیور غزل کا محتاج ہے : رشید احمد صدیقی
- غزل کو میں فن نہیں اردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں : رشید احمد صدیقی
- غزل ریزہ کاری میں مینا کاری ہے : رشید احمد صدیقی
- غزل شاعری نہیں عطر شاعری ہے : فراق گورکھپوری
- غزل مختلف پھولوں کی مالا ہے : فراق گورکھپوری
- غزل انتہاؤں کا ایک سلسلہ ہے : فراق گورکھپوری
- اگر تمام فنون لطیفہ احساسات و کائنات کا عطر ہے
  تو غزل اس عطر کا عطر ہے : فراق گورکھپوری
- غزل کا خمیر عشق و محبت ہے : شبلی نعمانی
- غزل نقاب پوش آرٹ اور چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا آرٹ ہے : آل احمد سرور
- غزل بڑی کافر صنف سخن ہے : آل احمد سرور

- غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے : کلیم الدین احمد
- غزل کی گردن بے تکلف ماردینی چاہیے : عظمت اللہ خاں
- غزل بے وقت کی راگنی ہے : حالی
- قصیدہ اور غزل شاعری کے ناپاک دفتر ہیں
  اور عفونت میں سنڈاس سے بھی بدتر ہیں : حالی
- "راقم الحروف کی طبیعت نے اپنے لیے اصناف سخن میں غزل کو اپنے حسب حال پاکر منتخب کر لیاہے۔"(حسرت موہانی)
- غزل کا مرتبہ گرچہ اول ہے ولے ہر بیت میرا ایک غزل ہے

  (ابن نشاطی)



اردو کے اہم غزل گو شعرا اور ان کی شاعری

اردو کا چاسر

ولی

(1668ء اورنگ آباد۔1720ء۔احمد آباد)

- نام ولی محمد تھا۔(جمیل جالبی، وہاب اشرفی، احتشام حسین سیدہ جعفر کے مطابق)
- لقب شمس الدین تھا۔
- ولی اورنگ آباد میں 1668ء میں پیدا ہوئے۔
- ولی کا انتقال 25-1720ء کے درمیان احمد آباد میں ہوا۔ کیوں کہ ان کے ایک ہم عصر شاعر فراقی نے اپنی ایک طویل نظم مسمیٰ ''مراۃ الحشر (تاریخ تصنیف 1720ء) میں اس وقت کے مرحوم شعرا کا ذکر کیا ہے جس میں ولی کا نام شامل نہیں ہے۔
- اہل دکن کے مطابق ولی محمد کا وطن اورنگ آباد اور اہل گجرات کے مطابق احمد آباد تھا۔
- ولی کے والد کا نام شریف محمد تھا۔
- ولی نے شیخ نورالدین سے اکتساب فیض کیا تھا۔
- ولی نے 1112ھ مطابق 1700ء میں اپنے عزیز ترین دوست سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا تھا اور یہاں سعداللہ گلشن سے ملاقات کی تھی۔
- ولی مغلیہ بادشاہ اورنگ زیب کے عہد میں دہلی گئے تھے۔
- ولی صرف ایک بار دہلی آئے تھے۔
- سعداللہ گلشن نے ولی کو دو مشورے دیے:(1) دکنی الفاظ کا استعمال کم کرو اور ان کی جگہ فارسی کے شیریں الفاظ کا انتخاب کرو(2) فارسی شاعری میں جو مضامین موجود ہیں انہیں اپنی زبان میں ادا کرو۔
- اردو غزل کی روایت کے برخلاف ولی نے اپنی محبوبہ کو عورت مان کر مخاطب بھی کیا ہے اور عورت کو عاشق کے روپ میں بھی پیش کیا ہے۔
- 1719 میں ولی کا دیوان دہلی آیا تھا۔(مصحفی کے مطابق)

اردو کے اہم غزل گوشعرا اور ان کی شاعری

اردو کا چاسر

ولی

(1668ء اورنگ آباد ۔1720ء ۔احمد آباد)

- نام ولی محمد تھا۔(جمیل جالبی، وہاب اشرفی، احتشام حسین سیدہ جعفر کے مطابق)
- لقب شمس الدین تھا۔
- ولی اورنگ آباد میں 1668ء میں پیدا ہوئے۔
- ولی کا انتقال 25۔1720ء کے درمیان احمد آباد میں ہوا۔ کیوں کہ ان کے ایک ہم عصر شاعر فراقی نے اپنی ایک طویل نظم مسمیٰ ''مراۃ الحشر (تاریخ تصنیف 1720ء) میں اس وقت کے مرحوم شعرا کا ذکر کیا ہے جس میں ولی کا نام شامل نہیں ہے۔
- اہل دکن کے مطابق ولی محمد کا وطن اورنگ آباد اور اہل گجرات کے مطابق احمد آباد تھا۔
- ولی کے والد کا نام شریف محمد تھا۔
- ولی نے شیخ نورالدین سے اکتساب فیض کیا تھا۔
- ولی نے 1112ھ مطابق 1700ء میں اپنے عزیز ترین دوست سید ابوالمعالی کے ہمراہ دہلی کا سفر کیا تھا اور یہاں سعداللہ گلشن سے ملاقات کی تھی۔
- ولی مغلیہ بادشاہ اورنگ زیب کے عہد میں دہلی گئے تھے۔
- ولی صرف ایک بار دہلی آئے تھے۔
- سعداللہ گلشن نے ولی کو دو مشورے دیے: (1) دکنی الفاظ کا استعمال کم کرو اور ان کی جگہ فارسی کے شیریں الفاظ کا انتخاب کرو (2) فارسی شاعری میں جو مضامین موجود ہیں انہیں اپنی زبان میں ادا کرو۔
- اردو غزل کی روایت کے برخلاف ولی نے اپنی محبوبہ کو عورت مان کر مخاطب بھی کیا ہے اور عورت کو عاشق کے روپ میں بھی پیش کیا ہے۔
- 1719 میں ولی کا دیوان دہلی آیا تھا۔(مصحفی کے مطابق)

- 1719ء میں ولی کا دیوان دہلی آنے سے دہلی میں اردو شاعری کا با قاعدہ آغاز ہوا تھا۔
- اس وقت دلی کا صوبہ دار محمد یار خاں تھا۔
- ولی نے اپنے دیوان میں اپنے ہندو دوستوں، امرت لال، گوبند لال، کھیم داس اور بنود کا ذکر کیا ہے۔
- ولی کے مسلم دوست جن کا ذکر ان کے دیوان میں ملتا ہے: سید ابوالمعالی، شمس الدین، سراج، کامل واکمل، محمد مراد اور محمد یار خاں۔
- ولی نے اپنے کلام میں ایک ہم عصر فقیر اللہ آزاد کا بھی ذکر کیا ہے۔
- ولی کا ہم عصر شاعر فراقی تھا جس سے ولی کی ادبی چشمک تھی۔
- ولی کا مقابلہ چاسر سے کیا جاتا ہے۔ اور ولی کو اردو کا چاسر کہا جاتا ہے۔
- سب سے پہلا با قاعدہ دیوان ولی کے دیوان کو مانا جاتا ہے۔

ولی کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- محمد حسین آزاد نے ولی کو اردو شاعری کا بابا آدم کہا ہے۔
- محمد حسین آزاد نے ولی کو اردو شاعری میں وہی مقام دیا ہے جو انگریزی شاعری میں چاسر اور فارسی شاعری میں رودکی کو حاصل ہے۔
- بقول آزاد ولی نے ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ آج تک زمانے نے کئی پلٹے کھائے مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔
- ولی آئندہ دو سو سال کے نظام شمسی کا وہ سورج ہے جس کے دائرہ کشش میں اردو شاعری کے مختلف سیارے گردش کرتے ہیں: (جمیل جالبی)
- میر نے ولی کو مسلم الثبوت استاد قرار دیا ہے۔
- میر نے ولی کو ریختہ کا استاد کہا ہے۔
- نکات الشعرا میں میر نے ولی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ شیطان سے زیادہ مشہور ہے۔
- میر نے ولی کے متعلق لکھا ہے:

  معشوق جوا پنا تھا باشندہ دکن کا تھا

- ولی کے کلام کو شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان لسانی وادبی پل قرار دیا گیا ہے۔
- ولی اورنگ آبادی اپنی رحلت کے بعد بھی چلتے پھرتے رہے اور احمد آباد میں مزار کی صورت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔ (یوسف ناظم)

کلیاتِ ولی سے ردیف الف، ب اور ی/ یے کی ابتدائی پانچ پانچ غزلیں

ردیف 'الف'

(1)

کیتا ہوں ترے نانوں کو میں ورد زباں کا — کیتا ہوں ترے شکر کو عنواں بیاں کا
جس گرد اُپر پانوں رکھیں تیرے رسولاں — اُس گرد کوں میں کحل کروں دیدۂ جاں کا
مجھ صدق طرف عدل سوں اے اہلِ حیا دیکھ — تجھ علم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا
ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی — یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا
کیا سہم ہے آفات قیامت ستی اُس کوں — کھایا ہے جو کی تیر تجھ ابرو کی کماں کا
جاری ہوئے آنجھو مرے یو سبزۂ خط دیکھ — اے خضر قدم! سیر کر اس آبِ رواں کا
کہتا ہے ولی دل ستی یوں مصرع رنگیں — ہے یاد تری مجھ کوں سبب راحتِ جاں کا

(2)

دو صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ — آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ
ناز دیتا نہیں گر رخصت گل گشت چمن — اے چمن زار حیا دل کے گلستان میں آ
عیش ہے عیش کہ اس مہ کا خیال روشن — شمع روشن کیا مجھ دل کے شبستاں میں آ
یاد آتا ہے مجھے جب دو گل باغ وفا — اشک کرتے ہیں مکاں گوشۂ دامان میں آ
موج بے تابیِ دل اشک میں ہوئی جلوہ نما — جب بسی زلف صنم طبع پریشان میں آ
نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں — دفتر درد بسا عشق کے دیوان میں آ
پنجۂ عشق نے بیتاب کیا جب سوں مجھے — چاک دل تب سوں بسا چاک گریبان میں آ
دیکھ اے اہل نظر سبزۂ خط میں لب لعل — رنگ یاقوت چھپا ہے خط ریحاں میں آ
حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالب عشق ہوا صورت انسان میں آ
شیخ یاں بات تری پیش نہ جاوے ہرگز — عقل کوں چھوڑ کے مت مجلس رندان میں آ
درد منداں کو بجز درد نہیں صید مراد — اے شہ ملک جنوں غم کے بیابان میں آ
حاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بد خو — دیو مختار ہوا ملک سلیمان میں آ
چشمۂ آب بقا جگ میں کیا ہے حاصل — یوسف حسن ترے چاہ زنخدان میں آ
جگ کے خوباں کا نمک ہو کے نمک پروردہ — چھپ رہا آ کے ترے لب کے نمک دان میں آ

بس کہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں
درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ
غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حال ولی
ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں

(3)

اے گل عذار غنچہ دہن تک چمن میں آ
گل سر پہ رکھ کے شمع نمن انجمن میں آ
جیوں طفل اشک بھاگ نکو مجھ نظر ستی
اے نور چشم نور نمط مجھ نین میں آ
کب لگ اپس کے غنچۂ مکھ کو رکھے گا بند
اے نو بہار باغ محبت سخن میں آ
تا گل کے رو سے رنگ اڑے اوس کی نمن
اے آفتابِ حسن ٹک یک تو چمن میں آ
تجھ عشق سوں کیا ولی دل کوں بیت غم
سرعت ستی اے معنیِ بے گانہ من میں آ

(4)

وہ نازنیں ادا میں اعجاز ہے سراپا
خوبی میں گل رخاں سوں ممتاز ہے سراپا
اے شوخ تجھ نین میں دیکھا نگاہ کر کر
عاشق کے مارنے کا انداز ہے سراپا
جگ کے ادا شناساں ہے جن کی فکر عالی
تجھ قد کوں دیکھ بولے یو ناز ہے سراپا
کیوں ہو سکیں جگت کے دلبر ترے برابر
تو حسن ہور ادا میں اعجاز ہے سراپا
گاہے اے عیسوی دم یک بات لطف سوں کر
جاں بخش مجھ کو تیرا آواز ہے سراپا
مجھ پر ولی ہمیشہ دل دار مہرباں ہے
ہر چند حسب ظاہر طناز ہے سراپا

(5)

کتاب الحسن کا یہ مکھ صفا تیرا صفا دستا
ترے ابرو کے دو مصرع سوں اس کا ابتدا دستا
ترا مکھ حسن کا دریا و موجاں چین پیشانی
اُپر ابرو کی کشتی کے یوں تل جیو ناخدا دستا
ترے لب ہیں بہ رنگ حوض کوثر مخزن خوبی
یہ خال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا
اشاراتِ آنکھیاں سوں گرچہ ہوں بیمار میں لیکن
ترے لب اے مسیح وقت قانون شفا دستا
ہوا جو گوہر دل غرق بحر حسن، ہے نایاب
ز بس دریائے حسنِ دلبراں بے انتہا دستا
بیاں اس کی نزاکت ہور لطافت کا لکھوں تا کے
سراپا محشر خوبی منیں ناز و ادا دستا
یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن
مطول کے معانی کا تمامی مدعا دستا

ردیف 'ب'

(1)

ترے جلوے سوں اے ماہِ جہاں تاب — ہوا دل سر بسر دریائے سیماب
ترے مکھ کے سُرُج کوں دیکھ جیوں برف — ہوئے ہیں عاشقاں سر تا قدم آب
رکھوں جس خواب میں تجھ لب اُپر لب — مجھے شکر سوں شیریں تر ہے دو خواب
تری نیناں دو قاتل ہیں کہ جن پاس — دو ابرو کی ہیں دو تیغ سیہ تاب
ولی تجھ سوز میں اے آتشیں خو
سراپا ہے بہ رنگ شعلۂ بے تاب

(2)

کیوں ہو سکے جہاں میں ترا ہم سر آفتاب — تجھ حسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب
دیکھا جو تجھ کوں آپ سوں روشن جگت منیں — شرموں لیا نقاب زریں مکھ پر آفتاب
آیا ہے نقل لینے ترے مکھ کتاب کی — تار خطوط سیتی بنا مسطر آفتاب
گرمی سوں بے قرار ہو نکلیا سینے کوں کھول — تجھ عشق کا پیا ہے مگر ساغر آفتاب
ہندو سُرَج کوں دور سوں نت پوجتے ولے — ہندوے زلف کے ہے بغل بھیتر آفتاب
جن نے ترے جمال پہ کیتا ہے یک نظر — دیکھا نئیں وہ پھر کے نظر بھر کر آفتاب
پوجا کوں تجھ درس کی ہو جوگی فلک اُپر — نکلیا ہے پہن جامۂ خاکستر آفتاب
تجھ مکھ کے آفتاب اُپر گر کرے نگاہ — پنہاں ہو ہر نظر ستی جیوں اختر آفتاب
جگ میں ولی سو کس کوں برابر کہے ترے
ذرّے سوں ہے نزدیک ترے کمتر آفتاب

(3)

ترے مکھ پر اے نازنیں یو نقاب — جھلکتا ہے جیوں مطلعِ آفتاب
ادا فہم کے دل کی تسخیر کوں — ترا قد ہے جیوں مصرع انتخاب
بجا ہے ترے حسن کی تاب سوں — تری زلف کھاتی ہے گر پیچ و تاب
نظر کرکے تجھ مکھ کی صافی اُپر — ہوئی شرم سوں آرسی غرقِ آب
ترے عکس پڑنے سوں اے گل بدن — عجب نئیں اگر آپ ہووے گلاب
ترے وصل میں اس قدر ہے نشاط — کہ مخمل کوں آئے سوں راحت خراب

کریں بخت میرے اگر ٹک مدد
ولی اُس سجن سوں ملوں بے حجاب

(4)

جب سوں وہ نازنیں کی میں دیکھا ہوں چھب عجب
دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب
جاتا ہے دن تمام اسی مکھ کی یاد میں
ہوتا ہے فکر زلف میں احوال شب عجب

قطعہ

بے تاب ہو کے مثل گدایاں نزدیک جا — بے باک ہو کے تب یو کیا میں طلب عجب
وہ نین سوں ترے ہے دو بادام کا سوال — سن یو سوال دل میں رہا پستہ لب عجب
بولیا مری نگاہ کی قیمت ہے دو جہاں — جس دیکھنے سوں دل میں ترے ہے طرب عجب
اس دولتِ عظیم کوں یوں مفت مانگنا — لگتی ہے بات مجکو تری بے ادب عجب
کیتا میں اس سوال میں دوجا بھی اک سوال — کر بہرہ مند لب سوں کہ تیرے ہیں لب عجب
یک بار اس سوال میں سن یہ دوجا سوال — دل میں رہا اپس کے دو شیریں لقب عجب
اوّل تو شوخ آ کے غضب میں غصہ کیا — سر تا قدم دو ناز اٹھا یو غضب عجب
جیو میں اپس کی ہمت عالی پہ کر نظر — شیریں لباں سوں اپنے چکھایا رطب عجب

اس شعر کی یہ طرح نکالا ہے جب ولی
یو اختراع سن کے رہے دل میں سب عجب

(5)

ملیا دو گل بدن جس کوں اُسے گلشن سوں کیا مطلب — جو پایا وصل یوسف اُس کوں پیراہن سوں کیا مطلب
مجھے اسباب خود بینی سوں دائم عکس ہے دل میں — کیا جو ترک زینت کوں اسے درپن سوں کیا مطلب
سخن، صاحب کے سن کے ملنے کی ہوس مت کر — جواہر جب ہوئے حاصل تو پھر معدن سوں کیا مطلب
عزیزاں باغ میں جانا نپٹ دشوار ہے مجھ کوں — گلی گل روکی پایا ہوں مجھے گلشن سوں کیا مطلب

ولی جنت منیں رہنا نیں درکار عاشق کوں
جو طالب لامکاں کا ہے اسے مسکن سوں کیا مطلب

ردیف ی

(1)

منگا کے پی کوں لکھوں میں اپس کی بے تابی   لیا نَین کی سفیدی سوں کاغذ آبی
لکھا پلک کے قلم سوں میں اے کماں ابرو   جگر کے خون سوں تجھ تیغ کی سیہ تابی
ہوا ہے جب سوں دو نور نظر انکھاں سوں جدا   نہیں نظر میں مری تب سوں غیر اَبے خوابی
نگہ کے جھاڑ کا پھل تو ہے اے بہار کرم   ترے جمال کے گلشن میں بَت ہے سیرابی
ولؔی خیال میں اس مہ کوں جو کوئی کہ رکھے
تو خواب میں نہ دسے اس کوں غیر مہتابی

(2)

آیا دو شوخ باندھ کے خنجر کمر ستی   عالم کوں قتل عام کیا اک نظر ستی
طاقت رہے نہ بات کی پھر انفعال سوں   تشبیہ تجھ لباں کوں اگر دوں شکر ستی
غم نے لیا ہے تب سوں مجھے پیچ و تاب میں   باندھا ہے جب سوں جیوں کوں اس مو کمر ستی
غم کے چمن کوں بادِ خزاں کا نہیں ہے خوف   پہنچا ہے اس کوں آب مری چشم تر ستی
یک بار جا کے دیکھ ولؔی اس دَہن کے تئیں
لکھتا ہوں جس کے وصف کوں آب گہر ستی

(3)

اُس سوں رکھتا ہوں خیالِ دوستی   جس کے چہرے پر ہے خال دوستی
خشک لب دو کیوں رہے عالم منیں   جس کوں حاصل ہے زلال دوستی
شمع بزم اہل معنی کیوں نہ ہوئے   جس اُپر روشن ہے حال دوستی
اس سخن سوں آشنا ہے دردمند   دردِ دوری ہے وبال دوستی
اے سجن تجھ مکھ کے مصحف میں مجھے   دیکھنا بر جا ہے فال دوستی
فیض سوں تجھ قد کہ اے رنگیں بہار   تازہ و تر ہے نہالِ دوستی
اے ولؔی ہر آن کر مشق وفا
ہے وفاداری کمال دوستی

(4)

جو کئی ہر رنگ میں اپنے کو شامل کر نئیں گنتے   ہمن سب عاقلاں میں اس کوں عاقل کر نئیں گنتے

مدرس مدرسے میں گر نہ بولے درس درشن کا — تو اس کوں عاشقاں اُستاد کامل کر نئیں گنتے
خیالِ خام کوں جو کئی کہ دھووے صفحۂ دل سوں — تصوف کے مطالب کوں دو مشکل کر نئیں گنتے
جو بسمل نئیں ہوا تیری نین کی تیغ سوں بسمل — شہیداں جگ کے اُس بسمل کوں بسمل کر نئیں گنتے
پرت کے پنتھ میں جو کئی سفر کرتے ہیں رات ہور دن — وہ دنیا کوں بغیر از چاہ بابل کر نئیں گنتے
نہیں جس دل میں پی کی یاد کی گرمی کی بے تابی — تو ویسے دل کوں سارے دلبراں دل کر نئیں گنتے
رہے محروم تیری زلف کے مہرے سوں وو دائم — جو کئی تیری نین کوں زہر قاتل کر نئیں گنتے
نہ پاوے وہ دنیا میں لذت دیوانگی ہر گز — جو تجھ زلفاں کے حلقے کوں سلاسل کر نئیں گنتے

بغیر از معرفت سب بات میں گر کئی اچھے کامل
وؔلی سب اہل عرفاں اس کوں کامل کر نئیں گنتے

(5)

بزرگاں کن جو کئی آپس کوں ناداں کر نئیں گنتے — سخن کے آشنا اُن کوں سخن داں کر نئیں گنتے
طریقہ عشق بازاں کا عجب نادر طریقہ ہے — جو کئی عاشق نئیں اُس کوں مسلماں کر نئیں گنتے
گریباں جو ہوا نئیں چاک بے تابی کے ہاتھوں سوں — گلے کا دام ہے اس کوں گریباں کر نئیں گنتے
عجب کچھ بوجھ رکھتے ہیں سر آمد بزم معنی کے — تواضع نئیں ہ جس میں اس کوں انساں کر نئیں گنتے

ولی راہِ محبت میں وفاداری مقدم ہیوفا نئیں جس
میں اس کوں اہل ایماں کر نئیں گنتے



خدائے سخن

میر تقی میر

(پیدائش 1135ھ مطابق 1722ء۔ وفات 1810ء)

- میر کا نام محمد تقی تھا اور تخلص میر۔
- میر تقی میر 36-1135ھ مطابق 23-1722ء میں اکبر آباد (آگرہ) میں پیدا ہوئے۔
- میر کا انتقال 20 ستمبر 1810ء میں لکھنؤ میں ہوا اور وہیں مدفون ہیں۔
- میر کے والد کا نام محمد علی تھا جنھیں لوگ علی متقی کہہ کر پکارتے تھے اور جن کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میر صرف 11 سال کے تھے۔
- میر کے دو بھائی تھے۔ ایک حافظ محمد حسن (سوتیلے) جو میر سے بڑے تھے، دوسرے محمد رضی (سگے) جو میر سے چھوٹے تھے۔
- میر کے منھ بولے چچا امان اللہ تھے۔ جنھیں علی متقی نے میر کو سات برس کی عمر میں تربیت کے لیے سپرد کیا تھا۔
- میر کے استاد سوتیلے بھائی کے ماموں خان آرزو تھے۔
- میر نے سعادت امروہوی کے مشورے پر شاعری شروع کی تھی۔
- میر کے دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے کا نام فیض علی فیض تھا اور چھوٹے بیٹے کا نام حسن عسکری عرش تھا۔
- میر کے گھر پر مہینے کی ہر 15 تاریخ کو مشاعرہ ہوتا تھا۔
- میر اپنے والد کے انتقال کے بعد 1734ء میں دہلی گئے تھے جہاں خواجہ محمد باسط کے چچا صمصام الدولہ نے ایک روپیہ یومیہ مقرر کیا تھا۔
- میر کو فورٹ ولیم کالج بلایا گیا تھا لیکن عمر وصحت کی وجہ سے انھوں نے انکار کر دیا تھا۔
- میر آصف الدولہ کی دعوت پر 1781ء میں لکھنو گئے تھے۔
- حاتم کے شاگرد بقا سے میر کی ادبی چشمک رہی ہے اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجویں کہا ہیں۔ میر کی ہجویہ مثنوی ''اژدرنامہ'' اسی زمانے کی تخلیق ہے۔
- اژدرنامہ کا جواب حاتم کے شاگرد محمد امان نثار نے دیا ہے۔
- میر نے لکھنؤ میں اکتیس برس آرام سے گذارے ہیں۔

- میر سے متعلق سب سے بڑا کام شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا ہے۔ فاروقی نے میر سے متعلق "شعر شور انگیز (چار جلدوں میں)" لکھی ہے اور اسی کتاب پر شمس الرحمٰن فاروقی کو سرسوتی سمان ملا ہے۔
- میر تقی میر کے والد میر کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ: "بیٹا عشق کرو، عشق ہی اس کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ہے۔ بغیر عشق کے زندگی وبال ہے۔ عشق میں جی جان کی بازی لگا دینا ہی کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے۔ عشق ہی جلا کر کندن بنا دیتا ہے۔"
- میر نے اپنے کلام کے بارے میں کہا ہے کہ میرا کلام کوئی نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اس زبان سے واقف نہ ہو جو دلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ہے۔

القاب وخطابات

- خدائے سخن، ناخدائے سخن، سرتاج شعرائے اردو، ریختہ گویانِ ہند کا استاد اعظم، شاعر بے دماغ، قنوطی شاعر، فتنۂ روزگار۔

میر کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- قائم چاند پوری نے میر کو "میر ضمیر" کہا ہے۔
- میر واسوخت کے موجد ہیں۔ (آزاد)
- میر اردو کے شیخ سعدی ہیں۔ ان کا کلام اکسیر شاعری ہے۔ (رام بابو سکسینہ)
- میر کی شاعری دلی اور دل کا مرثیہ بن گئی ہے۔ (خواجہ احمد فاروقی)
- میر کا کلام آہ ہے اور مرزا کا کلام واہ۔ (خواجہ باسط)
- میر کے اشعار کی داخلیت بھیتری چوٹ ہے۔ (فراق)
- میر کے غم میں زخم ہی مرہم بن جاتے ہیں۔ (فراق)
- ہندوستان میں میر اپنے وقت کے سب سے بڑے ہندوستانی، سب سے بڑے انسان اور سب سے بڑے شاعر تھے۔ (فراق)
- آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں (غالب)

مولوی عبدالحق کے مرتب کردہ 'انتخابِ میر' کی ابتدائی بیس غزلیں

(1)

تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا ۔۔۔ خورشید میں بھی اس ہی کا ذرہ ظہور تھا
ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا ۔۔۔ پیدا ہر ایک نالے سے شورِ نشور تھا

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں
معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دُور تھا

آتش بلند دل کی نہ تھی ورنہ اے کلیم
یک شعلہ برق خرمنِ صد کوہِ طور تھا

مجلس میں رات ایک ترے پرتوے بغیر
کیا شمع کیا پتنگ ہر اک بے حضور تھا

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر
اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا

منعم کے پاس قاقم و سنجاب تھا تو کیا
اس رند کی بھی رات کٹی جو کہ جو عور تھا

کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آگیا
یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا

کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
میں بھی کبھو کسو کا سرِ پر غرور تھا

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میر
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

(2)

کیا میں بھی پریشانی خاطر سے قریں تھا
آنکھیں تو کہیں تھیں دل غم دیدہ کہیں تھا

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن
ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں تھا

شب کوفت سے ہجراں کی جہاں تن پہ رکھا ہاتھ
جو درد و الم تھا سو کہے تو کہ وہیں تھا

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا
جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیرِ نگیں تھا

مسجد میں امام آج ہوا آ کے وہاں سے
کل تک تو یہی میر خرابات نشیں تھا

(3)

لطف اگر یہ ہے بتاں صندلِ پیشانی کا
حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

درہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں
سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

جان گھبراتی ہے اندوہ سے تن میں کیا کیا
تنگ احوال ہے اس یوسفِ زندانی کا

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

اس کا منھ دیکھ رہا ہوں سو وہی دیکھوں ہوں
نقش کا سا ہے سماں میری بھی حیرانی کا

بت پرستی کو تو اسلام نہیں کہتے ہیں
معتقد کون ہے میر ایسی مسلمانی کا

(4)

جامۂ ہستیِ عشق اپنا مگر کم گھیر تھا　　دامنِ تر کا مرے دریا ہی کا سا پھیر تھا
دیر میں کعبہ گیا میں خانقہ سے اب کی یار　　راہ سے میخانے کی اس راہ میں کچھ پھیر تھا

بلبلوں نے کیا گل افشاں میر کا مرقد کیا
دور سے آیا نظر تو پھولوں کا اک ڈھیر تھا

(5)

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا　　چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے　　آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھ کو ابرِ کرم کی کیا خجل　　اے چشم جوشِ اشکِ ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف　　اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا



کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات　　کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
جگر ہی میں یک قطرۂ خوں ہے سرشک　　پلک تک گیا تو تلاطم کیا

(6)

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہدِ جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند　　یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی　　چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ کیسا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام　　کوچے کے اس کے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے　　رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

(7)

چمن میں گل نے جو کل دعویٔ جمال کیا　　جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو　　چمن کو یمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

(8)

منعم نے بنا ظلم کی رکھ گھر تو بنایا — پر آپ کوئی رات ہی مہمان رہے گا
چھوٹوں کہیں ایذا سے لگا ایک ہی جلاد — تا حشر مرے سر پہ یہ احسان رہے گا
چمٹے رہیں گے دشتِ محبت میں سر و تیغ — محشر تئیں خالی نہ یہ میدان رہے گا
جانے کا نہیں شور سخن کا مرے ہرگز — تا حشر جہاں میں مرا دیوان رہے گا

(9)

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا — کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت — اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی — اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا
ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا — انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا
اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو — آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا
صد موسم گل ہم کو تہ بالِ ہی گذرے — مقدور نہ دیکھا کبھو بے بال و پری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغ سحری کا

(10)

منہ تکا ہی کرے یہ جس تس کا — حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے — دل ہوا ہے چراغ مفلس کا
تھے برے مغبچوں کے تیور لیک — شیخ میخانے سے بھلا کھسکا
فیض اے ابر چشم تر سے اٹھا — آج دامن وسیع ہے اس کا

تاب کس کو جو حال میرؔ سنے
حال ہی اور کچھ ہے مجلس کا



دعوی کیا تھا گل نے ترے رخ سے باغ میں
سیلی لگی صبا کی سو منہ لال ہوگیا

(11)

پوچھا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا — اپنے کیے کا اس نے ثمرہ شتاب دیکھا

جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت
اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھو ہو
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

(12)

مر رہتے جو گل بن تو سارا یہ خلل جاتا
نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا
میں گریۂ خونیں کو روکے ہی رہا ورنہ
ایک دم میں زمانے کا یاں رنگ بدل جاتا
بن پوچھے کرم سے وہ جو بخش نہ دیتا تو
پرسش میں ہماری ہی دن حشر کا ڈھل جاتا

(13)

مانند شمع مجلس شب اشکبار پایا
القصہ میرؔ کو ہم بے اختیار پایا
احوال خوش انھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا
شہر دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں
آخر اجاڑ دیتا اس کا قرار پایا
اتنا نہ دل سے ملتے نا دل کو کھوکے رہتے
جیسا کیا تھا ہم نے ویسا ہی یار پایا
کیا اعتبار یاں کا پھر اس کو خوار دیکھا
جس نے جہاں میں آکر کچھ اعتبار پایا
آہوں کے شعلے جس جا اٹھے ہیں تھے میر سے شب
واں جاکے صبح دیکھا مشتِ غبار پایا

(14)

یا روئے یا رُلایا اپنی تو یونہی گزری
کیا ذکر ہم صفیراں، یارانِ شادماں کا
قیدِ قفس میں ہیں تو خدمت ہے نا لگی کی
گلشن میں تھے تو ہم کو منصب تھا روضہ خواں کا
پوچھو تو میر سے کیا کوئی نظر پڑا ہے
چہرہ اُتر رہا ہے کچھ آج اُس جواں کا

(15)

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
اگرچہ گوشہ گزیں ہوں میں شاعروں میں میر
پہ میرے شور نے روے زمیں تمام لیا

(16)

صیر کے قابل ہے دل صد پارہ اس نخچیر کا
جس کے ہر ٹکڑے میں ہو پیوست پیکاں تیر کا
جب سب کھلا باغ جہاں الا وہ حیران و خفا
جس کو دل سمجھے تھے ہم سو غنچہ تھا تصویر کا

کیوں کہ نقاش ازل نے نقش ابرو کا کیا　　کام ہے اک تیرے منہ پر کھینچنا شمشیر کا
رہ گزر سیل حوادث کا ہے بے بنیاد دہر　　اس خرابے میں نہ کرنا فکر تم تعمیر کا
بس طبیب اٹھ جا مری بالیں سے مت دے دردِ سر　　کام یاں آخر ہوا اب فائدہ تدبیر کا
کس طرح سے مانیے یارو کہ یہ عاشق نہیں
رنگ اڑا جاتا ہے ٹک چہرہ تو دیکھو میر کا



......کرے ہے بحرِ جہاں میں ابھی تو تو　　جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا
...... تھے دستِ بلبل و دامانِ گل بہم　　صحنِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا
ٹک دیکھ آنکھیں کھول کے اس دم کی حسرتیں
جس دم یہ سوجھے گی کہ یہ عالم بھی خواب تھا

(17)

گل کو محبوب میں قیاس کیا　　فرق نکلا بہت جو باس کیا
دل نے ہم کو مثالِ آئینہ　　ایک عالم کا روشناس کیا
کچھ نہیں سوجھتا ہمیں اُس بن　　شوق نے ہم کو بے حواس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی　　کیا پتنگے نے التماس کیا
ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں
میر کو تم عبث اُداس کیا



داغِ فراق و حسرتِ وصل آرزوئے شوق　　میں ساتھ زیرِ خاک بھی ہنگامہ لے گیا

(18)

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جاے گا　　غافل نہ رہ کہ قافلہ یک بار جائے گا
موقوف حشر پر ہے سو آتے بھی وے نہیں　　کب درمیاں سے وعدۂ دیدار جائے گا
آنے میں اُس کے حال ہوا جائے ہے تغیر　　کیا حال ہوگا پاس سے جب یار جائے گا



جو سنا ہشیار اُس مے خانے میں تھا بے خبر　　شوق ہی باقی رہا ہم کو دل آگاہ کا
باندھ مت رونے کا تارا اے ناقباحت فہم چشم　　اس سے پایا جائے ہے سر رشتہ جی کی چاہ کا

❁

ہے اس کے حرفِ زیر لبی کا سبھوں میں ذکر
کیا بات تھی کہ جس کا یہ بستار ہوگیا

❁

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

گرمیٔ عشق مانعِ نشو ونما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

مستی میں چھوڑ دیر کو کعبے چلا تھا میں
لغزش بڑی ہوئی تھی و لیکن سنبھل گیا

❁

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کا

تڑپ کے مرنے سے دل کے کہ مغفرت ہو اسے
جہاں میں کچھ تو رہا نام بے قراروں کا

تڑپ کے خرمنِ گل پر کہیں گرائے بجلی
جلانا کیا ہے مرے آشیاں کے خاروں کا

تمھیں تو زہد و ورع پر بہت ہے اپنے غرور
خدا ہے شیخ جی ہم بھی گناہ گاروں کا

(19)

گزرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا
خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں
مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

بدنام و خوار و زار و نزار و شکستہ حال
احوال کچھ نہ پوچھیے اس رو سیاہ کا

ظالم زمیں سے لوٹتا دامن اٹھا کے چل
ہوگا کمیں میں ہاتھ کسو داد خواہ کا

اے تاج شہ نہ سر کو فرو لاؤں تیرے پاس
ہے معتقد فقیر نمد کی کلاہ کا

(20)

دل سے شوقِ رخ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا

سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا

سبحہ گرداں ہی میرؔ ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا



حیوان ظریف

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ

(1797ء۔1869ء)

- غالب کا نام اسداللہ خاں اور عرفیت مرزا نوشہ تھی۔
- ابتداً اسد تخلص کرتے تھے لیکن جب یہ سنا کہ کوئی اور شاعر بھی اسد تخلص رکھتا ہے تو خود کو ممتاز کرنے کے لیے اس وقت سے غالبؔ تخلص اختیار کرلیا۔
- غالبؔ 1212ھ مطابق 27ردسمبر 1797ء کو آگرہ میں پیدا ہوئے۔
- 15رفروری 1869ء کو دہلی میں وفات پاکر بستی حضرت نظام الدین میں مدفون ہوئے۔
- غالب کے والد کا نام عبداللہ بیگ اور عرفیت مرزا دولہا تھی۔
- غالب کے دادا کا نام قوقان بیگ تھا جو شاہ عالم کے زمانے میں ایران سے دہلی آئے تھے۔
- غالب کا سلسلہ نسب افراسیاب بادشاہ توران تک پہنچتا ہے۔
- غالب دو بھائی تھے۔ دوسرے بھائی کا نام مرزا یوسف خاں تھا۔
- 1801ء میں جب غالب کی عمر چار سال کی تھی تو گولی لگنے کی وجہ سے والد کا انتقال ہوا تھا۔
- والدہ کا نام عزت النسا تھا۔
- غالب کے چچا کا نام مرزا نصراللہ بیگ تھا۔ چچا نے ہی غالب کی پرورش کی تھی۔
- 1806ء میں جب غالب کی عمر نو (9) سال تھی چچا نصراللہ بیگ بھی وفات پا گئے۔
- ابتدائی تعلیم غالب نے شیخ معظم سے حاصل کی۔
- فارسی زبان کی تعلیم غالب نے عبدالصمد سے حاصل کی جو پارسی نژاد تھا اور جس کا اصل نام ہُرمُزد تھا۔
- غالب کی شادی الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے 7رجب 1225ھ مطابق 1810ء میں ہوئی تھی۔
- غالب کے سات (7) بچے پے در پے ہوئے تھے اور ساتوں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین خاں عارفؔ کے دو بچوں پہلے حسین علی خاں جو چھوٹا لڑکا تھا اسے گود لیا پھر بڑے لڑکے باقر علی کو گود لیا تھا۔
- غالب نے دہلی کا سفر 1812ء میں کیا تھا اور تقریباً پچاس برس دہلی میں قیام کیا تھا۔

- غالب پنشن کی بحالی کی غرض سے کلکتہ کے لیے1826ء میں روانہ ہوئے تھے اور فروری 1828 میں کلکتہ پہنچے تھے۔(بحوالہ مونوگراف۔ص15)
- غالب پٹنہ اور مرشد آباد کے راستے کلکتہ پہنچے تھے۔
- حالؔی کے مطابق کلکتہ میں پورے دو برس قیام کیا تھا۔

(یادگار غالب ص:18۔از حالی۔ناشر اتر پردیش اردو اکادمی)

- اور کچھ لوگوں نے قیام کلکتہ ایک سال نو مہینے بھی لکھا ہے۔
- غالب نے کوئی لمبا سفر کلکتہ کے سوا نہیں کیا تھا۔
- غالب نے کلکتہ کے سفر کے دوران کان پور، لکھنؤ اور بنارس میں بھی قیام کیا تھا۔اس زمانے میں لکھنؤ کے فرماں روا نصیرالدین حیدر تھے اور نائب روشن الدولہ۔
- غالب نے لکھنؤ میں مارچ 1826ء سے لے کر جون 1827ء تک قریب سوا پندرہ مہینے قیام کیا تھا۔(توقیت غالب۔ص:107)
- غالب کی ملاقات لکھنؤ میں میر انیس سے ہوئی تھی۔
- غالب دو مرتبہ رام پور گئے تھے پہلی مرتبہ 19 جنوری1860ء میں نواب یوسف حسن خاں کی دعوت پر اور دوسری مرتبہ 1865ء میں نواب یوسف حسن خاں کے انتقال کے بعد تعزیت کے لیے۔
- انگریزی حکومت سے غالب کو700 روپے سالانہ پنشن ملتی تھی۔
- بہادر شاہ ظفر کی طرف سے غالب کو50 روپے ماہانہ ملتے تھے۔
- نواب رام پور کی سرکار سے غالب کو100 روپے ماہانہ ملتے تھے۔
- غالب کو شطرنج اور جوا کھیلنے کی بہت عادت تھی۔
- غالب قمار بازی یعنی جوا کھیلنے کے جرم میں دو بار جیل گئے تھے۔
- پہلی مرتبہ 1841ء میں100 روپے جرمانہ اور چار ماہ قید کی سزا ہوئی۔
- دوسری بار 1847ء میں200 روپے جرمانہ اور چھ ماہ کی قید کی سزا ہوئی۔
- حالی کے مطابق من جملہ چھ مہینے میں سے 3رمہینے غالب نے قید میں گذارے۔
- غالب نے قید میں ایک فارسی ترکیب بند اپنے حسب حال لکھ کر دوستوں کو بھیجا تھا جس نظم میں کل سات بند اور ہر بند میں بارہ بارہ اشعار ہیں۔
- مرزا غالب نے کبھی پڑھنے کے لیے نہ کوئی کتاب خریدی تھی اور نہ ہی رہنے کے لیے کوئی مکان۔بلکہ زندگی بھر کتاب اور مکان دونوں کرایہ پر لے کر کام چلاتے رہے۔

- غالب نے گیارہ برس کی عمر میں 1808-1807ء میں شاعری شروع کی تھی۔اور تخلص اسد اختیار کیا تھا۔1816ء سے غالب تخلص کا باقاعدہ استعمال کرنے لگے تھے۔
- غالب نے اپنے خطوط میں لکھا ہے کہ ان کو ایک ڈومنی چاہتی تھی۔
- غالب نے فارسی شاعر بیدلؔ کی ورش پر اپنے اردو کلام کی ابتدا کی تھی۔
- غالب نے شاعری میں بیدل کی روش اختیار کی ہے۔

طرز بے دل میں ریختہ کہنا　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

- غالب نے مثنوی باد مخالف میں فارسی کے 9 رشعرا کو اپنا استاد قرار دیا ہے۔
- غالب کے مخلص دوست مولوی فضل حق تھے جن کی تحریک پر غالب نے اپنے ابتدائی کلام کا دو تہائی حصہ نکال ڈالا تھا۔
- غالب نے فارسی میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز 1827-1826ء میں کیا۔
- غالب کو اپنے اردو کلام سے زیادہ فارسی کلام پسند تھا۔
- غالب نے اپنی کتاب مہر نیم روز میں ایک موقع پر بہادر شاہ کی طرف خطاب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ ''شاہجہاں کے عہد میں کلیم شاعر سیم وزر میں تولا گیا تھا مگر میں صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو میرا کلام ہی ایک دفعہ کلیم کے کلام کے ساتھ تول لیا جائے۔
- غالب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ''جس بحر میں کوئی اسم یا لفظ نہ آسکے اس کی تدبیر خاقانی اور فردوسی سے بھی نہ ہوگی۔ میں کیا کروں گا! تمہارا نام آسکتا ہے لیکن الف دبتا رہتا ہے۔خدا کے واسطے اس کی تدبیر سرور صاحب سے پوچھنا۔''
- مرزا غالب کی زندگی میں دو ادبی معرکے ہوئے، ایک الہ آباد میں دوسرا کلکتہ میں۔
- غالب کو تقریباً پچیس برس کی عمر میں دہلی کالج کے استاد کی حیثیت سے وہاں تعلیم دینے کی پیشکش کی گئی تھی۔
- غالب نے اپنے خطوط میں رامپور کو 'دارالسرور' کے نام سے یاد کیا ہے۔

القاب وخطابات

- بہادر شاہ ظفر نے غالب کو نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ کا خطاب 1266ھ مطابق 1849ء میں عطا کیا تھا۔اور خاندان تیمور کی تاریخ نویسی کی خدمت پر پچاس روپیہ ماہوار کے مامور کیا تھا۔
- ذوق کے انتقال کے بعد غالب کو ملک الشعرا کا خطاب ملا۔

غالب کے شاگرد

میر مہدی مجروح، الطاف حسین حالی، یوسف علی خاں والی، بہادر شاہ ظفر، نواب ضیاء الدین خاں نو درخشاں، منشی ہر گوپال تفتہ، نواب علاء الدین خاں علوی، ذکی، عزیز، مشتاق، جوہر، مرزا قربان علی بیگ سالک

غالب کے بارے میں مختلف آرا و خیالات

- غالب کو "حیوان ظریف" حالی نے کہا تھا۔
- "ماضی کا رچا ہوا شعور، حال کے پیچ و خم کا احساس اور آنے والے دور کی کرنیں سبھی کچھ موجود ہیں۔ (آل احمد سرور)
- غالب کو "نشاط کا شاعر" ممتاز حسین نے قرار دیا ہے۔
- غالب کو "پہلا فلسفی شاعر" یوسف حسین خاں نے کہا ہے۔
- غالب کو خود بھی احساس تھا کہ وہ "عندلیب گلشن نا آفریدہ" ہیں۔
- اقبال نے غالب کا مقابلہ گوئٹے سے کیا ہے۔
- غالب کے کلام کو "جلوۂ صد رنگ" سرور نے کہا ہے۔
- "دیوانِ غالب کا ہر مصرع تار رباب نظر آتا ہے۔" (عبدالرحمٰن بجنوری)
- ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ایک وید مقدس، دوسری دیوانِ غالب: عبدالرحمٰن بجنوری)
- غالب کے تصرف سے غزل اردو کی تاثیر اور تقدیر بن گئی۔ (رشید احمد صدیقی)
- غالب نے اردو شاعری کو ایک نیا شعور، ایک نیا نسب، ایک نیا افق دیا۔ (رشید احمد صدیقی)
- غالب نے غزل کی تقدیر دریافت کی اور غزل کو ایسی فضاؤں سے آشنا کیا جہاں اردو کے تمام ممکناتِ شعری و شاعری کے برگ و بار لانے کے لیے سامان اور سہولتیں فراہم ہیں۔ (رشید احمد صدیقی)
- اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے راستہ پر ڈال دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ (میر تقی میر)
- مرزا غالب کے لیے شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری ہے۔ (عبدالرحمٰن بجنوری)
- غالب کے قصر شاہی کی بنیاد جدت طرازی پر ہے، اس جدت طرازی میں جدت تخیل، جدت استعارات، جدت تشبیہات، جدت محاکات اور جدت الفاظ سب آجاتے ہیں۔ (آل احمد سرور)

c غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سادہ گوئی (میر درد) کی روایت میں تازہ گوئی (ناسخ) کی خصوصیات (مضمون آفرینی و تلازمات) سے اپنا منفرد رنگ سخن ایجاد کر کے اسے حیات و کائنات سے ملا دیا۔ (جمیل جالبی)

'دیوانِ غالب' (مطبوعہ غالب انسٹی ٹیوٹ) سے ردیف الف، ر، ن اور ی/ یے کی ابتدائی پانچ پانچ غزلیں

ردیف الف

(1)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا



جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسد! غمخوارِ جانِ دردمند آیا

(2)

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشم حسود تھا

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغ عیوب برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا

(3)

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوست دار دشمن ہے اعتماد دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل — خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی — ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

(4)

دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا — آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار — اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھ کر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

(5)

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا — قیس، تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یا رب — تیر بھی سینہ بسمل سے پرافشاں نکلا

بوے گل نالہ دل دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد — کام یاروں کا بہ قدر لب و دنداں نکلا

ہے نوآموز فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

ردیف 'ز'

(1)

بلا سے ہیں جو بہ پیش نظر در و دیوار — نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

وفور اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ — کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار
نہیں ہے سایہ کہ سن کر نوید مقدم یار — گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار
ہوئی ہے کس قدر ارزانی مے جلوہ — کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار
جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ — کہ ہیں دکان متاع نظر در و دیوار
ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے — کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسائے میں تو سائے سے — ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی — ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار
نہ پوچھ بے خودی عیش مقدم سیلاب — کہ ناچتے ہیں پڑے سر بہ سر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانے میں
حریف راز محبت مگر در و دیوار

(2)

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں — لیوے نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم — سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اس بت کافر کا پوجنا — چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

(3)

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر — جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر
آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے — سرگرم نالہ ہائے شرربار دیکھ کر
کیا آبروے عشق جہاں عام ہو جفا — رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے — مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق
لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاع سخن کے ساتھ
لیکن عیار طبع خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہ رو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پانو کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالب شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

(4)

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زمانے سے
کہ مجنوں 'لام الف' لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے
بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا
کہ پشت چشم سے جس کی نہ ہووے مہر عنواں پر

مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا
کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالب کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

(5)

ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ابرو سے ہے کیا اس نگۂ ناز کو پیوند
ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

ہے خون جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین
کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور
ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

ردیف ن

(1)

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش، ولے
غالب! یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں!

(2)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کاروبار شوق کسے
ذوق نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شور سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
ایسا آساں نہیں لہو رونا
دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں
فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

(3)

کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں
دل میں آجائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے — خار رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا — آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا رنگ — اس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں
وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

(4)

آبرو کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں — ہے گریباں ننگ پیراہن جو دامن میں نہیں
ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں — رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں
ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہ آفتاب — ذرے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں
کیا کہوں تاریکیِ زندان غم اندھیر ہے — پنبہ نور صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں
رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں
بسکہ ہیں ہم اک بہار ناز کے مارے ہوئے — جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں
قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا — خوں بھی ذوق درد سے فارغ مرے تن میں نہیں
لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری — موج مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود — قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں
تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

(5)

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا — گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بہ سوے دل — ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش — تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم! مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے! خدا نکردہ، تجھے بے وفا کہوں!

(6)

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے — بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

ردیف ی/ یے

(1)

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھایے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھایے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق — یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھایے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم — اے خانماں خراب نہ احساں اٹھایے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھایے

(2)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے — بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے
عاشق ہوے ہیں آپ بھی ایک اور شخص پر — آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی — ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے
سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو — اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

قطعہ

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
سر پائے خم پہ چاہیے ہنگامِ بے خودی — رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے
یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات — عارف ہمیشہ مستِ مے ذات چاہیے
نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے، جو بات چاہیے

(3)

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے — مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

نہ اتنا برش تیغ جفا پر ناز فرماؤ   مرے دریائے بےتابی میں ہے اک موج خوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے   لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غالب شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

(4)

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے   تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہ پریشانیِ صہبا   یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ مے کدہ گستاخ ہیں زاہد   زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
بیدادِ وفا دیکھ، کہ جاتی رہی آخر   ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

(5)

تا، ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا   سن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالبؔ! ترا احوال سنا دیں گے ہم ان کو   وہ سن کے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

(6)

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے



شاعر نکر

مومن خاں مومن

(1215ھ/1800ء۔1268ھ/1852ء)

- نام محمد مومن خاں تھا اور تخلص مومن۔
- مومن 1215ھ/1800ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔
- مومن کی وفات 1268ھ/1852ء میں دہلی میں ہوئی اور دہلی دروازہ کے باہر شاہ ولی اللہ کے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے۔
- مومن کی موت کوٹھے سے گرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔
- موت سے چند مہینے پہلے مومن کوٹھے سے گر پڑے تھے جس کی وجہ سے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے تھے۔
- اس حادثہ کی تاریخ کہی جو آخر کار موت کی تاریخ بھی ثابت ہوئی اور یہ ان کے مزار پر کندہ ہے۔(دست و بازو بشکست (ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے)
- مومن کے والد کا نام غلام نبی خاں تھا۔
- مومن کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔
- حکیم غلام نبی خاں کے مرشد شاہ عبدالعزیز نے مومن کی پیدائش پر کان میں اذان دی تھی اور مومن نام تجویز کیا تھا۔ حالاں کہ گھر والوں نے حبیب اللہ نام رکھا تھا۔
- مومن نے عربی شاہ عبدالقادر سے اور طب اپنے والد حکیم غلام نبی خاں سے پڑھی تھی۔
- مومن ریاضی، نجوم، موسیقی اور شطرنج میں بھی مہارت رکھتے تھے۔
- مومن کو علم رمل اور تاریخ گوئی میں بھی مہارت حاصل تھی۔
- مومن کی شاعری کے استاد شاہ نصیر تھے۔
- مومن مسلکاً وہابی تھے اور حافظِ قرآن بھی تھے۔
- مومن نے دو شادیاں کی تھیں۔
- پہلی شادی 1833ء میں ایک زمیندار خاندان کی لڑکی سے ہوئی لیکن نباہ نہ ہوئی اور علاحدگی ہوگئی۔
- مومن کی دوسری شادی خواجہ میر درد کے خاندان میں ہوئی۔ ان سے ایک لڑکا احمد نصیر خاں اور ایک لڑکی محمدی بیگم بقید حیات رہے۔

- مومن کی معشوقہ کا نام ام الفاطمہ اور تخلص حجاب تھا۔
- مثنوی ''قول غمیں'' میں ان کی معشوقہ کا کردار ہے جس کا تخلص صاحب جی ہے۔
- معاملہ بندی مومن کے کلام کا خاص وصف ہے۔
- مومن کی غزلوں کا دائرہ حسن و عشق تک محدود ہے۔
- مومن صنعت مکر شاعرانہ کے موجد ہیں۔
- مومن اپنے تخلص کو معنی خیز انداز میں استعمال کرتے ہیں۔
- مومن کی غزلوں میں عشقیہ جذبات کا برملا اظہار رنگینی اور شگفتگی پیدا کر دیتا ہے۔

مومن کے شاگرد

شیفتہ، میر حسن، تسکین، میر غلام علی وحشت، اصغر علی خان نسیم

مومن کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- مومن کی شاعری کو ''مکر شاعرانہ'' کا نام ضیا احمد بدایونی نے دیا تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے اس شعر کے متعلق غالب نے فرمایا تھا کہ اگر مومن مجھے اپنا یہ شعر دے دیں تو میں ان کو اپنا پورا دیوان دینے کو تیار ہوں۔

- سعادت خاں ناصر نے مومن کو ''مسیحی نفس''، ''حکیم بے نظیر'' اور ''شاعر بے عدیل'' کہا ہے۔
- اگر میرے سامنے تمام شعراءِ متقدمین کے کلام رکھ کر مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دے دو باقی سب اٹھا لے جاؤ۔ (نیاز فتح پوری)
- ان (مومن) کی غزلوں میں عاشقی کی وہ فضا ملتی ہے جس میں بازاری انداز ہوتا ہے۔'' (ڈاکٹر سید عبداللہ)
- مومن تہذیب کی لگام کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور ہمیشہ باتیں رمز و کنایہ کے پیرائے میں کہتے ہیں۔'' (امداد امام اثر)
- مومن اپنے قصیدوں میں مواد اور ہیئت کو ہم آہنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (ڈاکٹر عبادت بریلوی)

دیوان مومن سے ردیف الف اور یے کی ابتدائی پانچ پانچ غزلیں

ردیف الف

(1)

نہ کیوں کر مطلعِ دیواں ہو مطلعِ مہرِ وحدت کا　　کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرعِ انگشتِ شہادت کا
بچاؤں آبلہ پائی کو کیونکر خارماہی سے　　کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دقت کا
سرشکِ اعترافِ عجز نے الماس ریزی کی　　جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا
نہ یہ دستِ جنوں ہے اور نہ وہ جیبِ جنوں کیشاں　　کہ ہو دستِ مژہ سے چاک پردہ چشمِ حیرت کا
نہ دے تیغِ زباں کیونکر شکستِ رنگ کے طعنے　　کہ صفحہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا
غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے　　نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا
گلوئے خامہ میں سرمہ مدادِ دودۂ دل ہے　　مگر لکھنا ہے وصفِ خاتمہ جلد رسالت کا
نہ پوچھو گرمی شوق ثنا کی آتش افروزی　　بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمع فکرت کا
نمک تھا بخت شورِ فکر خوانِ مدح شیریں پر　　کہ دندان طمع نے خوں کیا ہے دست حسرت کا
خدایا ہاتھ اٹھاؤں عرض مطلب سے بھلا کیونکر　　کہ ہے دستِ دعا میں گوشہ دامانِ اجابت کا
عنایت کر مجھے آشوب گاہ حشرِ غم اک دل　　کہ جس کا ہر نفس ہم نغمہ ہو شورِ قیامت کا
جراحت زار اک جاں دے کہ جس کی ہر جراحت ہو　　نمکداں شور الفت سے مزا آوے عیادت کا
فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برق جولاں کر　　کہ خرمن پھونک دیوے ہستی اہلِ ضلالت کا
مرا جوہر ہو سرتاپا - صفائے مہر پیغمبر　　مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا
مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو　　دلِ صد پارہ اصحاب نفاق و اہل بدعت کا
خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا　　لبوں پر دم بلا ہ جوشِ خوں شوق شہادت کا
نہ رخ بیگانہ مہر امام اقتدا سنت　　کہ انکار آشنائے کفر ہے اس کی امامت کا
امیر لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنی　　ارادہ ہے مرا فوج ملائک پر حکومت کا

زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا

(2)

آگ اشک گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا　　آنسو جو اس نے پونچھے شب اور ہاتھ پھل گیا

پھوڑا تھا دل نہ تھا یہ موے پر خلل گیا
جب ٹھیس سانس کی لگی دم ہی نکل گیا

کیا روؤں خیرہ چشمی بخت سیاہ کو
واں شغل سرمہ ہے ابھی یاں نیل ڈھل گیا

کی مجھ کو ہاتھ ملنے کی تعلیم ورنہ کیوں
غیروں کو آگے بزم میں وہ عطر مل گیا

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

جوں خفتگان خاک ہے اپنی فتادگی
آیا جو زلزلہ کبھی کروٹ بدل گیا

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کچھ جی گرا پڑے تھا پر اب تو نے ناز سے
مجھ کو گرا دیا تو مرا جی سنبھل گیا

مل جائے گر یہ خاک میں اس نے وہاں کی خاک
گل کی تھی کیوں کہ پاؤں وہ نازک پھسل گیا

بت خانے سے نہ کعبے کو تکلیف دے مجھے
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

(3)

لگے خدنگ جب اس نالۂ سحر کا سا
فلک کا حال نہ ہو کیا مرے جگر کا سا

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہووے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

کرے نہ خانہ خرابی تری ندامت جور
کہ آب شرم میں ہے جوش چشم تر کا سا

یہ جوش یاس تو دیکھو کہ اپنے قتل کے وقت
دعائے وصل نہ کی وقت تھا اثر کا سا

لگے ان آنکھوں سے ہر وقت اے دل صد چاک
ترا نہ رتبہ ہوا کیوں شگاف در کا سا

ذرا ہو گرمی صحبت تو خاک کر دے چرخ
مرا سرور ہے گل خندۂ شرر کا سا

یہ ناتواں ہوں کہ ہوں اور نظر نہیں آتا
مرا بھی حال ہوا تیری ہی کمر کا سا

جنون کے جوش سے بیگانہ وار ہیں احباب
ہمارا حال وطن میں ہوا سفر کا سا

خبر نہیں کہ اسے کیا ہوا پر اس در پر
نشان پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

دل ایسے شوخ کو مومن نے دے دیا کہ وہ ہے
محب حسین کا اور دل رکھے شمر کا سا

(4)

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

ان سے بدخو کا کرم بھی ستم جاں ہوگا
میں تو میں غیر بھی دل دے کے پشیماں ہوگا

اور ایسا کوئی کیا بے سر و ساماں ہوگا
کہ مجھے زہر بھی دیجے گا تو احساں ہوگا

محو مجھ سا دمِ نظارہ جاناں ہوگا
آئینہ آئینہ دیکھے گا تو حیراں ہوگا

خواہشِ مرگ ہو اتنا نہ ستانا، ورنہ
دل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

ایسی لذت خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے
رہ گیا سینے میں اس کا کوئی پیکاں ہوگا

بوسہ ہائے لبِ شیریں کے مضامیں ہیں نہ کیوں
لفظ سے لفظ میرے شعر کا چسپاں ہوگا

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل
تم سے بے رحم پہ مرنے سے تو آساں ہوگا

حیرتِ حسن نے دیوانہ کیا گر اسکو
دیکھنا خانہ آئینہ بھی ویراں ہوگا

دیدۂ منتظر آتا نہیں شاید تجھ تک
کہ مرے خواب کا بھی کوئی نگہ باں ہوگا

ایک ہی جلوہ مہ رو میں ہوا سو ٹکڑے
جامۂ صبر جسے کہتے ہیں کتاں ہوگا

گریہی گرمیِ مضموں شرر ریز رہی
رشتۂ شمع سے شیرازۂ دیواں ہوگا

کیوں کہ امیدِ وفا سے ہو تسلی دل کو
فکر ہے یہ کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

گرترے خنجرِ مژگاں نے کیا قتل مجھے
غیر کیا کیا ملک الموت کے قرباں ہوگا

اپنے انداز کی بھی ایک غزل پڑھ مومن
آخر اس بزم میں کوئی تو سخن داں ہوگا

(5)

بے سبب کیونکہ لبِ زخم پہ افغاں ہوگا
شور محشر سے بھرا اُس کا نمکداں ہوگا

آخر اُمید ہی سے چارۂ حرماں ہوگا
مرگ کی آس پہ جینا شبِ ہجراں ہوگا

مجمعِ بسترِ مخمل شبِ غم یاد آیا
طالعِ خفتہ کا کیا خواب پریشاں ہوگا

دل میں شوقِ رخِ روشن نہ چھپے گا ہرگز
ماہ پردے میں کتاں کے کوئی پنہاں ہوگا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

شومیِ بخت تو ہے چین لے اے وحشت دل
دیکھ زنداں ہی کوئی دن میں بیاباں ہوگا

نسبتِ عیش سے ہوں نزع میں گریاں یعنی
ہے یہ رونا کہ دہن گور کا خنداں ہوگا

بات کرنے میں رقیبوں سے ابھی ٹوٹ گیا
دل بھی شاید اُسی بدعہد کا پیماں ہوگا

چارہ جو اور بھی اچھا میں کروں گا ٹکڑے
پردۂ شوخ جو پیوند گریباں ہوگا

دوستی اس صنم آفتِ ایماں سے کرے
مومن ایسا بھی کوئی دشمن ایماں ہوگا

ردیف ۔ ی/ے

(1)

منظور نظر غیر سہی اب ہمیں کیا ہے
بے دید تری آنکھ سے دل پہلے پھرا ہے

کھائی ہے قسم ہم نے کہ پرہیز کریں گے
گر درد سے بھر جائے طبیعت تو مزا ہے

جب گھر میں نہ ہو تم تو رہیں کوچے میں ہم کیوں
شکوہ جو تمھارا تو ہمارا بھی بجا ہے

بس بس نہ کرو بات کہ یاد آئے ہے مجھ کو
ناصح سے جو کچھ بے خودیوں میں بھی سنا ہے

کس طرح نہ اس شوخ کے رونے پہ ہنسوں میں
نظروں میں مروت ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے

اب شوق سے تم محفل اغیار میں بیٹھو
یاں گوشۂ خلوت میں عجب لطف اٹھا ہے

یارب کوئی معشوقۂ دلجو نہ ملے اب
جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

توبہ گنہِ عشق سے فرمائے ہے واعظ
یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

آزردۂ حرمانِ ملاقات ملے کیا
یعنی کہ نہ ملنا ہی نہ ملنے کی سزا ہے

پرہیز سے اُس کے گئی بیماریِ دل آہ
بیگانگیوں میں بھی عجب ربط رہا ہے

تھا محوِ رخِ یار میں کیا آئینہ دیکھوں
معلوم ہے یارو مجھے جو رنگ مرا ہے

چاہا کرے دل لاکھ نہ بولوں گا جو ہمدم
وہ میرے منانے کو رقیبوں سے خفا ہے

میں ترک وفا سے بھی وفادار ہوں مشہور
کیں تجھ سے جواے دشمن ارباب وفا ہے

مومن نہ سہی بوسۂ پا سجدہ کریں گے
وہ بت ہے جو اوروں کا تو اپنا بھی خدا ہے

(2)

خوشی نہ ہو مجھے کیونکر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اس بیوفا کے آنے کی

ہے ایک خلق کا خوں سر پہ اشک خوں کے مرے
سکھائی طرز اُسے دامن اٹھا کے آنے کی

سمجھ کے اور ہی کچھ مر چلا میں اے ناصح
کہا جو تو نے نہیں جان جا کے آنے کی

امید سرمہ میں تکتے ہیں راہ دیدۂ زخم
شمیم سلسلۂ مشک سا کے آنے کی

چلی ہے جان نہیں تو کوئی نکالو راہ
تم اپنے پاس تک اِس مبتلا کے آنے کی

نہ جانے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

مشام غیر میں پہنچے ہے نکہتِ گل داغ
یہ بے سبب نہیں بندی ہوا کے آنے کی

جو بے حجاب نہ ہوگے تو جان جائے گی
کہ راہ دیکھی ہے اُس نے حیا کے آنے کی

پھر اب کی لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل / گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی
خیال زلف میں خود رفتگی نے قہر کیا / اُمید تھی مجھے کیا کیا بلا کے آنے کی
کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے / اجل بھی رہ گئی ظالم سنا کے آنے کی
کہاں ہے ناقہ ترے کان بجتے ہیں مجنوں / قسم ہے مجھ کو صدائے درا کے آنے کی

مرے جنازہ پہ آنے کا ہے ارادہ تو آ
کہ دیر اٹھانے میں کیا ہے صبا کے آنے کی
مجھے یہ ڈر ہے کہ مومن کہیں نہ کہتا ہو
مری تسلی کو روزِ جزا کے آنے کی

(3)

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آ جائے / پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آ جائے
باندھو اب چارہ گرو چلے کہ وہ بھی شاید / وصل دشمن کے لیے سوے مزار آ جائے
کر ذرا اور بھی اے جوشِ جنوں جنوں خوار و ذلیل / مجھ سے ایسا ہو کہ ناصح کو بھی عار آ جائے
نام بدبختیِ عشاق خزاں ہے بلبل / تو اگر نکلے چمن سے تو بہار آ جائے
جیتے جی غیر کو ہو آتشِ دوزخ کا عذاب / گر مری نعش پہ وہ شعلہ عذار آ جائے
کلفت ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں / دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آ جائے
محو دل دار ہوں کس طرح نہ ہوں دشمن جاں / مجھ پہ جب ناصح بیدرد کو پیار آ جائے
ٹھہر جا جوشِ تپش ہے تو تڑپنا لیکن / چارہ سازوں میں ذرا دم دل زار آ جائے

حسن انجام کا مومن مرے بارے ہے خیال
یعنی کہتا ہے وہ کافر کہ تو مارا جائے

(4)

تیری پابوسی سے اپنی خاک بھی مایوس ہے / نقش پا پر نقش پا ظالم کفِ افسوس ہے
ہائے یاد مرغ مجنوں کی جنوں افزائیاں / مرے سر کو سایۂ بالِ ہما منحوس ہے
چشم دریا بار ہے کس کے خیالِ خط میں جو / فلس ماہی داغ افزائے پر طاؤس ہے
کیا یہ مطلب ہے کہ برعکسِ وفا ہوگی جفا / جو تمھارے عہدنامہ میں خطِ معکوس ہے
یاں جلایا جی حجابِ شمع رونے اور بھی / سوز پروانہ کو مانع پردۂ فانوس ہے
بسکہ شام وصل آغازِ سحر میں مرگئے / سینہ کوبی اہل غم کی ہم صدائے کوس ہے

غیرتِ آمد شدِ دشمن سے تلودن سے لگی — جل بجھیں گے اب کہ حالِ مشعل منکوس ہے
گر نہ ہو شکر جفائے متصل سے درد سر — لب پہ کچھ کچھ التماسِ جان غم مانوس ہے
نزع میں جی کا نکلنا تیرا آنا ہوگیا — بسکہ مرتے مرتے دل میں حسرتِ پابوس ہے
شاعری اپنی ہوئی نیرنگیِ دانشوری — جو سخن ہے سو طلسم راز بطلیموس ہے

کرچکا ہوں دور اخلاص بتاں میں امتحاں
میں نہ مانوں گا کہ مومن زاہد سالوس ہے

(5)

دیتے ہو تسکیں مرے آزار سے — دوستی تم کو نہیں اغیار سے
کچھ نہ سوجھا حسرتِ دیدار سے — سہل چھوٹے مردنِ دشوار سے
داغ خون سے میرے وہ حیراں ہوا — دامن الجھا ہے گل بے خار سے
چھوڑ جلد اے بوالہوس سر کو کہ اب — جھانکتے ہیں روزنِ دیوار سے
فصد کی حاجت مجھے کیا چارہ گر — بہہ گیا خوں دیدۂ خونبار سے
مال کیسا جاں بھی دے کر بوالہوس — گر بنے تو دل چھٹا لوں یار سے
مت کرو کنگھی نہ یہ دزدِ حنا — دل چرائے طرۂ طرار سے
آہ دورِ چرخ کی کیا خاک اڑائے — فتنہ برپا ہے تری رفتار سے
کھاگیا جاں آکہ دوں اس کو نکال — میں نہیں خوش صحبتِ غمخوار سے
یوں کہے درد آیااپنی چیز کا — حال دل گر پوچھیے دلدار سے
گر نصیحت گر میں سچ ہوں سادہ لوح — تو نبھے گی خوب اس عیار سے
کیوں نہ کاٹیں لب اطبا مرگیا — حال پوچھا تھا ترے بیمار سے
وعدہ کرکے وہ نہ آئے نامہ بر — تونے پوچھا ہوئے گا تکرار سے
دستِ قاصد کاٹے کیوں ثابت ہے کیا — دزدیِ مضمون مرے طومار سے
ہائے بختِ خفتہ کی یوں جھپکی آنکھ — دشمنوں کے طالع بیدار سے
مجھ سے وہ چھپتے پھریں اس کے سوا — اور حاصل عشق کے اظہار سے

کہہ غزل اِک اور بھی مومن کہ ہے
شوق اُس بت کو ترے اشعار سے



خان بہادر

شاد عظیم آبادی

(19 محرم 1262ھ/ جنوری 1846ء - 1927ء)

- شاد کا نام سید علی محمد، تخلص شاد اور خطاب خان بہادر تھا۔
- شاد عظیم آبادی 19 محرم 1262ھ/ جنوری 1846ء کو شہر عظیم آباد (پٹنہ) محلہ پورب دروازہ اپنے نانیہال میں پیدا ہوئے۔
- شاد کا انتقال 1927ء میں 81 سال کی عمر میں پٹنہ میں ہوا۔
- شاد کے والد کا نام سید عباس مرزا تھا اور دادا کا نام سید تفضل علی خاں۔
- شاد کے والد عباس مرزا ترک سکونت کر کے عظیم آباد چلے آئے تھے۔
- شاد کے آغاز تعلیم سے لے کر منتہائے تعلیم تک کے استاد: مولوی فرحت حسین، شیخ آغا جان، شیخ علی باقر آبا، سید عبداللہ، مولوی آغا محمد، ناظر وزیر علی، مسٹر فریزر، مولوی محمد اعظم اور شیخ محمد علی ہیں۔
- شاد کی شاعری کے استاد خواجہ میر درد کے شاگرد شاہ الفت حسین فریاد ہیں۔
- شاہ الفت حسین فریاد نے ہی علی محمد کا تخلص شاد تجویز کیا تھا۔
- ابتداً شاد نے ناظر وزیر علی عبرتیؔ سے بھی مشورۂ سخن کیا تھا۔
- سات آٹھ برس کی عمر میں آپ نے تلنگی پر یہ شعر موزوں کر کے لکھا تھا:

جو کوئی اس تلنگی کو لوٹے
گر پڑے ہاتھ پاؤں سر ٹوٹے

- شاد کو انیس و دبیر کی صحبت بھی میسر رہی اور حالی و سرسید سے بھی ملاقات رہی۔
- شاد غزل میں میر اور آتش سے متاثر ہیں۔
- شاد نے مرثیہ میں انیس کا اتباع کیا ہے۔
- میر انیس جب پٹنہ آئے تھے تو شاد کو مرثیہ کہنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور شاد نے بیس پچیس بند کا مرثیہ بھی انیس کو اصلاح کرنے کے لیے دیا تھا۔
- شاد نے دو شادیاں کیں تھیں۔
- شاد کی پہلی شادی 1862ء میں کلثوم فاطمہ بنت میر آغا سے ہوئی تھی۔

- شاد کی دوسری شادی 1886ء میں زہرہ بیگم سے ہوئی تھی۔
- 1874ء میں شاد نے ہفت روزہ اخبار "نسیم سحر" کا اجرا کیا اور سات برس اس کے اڈیٹر رہے۔
- 1875ء میں شاد نے شہر کے لڑکوں کی اردو و فارسی تعلیم کے لیے زبدۃ المدارس اسکول قائم کیا تھا۔
- شاد کو انگریزی حکومت نے 1891ء میں خان بہادر کا خطاب دیا تھا۔
- شاد کو حکومت کی طرف سے 1000 روپیہ ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔
- شاد 1889ء میں آنریری مجسٹریٹ بنے اور 17 رسال تک رہے پھر 16 ربرس تک میونسپل کمشنر رہے۔

شاد کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- سید سلیمان ندوی نے شاد کو اس دور کا میر کہا ہے۔
- قاضی عبدالودود نے شاد کی خود نوشت کا تحقیقی جائزہ لینے کے بعد کہا تھا کہ وہ جھوٹوں کا بادشاہ تھا۔
- نورالحسن نقوی نے شاد کو دبستانِ عظیم آباد کی آبرو کہا ہے۔
- موجودہ اساتذہ میں شاید شاد کا ہم عصر کوئی دوسرا نکل سکے۔ جس نے ہماری محفل ادب کا پچھلا سماں دیکھا ہو استادان کہن کی صحبت اٹھائی ہو۔ (سلیمان ندوی)
- شاد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اگر میر کے سادہ اور بے ساختہ انداز بیان میں آتش کی رنگینی بیان کی امیزش کردی جائے تو شاد کا اسلوب وجود میں آتا ہے۔

کلیاتِ شاد (بہار اردو اکادمی، پٹنہ) سے ردیف الف، ب اور ی/ یے کی ابتدائی پانچ پانچ غزلیں

ردیف الف

(1)

میکدے میں تو ہے یکتا ساقیا — اِنَّما اللّٰہ اِلٰھا واحدًا
کَمْ مُحِبٍّ لَا یریٰ شیئًا سِواك — جن کے آگے لفظ مہمل ماسوا
کم عطاش دیدہ، شاں برکفت — اَنتَ سَاقِیُہِم وَ خیرٌ سَاقِیًا
اِنْتَبِه یَا قَلْب و شَرب جُرعَة — مِنْ صُبُوحِیٍّ زلا لًا طَیِّبًا
اِنَّما الْاَفرَاحُ مِیراثُ الْھُمُومِ — صبر تلخ اما بود حب شفا
سچ تو یوں ہے ظُلْمَةٌ فِیْ ظُلْمَةٍ — جب نہ خود سمجھا تجھے سمجھاؤں کیا
کَمْ لَكَ السَّاقِی مِنَ الْقَلْبِ الْکَبِیْرِ — جن کے ہیں بشکستہ دل صرف ثنا

لا ابالی او بری او قبلی
تجھ سے اے دنیا نہیں مجھ کو گلا

فاحِ نشر الورد مِن بستانِہم
عطر آگیں کیوں نہ ہو ارض و سما

اِستَمع یَا شادُ یا شیخَ الکبیر
عمر کو فانی سمجھ دھوکا نہ کھا

(2)

نہ پہنچا کوئی تا مقصود سُبحَان اللّٰہِ اَسرا
کھلا آئینہ دارِ لو کشفَ پرسِرِّ مَا اَوحَا

مجھے بھی تو بتا دے راز دار عَلَّمَ الْاَسما
خدایا! داورا! ھَیِّ لَنَا مِنْ اَمرِنَا رُشْدَا

کوں کیا مَجمع الضدّین ھے دنیا وما فیہا
نہ ظاہر ہے، نہ مخفی ہے، نہ پیدا ہے، نہ ناپیدا

قدم رکھتے گھرا بحرِ فنا کے سخت طوفاں میں
بچا لے اے امید بے کساں اے دافع البلوا

حیاتِ جاوداں میں فرق بھی آئے تو آنی ہو
مٹوں اور پھر بنوں دریائے ہستی میں حباب آسا

جو قطرے کی طرح اس بحر بے پایاں میں مل جاؤں
تو چلاؤں کہہ بِسْمِ اللّٰہِ مَجرِیہَا و مُرسٰہَا

وہ دولت دے کہ ان آنکھوں میں سب کچھ ہیچ ہو جائے
خطا پوشا! عطا پوشا، کرم سازا! خداوندا

وجود اعتباری کو لگاؤں کچھ نہ آنکھوں میں
ہٹاوے عشق و حسن ظاہری کا بیچ سے پردا

بصیرت کو مری معراج ہو صدقے میں احمد کے
کسی دن مجھ پہ بھی کھل جائے گا اسرار مَا اَوحَا

مٹا دے دل سے وحشت زمرۂ انساں میں داخل کر
قوا سے سب وہی لوں کام جو مقصود ہے تیرا

ہیولیٰ کو مرے وہ موقلم یارب عنایت کر
اتارے صفحۂ خالی پہ تیرا ہو بہ ہو نقشا

مرے شعروں میں یارب شاہدِ معنی کا جلوہ ہو
مگر حائل رہے لفظوں کا بھی ہلکا سا اک پردا

خریدار و بضاعت گو مری مرجات ہے لیکن
تردّد کیا خریداری میں ہے بے دام کا سودا

زباں دانو گہر بھی ہے خزف چشم تعنت میں
ہنر ہے جہل سے بدتر جو داغ آیا تعصب کا

نوا سنجو! مرے نغموں کا غل ہے عرشِ اعظم پر
خوش آوازو! سر طوبیٰ پہ جاتا ہے مرا نالا

ہمارا خانوادہ مرکز اردو تھا دہلی میں
بحمداللہ گئی ہم سے نہ اب تک خصلتِ آبا

نواسا خان صادق کا ہوں جو تھا نائب سلطاں
ہوں کمبل پوش سید خاں دوراں خاں کا ہوں پوتا

تعارف کے لیے اتنا بھی لکھا منصفو ورنہ
خدا کی مجھ پہ لعنت ہو اگر کچھ بھی ہو فخر اس کا

اٹھاؤں کیا سر اپنا سیہ کاری میں کاٹی ہے
نسب پر کچھ ہے غرہ اور نہ علم و فضل کا دعوا

وہی پیدا ہے ایسا جس سے ہر ناپید پیدا ہے
مسلم ہے کہ ناپیدا سے کچھ ہوتا نہیں پیدا

بری حال و محل سے بھی ہے پھر سب میں وہی وہ ہے
وہ ہے واحد، شمار اعداد میں اس کا نہیں اصلا

محیطِ کل کے معنی ظاہری گرلیں تو باطل ہے ۔۔۔ حدوں سے ہے مبرا، حد کے اندر آنہیں سکتا
وجود اس کا ہے واجب، عقل و جوداں اس پہ ہیں شاہد ۔۔۔ بجز اتنا سمجھنے کے نہ میں سمجھا نہ تو سمجھا
کوئی شے اس سے باہر کب ہے، ہر شے میں وہی وہ ہے ۔۔۔ اسی پر متفق دونوں ہیں، نابینا ہو یا بینا
یہ حسرت ہے کہ اس کو دیکھ لوں اس کو صدا سن لوں ۔۔۔ بہ این چشمان نابینا، بہ ایں اسماع ناشنوا
کیا جو تو نے یارب یا جواب کرتا ہے سب حق ہے ۔۔۔ کرم کی جا ستم بھی ہو تو ہے تیرے لیے زیبا
ریاضت نے مجھے سمجھا دیئے معنی عبادت کے ۔۔۔ قوا سے کام لیتا ہوں وہی مطلب ہے جو تیرا
لکد کوکب دل نے کیا جب دس حواسوں کو ۔۔۔ ہوئی پیدا ترے فضل و کرم سے شکل استغنا
سرورِ محض بن جاؤں جو یکسوئی میسر ہو ۔۔۔ مٹیں سب آرزوئیں دل سے یہ ارماں نہیں مٹتا
سراپا موقلم بن جاؤں بند آنکھیں اگر کرلوں ۔۔۔ اتاروں صفحۂ خالی پہ تیرا ہو بہو نقشا
فنا کے بعد جس دن ابر رحمت قطرہ افشاں ہو ۔۔۔ اُگوں زیر زمیں سے خاک ہو ہو کر نبات آسا
سیاحت کا مزا ہستی میں جب جب کھینچ کر لائے ۔۔۔ تو ہر آنے پہ ظاہر ہو نیا عالم نئی دنیا
فنا کا خوف ہوجائے فنا دل سے تو چین آئے ۔۔۔ مجرد مادّے سے ہو کے ہوجاؤں بہشت آسا
یہ سب چاہا مگر اب چاہتا ہوں کچھ نہ چاہوں میں ۔۔۔ یہی گر چاہتا پہلے تو کیوں ہوتا بشر رسوا
نہ لوں کشتی کا بھی احسان سر پر عین طوفاں میں ۔۔۔ نہ پوچھوں خضر تک سے وادی پر ہول میں رستا
مزا دیکھو کہ اس بازار میں سر پر اٹھائے ہوں ۔۔۔ خریداروں کا احساس بیچ کر بے دام کا سودا
کہاں تک ذی کمالو خون انصاف اک ذرا سوچو ۔۔۔ خس و خاشاک کے روکے کبھی رکتا نہیں دریا

نئی بات آج تک اے شاد دیکھی کچھ نہ عالم میں
وہی گھٹتی ہوئی عمریں وہی مٹتی ہوئی دنیا

(3)

اے ازلی الوجود اے ابدی البقا ۔۔۔ بے ادبانہ نہ چل حلقۂ عبدیت میں آ
خالق و مخلوق تو مالک و مملوک تو ۔۔۔ ساجد و مسجود تو، عجب نہ کر سر جھکا
کعبۂ مقصود کا حج، ترے اوپر ہے فرض ۔۔۔ وسعت دل ہے منا، خونِ تمنا بہا
جانِ صداقت پہ دے صدق ہے فطرت تری ۔۔۔ زیست کی پروانہ کر زیست ہے دام فنا
موردِ آفات رہ، ظلم کا تابع نہ بن ۔۔۔ بھول نہ بھولے سے بھی واقعۂ کربلا
گلشنِ حق الیقیں سامنے آنکھوں کے ہے ۔۔۔ چہرہ سے اپنے ہٹا، پردۂ بیم و رجا
روز ازل خود کہا، جوشِ طرب میں الست ۔۔۔ ہوگیا پھر کیوں خموش دے کے صدائے بلا

کلمۂ قالوا کو تو صیغۂ غائب نہ جان
جمع کوواحد سمجھ لفظ کا دھوکا نہ کھا

خاک کے پتلے سنبھل، خاک کا پتلا نہ بن
تیری تو مسند ہے عرش خاک کجا تو کجا

خار بھی اس باغ کا اپنی جگہ پھول ہے
شان سے تیری ہے دور، خود کو سمجھنا ہوا

آنکھ سے اشکال دیکھ،کان سے آواز سن
کہہ کے پشیماں نہ ہو مطلب چون و چرا

فرش زمیں اے بشر ہے تیری تعلیم گاہ
جملہ شیونات کے معنی و مطلب لگا

تاکہ ہو عین الیقیں، پاک کثافات سے
پیس یہاں تک کہ دل پس کے بنے سرمہ سا

تیری حقیقت تلک کس کی رسائی ہوئی
بازی طفلانہ ہے مسئلہ ارتقا

تیری خودی نے تو خود، قید میں ڈالا تجھے
جوں جوں بڑھے خواہشات، پاؤں میں پھندا پڑا

زندگی، دائمی کی جو تجھے ہے تلاش
ذات میں اپنی فنا ہو کے طلب کر بقا

ہے تری تسبیح پاک غازۂ روئے وجود
تیری ہی توحید ہے شانۂ گیسوئے لا

جلوہ کناں تو جہاں واں نہیں دخلِ گماں
جملہ شیونات ہیں، سب ترے منقوشِ پا

روح امر ہے تری اس کا عدم نادرست
موت ہے تبدیل جا اس سے عبث تو ڈرا

عرصۂ کون و مکاں ہیں تری زنبیل میں
فیض تو افزوں ز حصر، جودِ تو فوق العطا

جوہرِ توحید تو،سجۂ تمجید تو
غازۂ روئے یقیں، شانۂ گیسوئے لا

دشمنِ خانہ ہے نفس، پہلے اسی سے سمجھ
پھر ہے امیدوں کا پیش جیش طویل اللوا

آیتِ والفتح پڑھ، تاہویہ رایت نگوں
جہلِ تمنا ہے یہ، جیش طویل اللوا

باندھ کے محکم کمر، لے تبرِ نفی غیر
کاٹ کے سب پھینک دے خار وخس ماسوا

چین سے کر زندگی، پاؤں کوپھیلا کے سو
شامِ ازل فرش خواب صبحِ ابد مت کا

جوہرِ جاں تیرا میں، جان نہ تو فرق ہیں
نفسک نفسی درست لحمک لحمی روا

بزمِ حقیقت میں تو لائق تمجید ہے
تیری ہی توحید ہے، قطع کن ماسوا

عرصۂ کون و مکاں، ذرہ کے اندر نہاں
شہر ترا ہے وہاں، جس کا عدم اوستا

عقلِ عسر رائگاں، ہیچ ہے ساراگماں
بازیٔ طفلانہ ہے، مسئلہ ارتقا

نورکِ مرآۃِ حق، شاہدِ وے نہ، طبق
سرِّ تو بالا زدرک، درک تو حیرت زدا

جلوہ کناں تو جہاں، واں نہیں دخلِ گماں
نقش تو تحت الثریٰ، شان تو فوق السماء

لوحۂ سرِ مشق تو،آئینۂ ہست و بود
ذکر تو حاجت روا، نام تو مشکل کشا

مسلکِ سرِ میں ترے، دخل بشر ہے حرام
فکرِ فلاطوں کو جان، علتِ ماخولیا

منکرِ امر رحیم، صورت شیطاں رجیم — ہر کہ زند بررخت، سیلیِ مکر و دغا
در صفتِ برتری، چوں تو فلک کے بود — ذاتِ تو خالص لجیں، وے بود اقلیمیا
کوچے کا تیرے نشاں ہے وہی مسلک جہاں — قتلِ رجا ہے ہدرِخونِ تمنا روا
تیری گلی کے فقیر، مفتخرِ شاہ و میر — دست تو دریا نوال، جودِتو فوق العطاء
تیرے تو قانون کی ہے وہی محکم کتاب — جس کا ہے صرف اک ورق معرکۂ کربلا
عمر کے بڑھنے سے شاد گھٹ گیا زورِ زباں — پہلے تھا کُن جس جگہ، اب ہے وہیں لفظ لا

شاد سخن کی ترے قدر کوئی کیا کرے
ایسے جواہر ہیں یہ، خلد ہے جن کی بہا

(4)

ترے جور کا نہ کروں گلہ کٹے تیغ سے بھی اگر گلا — کروں وجد میں یہی میں صدا کہ انا الشہید بکربلا
ہوا نور رخ جو عیاں ترا وسموع وجھلٹ اعقلا — چمک اٹھے دشت و جبال و در متشعشعاً متزلزلا
اسی شرم سے کہ الست کا تو جواب میں نے دیا بلیٰ — جو بلا کا مجھ پہ نزول تھا تو نہ سمجھا میں کہ ہے کیا بلا
شب غم پہ کچھ نہیں منحصر ہے جہاں حدوث کا سُر ملا — کہ اسی میں سب ہے بھری ہوئی بہت اس طرح کی الا بلا
سراسر ہے جو سرِ سناں مری لاش خوں میں بھی ہو طپاں — لب زخم سے یہ کروں عیاں کہ اِنَّا الْقَتِیلُ مرمّلا
مجھے ذوق ہے مے وصل کا پہ نہیں عجول میں ساقیا — کہ یہ جام آئے گا مجھ تلک تری بزم میں متداولا
ترا ظلم بھی ہے عجب عطا کہ میں فارغ آج ہوں ہر طرح — تھے اس ایک وار میں لطف دو نہ گِلہ رہا نہ گُلا
تیرے دم سے اس کا رواج ہے ترا ناز منفرد آج ہے — ترے سر پہ حسن کا تاج ہے مترصعاً متکللا
مجھے لاکھ سجدہ کریں ملک مرا فرش راہ ہو عرش تک — میں حضیض محض تھا اے فلک فلذ انزلت مِن العُلی
نہ کروں جو عجز و فروتنی تو خود اپنے ساتھ ہے دشمنی — فَلِذَا وَجَدتُ مِنَ الْعَدم وَکَذَا اِسْتَحَقُّ مِنَ الْعُلی
ہیں نگاہ شوق میں متحد ترا کوچہ ہو کہ ہو قتل گہ — تری جلوہ گاہ ہیں دونوں ہی جو منیٰ ہے یہ تو وہ کربلا
جو رضا تری ثمر اس کا ہے تو سکون و صبر ہیں اس کے گُل — ہے عجیب چیز نہال غم نہ ہمیں کو ہائے کبھی پھلا
رہ عشق میں جو رکھا قدم ہوئے اس طرح کے مخوف ہم — چلیں حاج جیسے سوئے حرم متعنکا مُتَهَرْوَلا
جو کھلے زبان مہیمنی، کہیں ہم کو سب ہے ایمنی — کہ ہیں جملہ کام سے ہم غنی نہ کہ عاطلاً و معطلاً
مجھے خوف ہے کہ الجھ کے یہ کہیں راستے میں نہ رہ پڑے — مری روح عالمِ کون سے جو یونہی رکھے گی خلا مَلا
ہمیں شاد جس کا بہت تھا ڈر وہی پیش آ گیا الحذر — تمھیں کہتے تھے کہ امید سے نہ زیادہ رکھو خَلا مَلا
مری عمر شاد تمام ترا سی گومگو میں ہوئی بسر — نہ کلام کرنے سے غم گھٹا نہ خموشیوں سے کٹی بلا

میں ہر ایک شعر پہ شادؔ کے کروں جان و مال سی شے فدا
مجھے کل کلام ملے کہیں جو مرتبا و مکللا

(5)

دل تو بدنام ہے اک عمر سے کیا اس کا گلہ، کہتے آئی ہے صبا
یہ تمنا یہ امیدیں جنھیں برسوں پالا، کب مری ہوں گی بھلا
وہ تری کج روشی، کج کلہی، کینہ وری، دلبری، عشوہ گری
کون غش کھا کے سر راہ گرا، کون موا، پھر کے دیکھا نہ ذرا
بان مارا تری آنکھوں نے جو کی پھر کے نگاہ، نہ ملی دل کو پناہ
یار کیا قہر ہے چلتا ہوا جادو تیرا، لاکھ روکا نہ رکا
رت پھری، ساری ہری ڈالوں میں پھوٹی کونپل، ہو گئے، پھول بھی پھل
اک یہ اجڑا ہوا دل ہے کہنہ پھولا نہ پھلا اور سوکھا ہی کیا
کالی کالی وہ گھٹائیں، وہ پپیہوں کی پکار، دھیمی دھیمی وہ پھوار
اب کے ساون بھی ہمارا یونہی رونے میں کٹا کیا کہیں چپ کے سوا
بوسہ لینے کا مری خاک کو بھی ہے ارماں، تاب اٹھنے کی کہاں
جامہ زیبی کا بھلا اے صنم تنگ قبا، کچھ تو دامن کو جھکا
فتنہ خو، آفت جاں، سنگدل، آشوب جہاں، دشمنِ امن و اماں
سرور کج کلہاں، خسرو اقلیم جفا، بانیٔ مکر و دغا
رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی، بے پیے متوالی
سانولا رنگ، نمک ریز جراحات جفا، اف کہا دھیان گیا
دیکھنا تیرا کنکھیوں سے ہے آڑی برچھی، یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ گھاؤ جو اوچھا سا لگا، پھر کے پھر دیکھ ذرا
کیا خطا اپنی اگر جاکے اچانک الجھے، نہ کبھی پھر سلجھے
جان کر دل کو پھنسائے خمِ گیسو میں بھلا، کس کی شامت ہے بتا
آنکھیں روئی ہوئی، آواز ہے بھرائی ہوئی، باتیں گھبرائی ہوئی
اس سے تو اور کسی بھید کا ملتا ہے پتا، شادؔ قسمیں تو نہ کھا

ردیف 'ب'

(1)

میرے سبب سے تھے عیاں آتش و خاک و باد و آب
میں نہ رہا تو پھر کہاں آتش و خاک و باد و آب
خلوتِ ناز میں تھا، میں اور وہ شوخ بے حجاب
بے سبب آئے درمیاں آتش و خاک و باد و آب
جب نہ ملا عدم میں کچھ قابلِ نذر دوستاں
لے کے چلے ہم ارمغاں آتش و خاک و باد و آب
جبکہ خیال دو ہم میں تابع حکم اے حکیم
پہنچیں گے تا بہ لامکاں آتش و خاک و باد و آب
ایسے پڑے ہیں کتنے ہی جن میں نہیں دوئی کا میل
سمجھے ہیں صرف ہم یہاں آتش و خاک و باد و آب
لے کے چلا جو کارواں ساتھ وہ شہ سوار حسن
گرد میں ہوگئے نہاں آتش و خاک و باد و آب
روح مری اِدھر اُدھر جائے گی ساتھ سایہ دار
ہوں گے جدھر جدھر رواں آتش و خاک و باد و آب
جب وہ نہیں کہ جس سے تھا ایک کو دوسرے سے ربط
میل کے ساتھ پھر کہاں آتش و خاک و باد و آب
جی نہ لگے گا روح کا اپنے ندیم کے بغیر
جائیں گے سب سوئے جناں آتش و خاک و باد و آب
کہتے تھے شاد لوگ سچ ایسوں کی دوستی ہی کیا
روح سے چھٹ گئے یہاں آتش و خاک و باد و آب

(2)

نالۂ دل میں تو پایا نہ اثر آخر شب
اے دعا تو مجھے محروم نہ کر آخر شب
اکثر اے دردِ جگر تجھ کو بھی غافل پایا
کون لیتا ہے مریضوں کی خبر آخر شب
شام سے یاس نے گھیرا تجھے ناحق اے دل
جاتی ہے عرش تلک آہ اگر آخر شب
خود بخود غنچۂ خاطر ہے شگفتہ میرا
دل نے کس بات کی پائی ہے خبر آخر شب
واسطہ ضبط کا آغازِ شب فرقت کے
چشم تر تو مجھے شرمندہ نہ کر آخر شب
دور جانا ہے مسافر۔ تجھے کیسی ہے یہ نیند
چونک مَل آنکھ اٹھا زاد سفر آخر شب
جھاڑتی جاتی ہے وہ راہ صبا بالوں سے
بوئے گل باغ سے جاتی ہے جدھر آخر شب
ٹھنڈے ٹھنڈے دل سوزاں سے نکل جا اے روح
کرتے ہیں موسم گرما میں سفر آخر شب
مطمئن ہو تو خدا کے لیے کچھ عرض کروں
دردِ دل بس، مجھے بے چین نہ کر آخر شب
بے خودی دل نہ اڑا کر کہیں لے جائے مرا
بیشتر چور کا رہتا ہے خطر آخر شب
کہیں اس سیل میں بہہ جائے نہ دفتر غم کا
جوش اپنا نہ دکھا دیدۂ تر آخر شب
شوقِ دیدار میں عالم ہے یہ آنکھوں کا مری
جیسے جاگے ہوئے انساں کی نظر آخر شب

بستر اپنا ہوا یوں اشکوں سے تر آخر شب
ہوگیا دل کو یقیں صاف کہ پانی برسا
تیرے کوچے میں کہیں شاد نہ ہو پوچھ تو لے
اک بڑا شور تھا نالوں کا اِدھر آخر شب

(3)

فائدہ اے شاد کیا تکمیل سے
یہ زمانہ ہے پرآشوب و خراب
ہر طرف ہے جہل کا بازار گرم
اہلِ فن کیونکر نہ کھائیں پیچ و تاب
مدعی علم ہر بے ربط ہے
کیا ہے اس جہل مرکب کا جواب
جاہلانِ علم و معنی و بدیع
ہادیان شاہراہ ناصواب
طبع موزوں پر بھروسا نظم میں
بے پڑھے سارے فنوں میں کامیاب
پسلیاں بندش سے توڑیں شعر کی
اصطلاحوں کی کریں مٹی خراب
معنیِ تصنیف سے بھی بے خبر
کرسکیں ہرگز نہ فرقِ فصل و باب
باکمالوں سے بھریں، آ آ کے وہ
تا کہے ذی معرفت ہر شیخ و شباب
خود غلط، املا غلط، انشا غلط
یو سخن فہموں کو دیں اکثر جواب
اس زمیں میں ہے ہماری بھی غزل
ہم نیبھی اس فن میں لکھی ہے کتاب
صرف اس تقریر پر بھی بس نہ ہو
سخت گوئی سے کریں اکثر خطاب
امتیاز رطب و یابس کچھ نہ ہو
ایک ہو ان کی نظر میں خاک و آب
نظم ہوں کوٹھوں کے مضموں شعر میں
فحش باتیں، کل مضامیں ناصواب
ہجو میں آلِ نبی کی منہمک
محو دل سے پرسش روز حساب
بے سروپا اعتراضوں پر غرور
کاملوں سے اس پہ خواہان جواب
خندہ ام آید ازیں طابات مفت
لَا اُبالِی صَوُتِہِم صَوتُ الکَلَابُ

(4)

کیا منہ جو دے سکوں تری تقریر کا جواب
بخشش تری ہے خود مری تقصیر کا جواب
لکھے گا یار کیا مری تحریر کا جواب
دیکھا نہیں نوشتۂ تقدیر کا جواب
آئینہ لے کے ہاتھ میں کہتا ہوں یار سے
لایا ہوں ڈھونڈھ کر تری تصویر کا جواب
صیاد جاں شکار ہے ترچھی نظر تری
ترکش میں ایک بھی نہیں اس تیر کا جواب

انتا ہوا کہ دل میں اترنے لگی ہے بات — دیں گے وہ سوچ کر مری تقریر کا جواب
زنداں میں غل مچانے لگی ہے جو بے محل — کڑیاں کڑک کے دیتی ہیں زنجیر کا جواب
ناز اپنی گفتگو پہ نہ کر او فضول گو — خاموشیاں ہیں اس تری تقریرکا جواب
ایسا نہ ہو کہ دست ستم کو لگے نظر — اے نوجواں نہ دے فلک پیر کا جواب
دل میں ہے گردِ غم تو کدورت مزاج میں — تعمیر جیسے ہوتی ہے تعمیر کا جواب
جی میں یہ ہے کہ آپ حلق اپنا گھونٹ دوں — سوچا ہے میں نے نالۂ شبگیر کا جواب
قاصد کو چلتے وقت قسم دی رسول کی — ہاں میرے پاس اب نہیں تاخیر کا جواب

اے شاد ہاتھ پاؤں ہلانے سے بھی گئے
موت آکے دے گئی مری تدبیر کا جواب

(5)

شمع فانوس میں ہے اپنی لطافت کے سبب — روشنی بند ہے شیشے کی کثافت کے سبب
رنج سے ہوتی ہے ہر چند بشر کو تکلیف — تو بھی انسان ممیز ہے اس آفت کے سبب
تب تو ہے خاک میں بھی شعلۂ جنبانِ حیات — کیوں الگ رہ نہ سکی روح لطافت کے سبب
ابنِ آدم ہوں مرے دم سے جہاں کی رونق — قدسیوں سے بھی میں اعلیٰ ہوں محبت کے سبب

کہنے والے مجھے جو چاہیں کہیں کیا پروا
سن کے خاموش ہوں اے شاد شرافت کے سبب

ردیف ی

(1)

کٹتی ہے بری طرح جوانی — بس طولِ حیات مہربانی
مضموں کا گھمنڈ شاعری ہے — دعوائے زباں فقط زبانی
سوتا سنسار جاگتا حق — سچی تھی اسی قدر کہانی
اب ایک کا بھی پتہ نہیں ہے — چھوڑی تو بہت سی تھی نشانی
بے بال و پر ہوئے نہ افسوس — مرنے پہ بھی جنت آشیانی
اب ان کے ستم کی کچھ نہ پوچھو — جوڑا پہنا ہے آسمانی
تصویر تری ہے اب بھی دل میں — اے مجمعِ دوستان جانی
ضدین ہوئے ہیں جمع ہم میں — آشفتہ سری و خوش بیانی

منوا دیا خود کو ہاں یہ مانا ۔ تونے مگر ایک کی نہ مانی
باقی ہے بلائے خاک گشتن بالائے بلائے آسمانی
آنا ہو تو آ کہاں تلک صبر اے وجہِ بقائے زندگانی
اے جوشِ شباب تیرے اوپر صدقے ہے حیات جاودانی
اتنا مگر اے فلک سمجھ لے پیری ہے تری مری جوانی
بے لطف اگر گئی تو افسوس اے لطف فزائے زندگانی
کیا تھا مرے مٹنے والے دل میں لے دے کے اک آن وہ بھی آنی
موقوف ہے شاید اس جہاں پر اے روح لقائے یار جانی
مشتاق ہوں کان تک پہنچ جا اے مژدۂ مرگ ناگہانی
بدتر شبِ ہجر سے بھی تو ہے اے خانہ خراب بدگمانی
کچھ کام تو لو حیات سے بھی شاؔد
پیری و خیالِ نوجوانی

(2)

غم سے اس دل کو نہ میل اور نہ ساز آتا ہے اور نہ کم بخت ترے عشق سے باز آتا ہے
لوگ کیوں جمع ہیں، میں کیا، مرا مرنا کیا چیز ہو نہ ہو کوئی تو دیوانہ نواز آتا ہے
کھل گیا ہے جو مرے شوق کا احوال تو اب نالہ بھی سینے سے کرتا ہوا ناز آتا ہے
قید تن سے ابھی آزاد نہ ہونادمِ نزع ٹھہر اے روح مرا بندہ نواز آتا ہے
کھینچ لے دل کو مرے دور سے یہ ہے منظور تا کمر کھولے ہوئے زلفِ دراز آتا ہے
غم نے بے صبر کیا مجھ کو جنوں سے رسوا جو یہاں آتا ہ وہ دشمن راز آتا ہے
رک گئے کیوں درِ جاناں پہ قدم اے زاہد آ حقیقت میں اگر سوئے مجاز آتا ہے
دلکو بہلاتے رہے شاؔد شب ہجر میں یوں
اب سحر ہوتی ہے اب وقت نماز آتا ہے

(3)

زباں پہ آہ کے ساتھ اس کا نام آتا ہے یہ درد کیا شب فرقت میں کام آتا ہے
جلو میں پیر مغاں اہتمام میں ساقی یہ آمد آمد جم ہے کہ جام آتا ہے
اب ارتباط فقط رہ گیا ہے یہ ان کا کہ خط میں غیر کے لکھ کر سلام آتا ہے

ملے جو دل تو یہ کہنا کہ اپنی منزل پر — سحر کا بھولا ہوا وقتِ شام آتا ہے
کیا یہ کام دراندازیوں نے غیروں کی — وہاں سے خط نہ زبانی پیام آتا ہے

بصدق پیر مغاں کو دعائیں دے اے شادؔ
وہ دیکھ جام علیہ السلام آتا ہے

(4)

کہیں سے جب صدائے نالہ و فریاد آتی ہے — تڑپ جاتا ہے دل اپنی مصیبت یاد آتی ہے
کیا ہے روز محشر اُس نے وعدہ بے نقابی کا — قضا تیری بھی لے اے چرخ بے بنیاد آتی ہے
بتو حق حق کہو تم کو چھپانے کی ضرورت کیا — وفا بھی جانتے ہو، یا فقط بیداد آتی ہے
اسے بھی آزمایا عمر بھر اور بے اثر پایا — ہمیں لے دے کے اے غم خوار اک فریاد آتی ہے
بہت دشوار ہے جلد اس تعلق کو مٹا دینا — قفس میں بوئے گل کوسوں سے اے صیاد آتی ہے
ارسطو سا ملے کامل تو اس سے پوچھئے چل کر — حسد کھودے کوئی ایسا دوا اُستاد آتی ہے
بہار آئے نہ آئے پوچھ رکھ لینا تو واجب ہے — بتا بیڑی پنہانی بھی تجھے حداد آتی ہے
جفا آمیز ادائیں یاد ہیں گر تیری آنکھوں کو — مجھے بھی آہ کرنی اے ستم ایجاد آتی ہے

تعجب کچھ نہ سمجھو در تلک گر آ کے پہنچے ہو
نہ گھبراؤ کوئی دم میں قضا اے شادؔ آتی ہے

(5)

بھولے بھٹکے جو صبا تا قفس آجاتی ہے — پر نہیں، باغ کی لیکن ہوس آجاتی ہے
کارواں چھوٹ گیا، ہوگئی مدت لیکن — اب بھی کانوں میں صدائے جرس آجاتی ہے
سونگھ لیتا ہوں، نظر پڑتی ہے جب پھولوں پر — بوئے ہمدردئ فریاد رس آجاتی ہے
گو کہ چھوٹے ہوئے مدت ہوئی تو بھی صیاد — دل میں سو مرتبہ یاد قفس آجاتی ہے
لب پہ بیمار محبت کے اگر دیر تلک — کان رکھیے تو صدائے نفس آجاتی ہے

مے سے توبہ کیے مدت ہوئی لیکن اے شادؔ
دیکھ لیتا ہوں تو اب بھی ہوس آجاتی ہے



امام المتغزلین

حسرت موہانی

(ولادت 1298ھ/ 81-1880ء۔ وفات 13/ مئی 1951ء)

- حسرت کا نام سید فضل الحسن تھا اور تخلص حسرت۔
- حسرت موہانی قصبہ موہان میں اپنے خاندانی مکان میں جسے "بارہ دری" کہا جاتا تھا۔ 1298ھ/ 81-1880ء میں پیدا ہوئے۔
- حسرت موہانی کا انتقال اتوار 13/ مئی 1951ء میں فرنگی محل لکھنؤ میں ہوا۔
- حسرت کے والد کا نام سید اظہر حسن اور والدہ کا نام شہر بانو بیگم تھا۔
- حسرت کے دادا کا نام سید مہر الحسن اور پردادا کا نام سید مظہر حسن تھا۔
- حسرت کے سات بھائی بہن تھے۔
- حسرت کے آباواجداد میں ایک بزرگ سید محمود نیشاپوری 611ھ میں ترک وطن کر کے التمش کے زمانے میں 615ھ میں ہندوستان آئے اور موہان پہنچ کر مستقل سکونت اختیار کر لی۔
- سید محمود نیشاپوری کے تعلق سے ہی حسرت نے یہ شعر کہا ہے:

کیوں نہ ہوں اردو میں حسرت ہم نظیری کے نظیر
ہے تعلق ہم کو آخر خاک نیشا پور سے

- حسرت کی پہلی بیوی نشاط النسا بیگم ان کی چچازاد بہن تھیں۔
- حسرت نے اپنی پہلی جیل یاترا کے دوران ان پر ایک غزل کہی تھی جس کی ردیف ہے "نشاط"
- حسرت نے 1894ھ میں موہان مڈل اسکول سے مڈل کا امتحان پورے صوبے مین امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا اور مزید تعلیم کے لیے سرکاری وظیفے کے حق دار ہوئے تھے۔
- حسرت نے 1899ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول فتح پور سے انٹرنس کا امتحان اول درجے میں خاص امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔
- مزید تعلیم کے لیے حسرت علی گڑھ آئے اور جب وہ پہلی بار علی گڑھ میں داخل ہوئے تو وہاں کے موجود طالب علموں نے ان کی ہیئت دیکھ کر انہیں "خالہ جان" کہا۔
- حسرت چار سال تک علی گڑھ کے طالب علم رہے۔ بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور "خالہ جان"

"سے "مولانا حسرت موہانی" بن گئے۔

- حسرت نے 1903ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا۔
- علی گڑھ میں حسرت کا نام تین بار مقامی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے پرنسپل نے "فرد سیاہ" میں درج کیا تھا۔
- محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ جنوری 1902ء میں حسرت کے ستائس اشعار کی ایک نظم شائع ہوئی تھی اس میں یہ شعر بھی ہے جو مشہور ہے:

پھیر لی پیر مغاں نے ہم سے گر چشم کرم
ہم کو ہے کافی نگاہِ فیض بخش ماریسن

اس شعر میں پیر مغاں سے مراد سرسید ہیں۔

- میں تو سمجھا تھا قیامت آگئی — خیر پھر صاحب سلامت ہوگئی
یہ حسرت کی پہلی غزل ہے جو انھوں نے اپنی عمر کے بارہویں یا تیرہویں سال میں لکھی تھی:
- بولے کوئے یار سے باوصف زعم — نکہت باد صبا ملتی نہیں
یہ حسرت کی آخری غزل ہے جو انھوں نے 20 نومبر 1950 کو لکھی تھی۔
- حسرت نے دو مرتبہ لندن کا سفر کیا تھا۔
- نیاز فتح پوری حسرت کے عزیز ترین اور بچپن کے دوست تھے۔
- بہت سے نقادوں نے غزل کی نشاۃ ثانیہ کا سہرا حسرت کے سر باندھا ہے۔
- جدید اردو غزل کو سمت و رفتار حسرت نے عطا کی ہے۔
- حسرت کی شاعری کے استاد تسلیم تھے۔
- تسلیم، نسیم دہلوی کے شاگرد تھے اور نسیم مومن کے۔ حسرت اس سلسلۂ تلمذ پر ناز کرتے تھے۔
- حسرت کی اصغر گونڈوی سے بھی دوستی تھی۔
- حسرت نے بی اے کرنے کے فوراً بعد 1903ء میں اپنا سیاسی کیریئر شروع کیا تھا۔
- جب 1916ء میں کانگریس لیگ سمجھوتہ ہوا تو حسرت مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔
- 1946ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر یوپی اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔
- حسرت تین بار جیل گئے۔
- پہلی بار 23 رجون 1908ء کو حسرت کو بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے دو سال کی سزا اور پانچ سو روپے جرمانہ عائد کیا گیا۔

جرمانے کی رقم وصول کرنے کے لیے پولیس نے ان کی ذاتی لائبریری نیلام کردی تھی۔

- حسرت کی گرفتاری اردوئے معلّیٰ (اپریل 1908ء) میں ''مصر میں انگریزوں کی تعلیمی پالیسی'' کے عنوان سے مضمون، چھاپنے کی وجہ سے ہوئی تھی کیوں کہ حکومت نے اس مضمون کو باغیانہ قرار دیا تھا۔
- حسرت دوسری بار 13/اپریل 1916ء کو جیل گئے۔
- حسرت پہلے مجاہد آزادی ہیں جنھوں نے 1921ء میں احمد آباد کانگریس کے سالانہ جلسے میں مکمل آزادی کی تجویز پیش کی تھی۔
- اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی اس کی پاداش میں انھیں چھ سال کی سزا دی گئی اور تیسری بار جیل گئے۔ گرفتاری 14/اپریل کو کانپور میں عمل میں آئی)
- حسرت سودیشی تحریک کے بہت بڑے علم بردار اور مبلغ تھے۔
- حسرت نے 11/بار حج کیا تھا۔
- مولانا محمد علی خاں اثر رام پوری نے حسرت کی وفات پر آٹھ اشعار کا قطعہ تاریخ کہا ہے۔ جس کا مطلع ہے:

کاملان ادب و شعر پہ آیا ہے وہ سال
جس میں اکثر نے پیا ساغر صہبائے اجل

- آخری شعر سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ شعر ہے:

پوچھا جب مصرع تاریخ تو آئی یہ ندا
حاجی کاملِ حق گو و شہنشاہِ غزل

کلیاتِ حسرت سے ردیف 'الف' اور 'ی' کی پانچ پانچ غزلیں

ردیف 'الف'

(1)

لاؤں کہاں سے حوصلہ آرزوِ سپاس کا
جب کہ صفاتِ یار میں دخل نہ ہو قیاس کا

عشق میں تیرے دل ہوا ایک جہانِ بے خودی
جان خزینہ بن گئی حیرتِ بے قیاس کا

رونق پیرہن ہوئی خوبیِ جسمِ نازنین
اور بھی شوخ ہوگیا رنگ ترے لباس کا

لطف و عطائے یار کی عام ہیں بس کہ شہرتیں
قلبِ گنہ گار میں نام نہیں ہراس کا

وقت جب آئے اے خدا خاتمۂ حواس کا
دل کو ہو تجھ سے واسطہ، لب پہ ہو نامِ مصطفیٰ
طے نہ کسی سے ہو سکا تیرے سوا معاملہ
جانِ امیدوار کا حسرتِ محوِ یاس کا

(2)

حسنِ بے پروا کو خود بین و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
پڑھ کے تیرا خط مرے دل کی عجب حالت ہوئی
اضطراب شوق نے اِک حشر برپا کر دیا
ہم رہے یاں تک تری خدمت میں سرگرمِ نیاز
تجھ کو آخر آشنائے نازِ بے جا کر دیا
اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اُس نگاہِ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا
عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذرّوں کو کیا قطروں کو دریا کر دیا
کیوں نہ ہو تیری محبت سے منوّر جان و دل
شمع جب روشن ہوئی گھر میں اجالا کر دیا
تیری محفل سے اٹھاتا غیر مجھ کو کیا مجال
دیکھتا تھا میں کہ تو نے بھی اشارہ کر دیا
سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

(3)

رنگ سوتے ہیں چمکتا ہے طرحداری کا
طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا
مایۂ عشرتِ بے حد ہے غمِ قید وفا
مَیں شناسا بھی نہیں رنجِ گرفتاری کا
جورِ پیہم نہ کرے شانِ توجہ پیدا
دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا
ہیں جو اے عشق تری بے خبری کے بندے
بس ہو اُن کا تو نہ لیں نام بھی ہشیاری کا
کٹ گیا قید میں ماہِ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

(4)

تجھ سے وہ مِلا شوق سے اور تو نے نچانا
حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا
ہے ایک درِ پیرِ مغاں تک تو رسائی
ہم بادہ پرستوں کا کہاں اور ٹھکانا
مخصوص غمِ عشق ہیں ہم لوگ، ہمارا
اچھا نہیں اے گردشِ افلاک ستانا
صد شکر غمِ ہر دو جہاں سے ہے وہ فارغ
جو دل ہے ترے تیرِ محبت کا نشانا

اب عشق کا وہ حال نہ ہے حسن کا وہ رنگ
باقیِ ہے فقط عہدِ تمنا کا فسانہ

آتی ہے تری یاد سو حسرت کو شبِ غم
ہر بار اُسے افسانۂ دل کہہ کے سنانا

(5)

کوئی بھی پُرساں نہیں حالِ دِلِ رنجور کا
یہ ستم دیکھو دیارِ شوق کے دستور کا

جاتے جاتے رہ گیا وہ نازنیں صبحِ وصال
ناز بردارِ اثر ہوں گریہ مجبور کا

سر اُٹھائے بزمِ جاناں میں بھلا کس کی مجال
رُعب غالب ہے یہ اُس کے جلوۂ مغرور کا

ہے غضب کی دلفریبی آج حسنِ ماہ میں
پھر بھی دے اک جام ساقی بادۂ پُرنور کا

خاطرِ مایوس میں نقشِ امیدِ وصلِ یار
نور ہے صحرا میں گویا اِک چراغِ دُور کا

یک قلم بے سود ہے اظہارِ حالِ آرزو
حُسنِ بے پروا کے آگے عشق نا منظور کا

مستیِ عیشِ دو عالم کی نہیں پروا مجھے
دیکھنے والا ہوں میں اس نرگسِ مخمور کا

ہے سپردِ خاک حسرت داں جو اِک یارِ عزیز
قصد اک مدّت سے ہم رکھتے ہیں گورکھپور کا

ردیف ی

(1)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دوعالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

(2)

لایا ہے دل پر کتنی خرابی
اے یار تیرا حسنِ شرابی

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکسِ مے سے شیشہ گلابی

عشرت کی شب کا وہ دور آخر (ق) نورِ سحر کی وہ لاجوابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں کیفیت اُن کی وہ نیم خوابی
بزم طرب ہی وہ بزم، کیوں ہو ہم غمزدوں کو واں باریابی
اس نازنیں نے باوصف عصمت (ق) کی وصل کی شب وہ بے حجابی
شوق اپنی بھولا گستاخ دستی دل ساری شوخی حاضرجوابی
وہ روے زیبا ہے جان خوبی ہیں وصف جس کے سارے کتابی
اس قید غم پر قربان حسرت
عالی جنابی گردوں رکابی

(3)

اور تو پاس مرے ہجر میں کیا رکھا ہے اک ترے درد کو پہلو میں چھپا رکھا ہے
دل سے اربابِ وفا کا ہے بھلانا مشکل ہم نے یہ اُن کے تغافل کو سُنا رکھا ہے
تم نے بال اپنے جو پھولوں میں بسا رکھے ہیں شوق کو اور بھی دیوانہ بنا رکھا ہے
سخت بے درد ہے تاثیر محبت کہ انھیں بسترِ ناز پہ سوتے سے جگا رکھا ہے
آہ وہ یاد کہ اُس یاد کو ہوکرمجبور دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے
کیا تامل ہے مرے قتل میں اے بازوِ یار ایک ہی وار میں سرتن سے جدا رکھا ہے
حسن کو جور سے بیگانہ نہ سمجھو، کہ اسے یہ سبق عشق نے پہلے ہی پڑھا رکھا ہے
تیری نسبت سے ستمگر ترے مایوسوں نے داغ حرماں کوبھی سینے سے لگا رکھا ہے
کہتے ہیں اہلِ جہاں درد محبت جس کو نام اسی کا دل مضطر نے دوا رکھا ہے
نگہ یار سے پیکانِ قضا کا مشتاق دلِ مجبور نشانے پہ کھلا رکھا ہے
اس کا انجام بھی کچھ سوچ لیا ہے حسرت
تو نے ربط اُن سے جو اس درجہ بڑھا رکھا ہے

(4)

دل کو تری دزدیدہ نظر لے کے گئی ہے اب یہ نہیں معلوم کدھر لے کے گئی ہے
اس بزم سے آزردہ نہ آئے گی محبت آئینِ وفا مدنظر لے کے گئی ہے
جب لے کے گئی ہے ہمیں تاکوے...... مجبوری دل خاک بسر لے کے گئی ہے
پہلے ہی سے مایوس نہ کیوں ہو کہ دعا کو قسمت مری محروم اثر لے کے گئی ہے

اللہ رے کافر ترے اُس حسن کی مستی　　جو زلفِ تری تا بہ کمر لے کے گئی ہے
مغموم نہ ہو خاطرِ حسرت کہ تلک تک
پیغامِ وفا بادِ سحر لے کے گئی ہے

(5)

نہ ہو اس کی خطا پوشی یہ کیوں ناز گنہگاری　　نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سیہ کاری
ستم تم چھوڑ دو میں شکوہ سنجیہائے ناچاری　　کہ فرض عین ہے کیش محبت میں رواداری
وفا سے دشمنی رکھ کر مرے دل کی طلبگاری　　بہت مشکل ہے اس جنس گرامی کی خریداری
ہوئیں ناکامیاں بدنامیاں رسوائیاں کیا کیا　　نہ چھوٹی ہم سے لیکن کوے جاناں کی ہواداری
وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ آغاز محبت میں　　نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری
نہیں غم جیب و دامن کا مگر ہاں فکر ہے اتنی　　نہ اٹھے گا مرے دستِ جنوں سے رنجِ بیکاری
نہ چھوڑا مرتے دم تک ساتھ بیمارِ محبت کا　　قسم کھانے کے قابل ہے ترے غم کی وفاداری
نہ اُن کو رحم آتا ہے نہ مجھ سے صبر ہے ممکن　　کہیں آسان ہو یارب محبت کی یہ دشواری
وفورِ اشک پیہم سے ہجوم شوق بے حد میں　　مری آنکھوں سے ہے اک آبشار آرزو جاری
غضب رنگینیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی　　ہوئی ہے جن سے دامانِ محبت پر یہ گلکاری
نہیں کھلتی مری نسبت تری اے حیلہ جو مرضی　　کہ ہے اقرار دلجوئی نہ انکار ستمگاری
نہ کر اتنا ستم ہم درد مندوں پر کہ دنیا سے　　مبادا ایک قلم اٹھ جائے تہذیب وفاداری
رواں ہے قافلہ سوے عدم ارباب محنت کا　　گیا پہلے ہی دل اب جانِ محزوں کی تیاری
خوشی سے ختم کر لے سختیاں قیدِ فرنگ اپنی　　کہ ہم آزاد ہیں بیگانۂ رنج دل آزاری
نہ دیکھے اور دل عشاق پر پھر بھی نظر رکھے　　قیامت ہے نگاہِ یار کا حسنِ خبرداری
یہی عالم رہا گر اس کے حسنِ سحر پرور کا　　تو باقی رہ چکی دنیا میں راہ و رسم ہشیاری
وہ جرمِ آرزو پر جس قدر چاہیں سزا دے لیں　　مجھے خود خواہش تعزیر ہے ملزم ہوں اقراری
چلا برسات کا موسم نہ چھوٹے قیدِ غم سے ہم　　بڑی بے لطیفوں میں اب کی گزرا وقتِ میخواری
نسیم دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت
جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسوں کاری



یاسیات کے امام

فانی بدایونی

(13 ستمبر 1879ء-1941ء)

- نام شوکت علی خاں تھا اور تخلص پہلے شوکت بعد میں فانی۔
- فانی بدایوں کے ایک قصبے میں 13 ستمبر 1879ء میں پیدا ہوئے۔
- فانی کا انتقال 1941ء میں حیدر آباد میں ہوا۔
- فانی کے والد کا نام شفاعت علی خاں تھا جو تھانے دار تھے۔
- فانی کے جدِ اعلیٰ اصالت خاں شاہ عالم بادشاہِ دہلی کے زمانے میں کابل سے ہندوستان آئے۔
- فانی کا خاندانی تعلق یوسف زئی افغانوں کے قبیلے عمر خیل سے تھا۔
- فانی کے پردادا کا نام بشارت خاں تھا۔
- فانی نے گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں سے انٹرنس امتحان 1897ء میں پاس کیا۔
- فانی نے بی۔اے کی ڈگری بریلی کالج سے 1901ء میں حاصل کی۔
- فانی نے علی گڑھ میں ایل ایل بی میں 1906ء میں داخلہ لیا۔
- فانی نے علی گڑھ سے ایل ایل بی کی گری 1908ء میں حاصل کی۔
- اس کے بعد ہائی کورٹ کا امتحان پاس کیا اور لکھنؤ میں وکالت شروع کر دی۔
- فانی کی شادی قصبہ ایکری ضلع بدایوں کے زمیندار انتظار علی خاں کی صاحبزادی شاہ زمانی بیگم سے 1903ء میں ہوئی۔
- فانی کی زمانی بیگم سے تین اولادیں ہوئیں۔
- فانی نے گیارہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور نام کی مناسبت سے شوکت تخلص اختیار کیا۔
- فانی نے اپنی پہلی غزل 1890ء میں کہی جو رندانہ خیالات پر مشتمل تھی۔

آیا ہے آج ہاتھ میں ساغر شراب کا ساقی اس میں ڈال دے سب میکدے کے خم
یا دست نازنین میں ہے ساغر شراب کا لالہ پہ جھک پڑی ہے گلِ یاسمن کی شاخ

- فانی نے 1898ء میں اپنا پہلا دیوان مرتب کر لیا تھا لیکن ان کے والد نے اسے غصے سے نذرِ آتش کر دیا تھا۔

- شوکت علی خاں فانی بدایونی نے شوکت کی جگہ فانی تخلص 1899ء میں اختیار کیا۔
- فانی 1906ء سے 1917ء تک شاعری سے کنارہ کش رہے۔
- فانی کی آخری مطبوعہ غزل جوان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ اس کا ایک مصرعہ یہ ہے ع
  یہاں اب ایک بھی دل درد کے قابل نہیں ملتا
- فانی شاعری میں حالی سے متاثر نظر آتے ہیں۔
- فانی کی نظموں میں ''علم''، ''دار فانی''، ''غمازی'' اور مختلف قطعات پر حالی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔
- فانی کے کلام میں غربت کا لفظ بار بار آیا ہے۔
- فانی کی غزل کی خصوصیات ''قنوطیت'' ہے۔
- فانی نے شیکسپیئر کے طربیہ ڈرامے Much ado about notihng (مچ اڈو باؤٹ نتھنگ) اور ملٹن کی نظم Comus (کومس) کا اردو ترجمہ کیا تھا، جو ضائع ہو گیا۔
- 1906ء میں جب فانی علی گڑھ میں تھے تو ان کا دوسرا دیوان چوری ہو گیا۔
- فانی نے دو مرتبہ حیدر آباد کا سفر کیا تھا۔
- فانی نے پہلی مرتبہ حیدر آباد کا سفر 1926ء میں کیا اور دوسری مرتبہ مہاراجہ کشن پرشاد کی دعوت پر 1927ء میں حیدر آباد گئے تھے۔
- فانی ماہ نامہ تسنیم کے مدیر اعلیٰ تھے جو دسمبر 1930ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔
- رشید احمد صدیقی نے فانی کو یاسیات کا امام کہا ہے۔
- میر لہجے کی بازیافت فانی کی شاعری میں ملتی ہے۔

کلام فانی (ناشر مشورہ بک ڈپو گاندھی نگر، دہلی) سے ابتدائی دس غزلیں

(1)

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گزر گیا — عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا
آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیران زندگی — یعنی جمال یار کا صدقہ اتر گیا
دنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ — بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا
شاید کہ شام ہجر کے مارے بھی جی اٹھیں — صبح بہار حشر کا چہرہ اتر گیا
آیا کہ دل گیا کوئی پوچھے تو کیا کہوں — یہ جانتا ہوں دل ادھر آیا ادھر گیا

میں نے دیا کہ تم نے لیا دل تمھیں کہو — تم دل میں پہلے آئے کہ دل پیشتر گیا
ہاں سچ تو ہے شکایت زخم جگر غلط — دل سے گزر کے تیر تمہارا کدھر گیا
دل کا علاج کیجیے اب یا نہ کیجیے — اپنا جو کام تھا وہ غم یار کر گیا
کیا کہیے اپنی گرم روی ہائے شوق کو — کچھ دور میرے ساتھ مرا راہبر گیا

فانی کی ذات سے غم ہستی کی تھی نمود
شیرازہ آج دفتر غم کا بکھر گیا

(2)

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہونا — عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا
چار زنجیر عناصر پہ ہے زنداں موقوف — وحشت عشق ذرا سلسلۂ جنباں ہونا
دل بس اک لرزش پیہم ہے سراپا یعنی — تیرے آئینہ کو آتا نہیں حیراں ہونا
فال افزونی مشکل ہے ہر آسانی کار — میری مشکل کو مبارک نہیں آساں ہونا
راحت انجام غم اور راحت دنیا معلوم — لکھ دیا دل کے مقدر میں پریشاں ہونا
دے ترا حسن تغافل جسے ہے چاہے فریب — ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا
ہائے وہ جلوۂ ایمن وہ نگاہ سر طور — فتنہ ساماں سے ترا فتنۂ ساماں ہونا

خاک فانی کی قسم ہے تجھے اے دشت جنوں
کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیاباں ہونا

(3)

خوشی سے رنج کا بدلا یہاں نہیں ملتا — وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا
ہزار ڈھونڈیے اس کا نشاں نہیں ملتا — جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا
مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی — تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا
بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ — کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا
وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا
تری تلاش کافی الجملہ ماحصل یہ ہے — کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا
بتا اب اے جرس دور میں کدھر جاؤں — نشان گرد رہ کارواں نہیں ملتا
مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا
تجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیز — بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا　　یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا
مجھے عزیز سہی قدر دل تمہیں کیوں ہو　　کمی تو دل کی نہیں دل کہاں نہیں ملتا

دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانیؔ
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

(4)

فغاں کے پردے میں سن میری داستاں صیاد　　کہ پھر رہے نہ رہے طاقتِ بیاں صیاد
ترا اشارہ ترا ساز برق سے نہ سہی　　تجھے خبر ہے کہ جلتا ہے آشیاں صیاد
نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں　　بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد
بس ایک آہ جہاں سوز کے اثر تک ہیں　　یہ خار برق قفس دام آسماں صیاد
نکل ہی جائیں گے نالے دہن سے خوں ہوکر　　زباں نہیں تو کھلے گی رگِ زباں صیاد
ستم رسیدۂ آوازۂ بیاں ہوں میں　　قفس میں کھینچ کے لائی مری زباں صیاد
چمن میں دل ہے تو میری نگاہ میں ہے چمن　　چمن سے تو مجھے لے جائے گا کہاں صیاد

یہ جذبِ ذوق اسیری ہے ورنہ اے فانیؔ
کہاں میں سوختہ دل مست پر کہاں صیاد

کیا کہیے کہ بیداد ہے تیری بیداد　　طوفان محبت کی ہے زد میں فریاد
دل محشر بے خودی ہے اللہ اللہ　　یاد اور کسی بھول جانے والے کی یاد
پابندی رسم بر طرف کیوں اے موت　　ان کے بھی کیے ہیں تو نے قیدی آزاد
اللہ یہ بجلیاں نہ کام آئیں گی　　آندھی ہی سے کیوں ہو آشیانہ برباد

دنیا جسے کہتا ہے زمانہ فانیؔ
ہے ایک طلسم اجتماعِ اضداد

(5)

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے　　اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے
آتی ہے صبا سوئے لحد ان کی گلی سے　　شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے
اللہ بچائے اثرِ ضبط سے ان کو　　بیداد تو ہے شکوۂ بیداد نہیں ہے
آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستمگر　　فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے

دنیا میں دیارِ دلِ فانیؔ کے سوا ہائے
کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے

(6)

دل چرا کر نگاہ ہے خاموش — ہوش اور مست ہو کے اتنا ہوش
مست کو چاہیے بلا کا ہوش — خم دیئے اور دیا نہ اذن خروش
ہر مسافر سے پوچھ لیتا ہوں — خانہ برباد ہوں کہ خانہ بدوش
ہوسِ جلوہ اور نظر! غافل — کہ نظر ہے صلائے جلوہ فروش
شاید اب منزلِ عدم ہے قریب — یاد خاک وطن ہے طوفاں جوش
فضل تیرا شفیع طاعت و زہد — عدل عاصیِ نواز عصیاں پوش

ہجر نے کی مفارقت فانؔی
لے مبارک ہو موت کا آغوش

(7)

میں ہوں اک مرکز ہنگامۂ ہوش و رم ہوش — دل اگر عالمِ ہستی سے تو سر عالم ہوش
عدم ہوش پہ ہے فطرتِ ہستی مائل — کس توقع پہ اٹھائے کوئی نازِ غم ہوش
بیخودی مایۂ عرفان خودی ہے یعنی — محرومِ جلوۂ اسرار ہے نا محرمِ ہوش
کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز — یہ ترا عالم، ہستی وہ ترا عالم ہوش
مظہر ...... و خلاق عدم ہے میری ذات — کچھ نہ تھا پر نہ بجز سلسلۂ برہم ہوش

عجب اک سانحۂ ہوش ربا تھی وہ نگاہ
میں ہوں اک عمر سے فانؔی برتن ماتم ہوش

(8)

کیا ہوا باندھی ہے صدقے نالۂ شبگیر کے — آسماں پر اکھڑے جاتے ہیں قدم تاثیر کے
بے مروت بن کے اب کیا سوئے صحرا جایئے — لوٹتے ہیں پاؤں پر حلقے مری زنجیر کے
ضبط باقی غم سلامت ہے تو سن لینا کبھی — آہ گھبرا کر نکل آئی کلیجہ چیر کے
وصل سے محروم میں ہوں ورنہ گستاخی معاف — بوسے لیتا ہے تصور آپ کی تصویر کے
مجھ کو مضطر دیکھ کر کہتا ہے قاتل پیار سے — آ اِدھر سایہ میں سو جا دامنِ شمشیر کے
ساتھ جائے گا مری میت کے سامانِ خلش — دل میں رکھ چھوڑے ہیں پیکاں میں نے تیرے تیر کے
میرے مرتے ہی دلِ بیتاب کو چین آ گیا — زندگی صدقے میں اتری گردشِ تقدیر کے
سعی درماں بے اثر فکر و دوا بے فائدہ — زخم دل اے چارہ گر قائل نہیں تدبیر کے
ان کے آتے ہی ارماں دل یہ کہہ کر لے — ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے
دیکھیے کیا ہو وہ اور آرزو گئی بے سبب — ہم خطا ناکردہ خوگر عذرِ بے تقصیر کے

دیکھ فانیؔ وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جارہا ہے دوش پر تقدیر کے

(9)

برہم ہے میری ذات سے سارا نظامِ عیش
ٹوٹا ہے میری عہد میں نیرنگ نامِ عیش
اب احتیاج شکوۂ اختر نہیں مجھے
مینائے خونِ عیش سے بھرتا ہوں جامِ عیش
گلشن صلائے عام اسیری ہے سربسر
پھیلا دیا بہار نے پھولوں پہ دامِ عیش
اے اجل اے جانِ فانی تو نے یہ کیا کردیا
مار ڈالا مرنے والے کو کہ اچھا کردیا
جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتاً چپ ہوگئے
وہ چھپایا رازِ دل ہم نے کہ افشا کردیا
کس قدر بیزار تھا دل مجھ سے ضبطِ شوق پر
جب کہا دل کا کیا ظالم نے رسوا کردیا
یوں چرائیں اس نے آنکھیں سادگی تو دیکھیے
بزم میں گویا مری جانب اشارہ کردیا
دردمندانِ ازل پر عشق کا احساں نہیں
درد یاں دل سے گیا کب تھا کہ پیدا کردیا
دل کو پہلو سے نکل جانے کی پھر رٹ لگ گئی
پھر کسی نے آنکھوں آنکھوں میں تقاضا کردیا
بچ رہا تھا ایک آنسو دار و گیر ضبط سے
جوشِ غم نے پھر اس قطرے کو دریا کردیا
فانیؔ مہجور تھا آج آرزومندِ اجل
آپ نے آکر پشیمانِ تمنا کردیا

(10)

حجاب اگر من و تو کا نہ درمیاں ہوتا
پیامِ حسن محبت کی داستاں ہوتا
تری تلاش کا افسانہ گریباں ہوتا
رہِ مجاز کا ہر ذرہ اک زباں ہوتا
مرا وجود ہے میری نگاہ خود نہ شناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا
کمالِ ضبطِ غمِ عشق اے معاذاللہ
کہیں کہیں سے جو یہ ماجرا بیاں ہوتا
بنائے جلوہ گہ ناز ہے جبینِ نیاز
جو دردِ عشق نہ ہوتا تو دل کہاں ہوتا
تمام قوتِ غم صرفِ دل ہوئی ورنہ
زمیں زمیں ہی نہ ہوتی نہ آسماں ہوتا
سکونِ خاطرِ بلبل ہے اضطرابِ بہار
نہ موجِ بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا
تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز
کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا
مٹا دیا غمِ فرقت نے ورنہ میں فانیؔ
ہنوز ماتمی مرگِ ناگہاں ہوتا



رئیس المتغزلین

جگر مرادآبادی

(1890ء-1960)

- نام علی سکندر تخلص جگر
- علی سکندر جگر مرادآبادی 1890ء میں مرادآباد میں پیدا ہوئے۔
- جگر مرادآبادی کا انتقال گونڈہ میں 1960ء میں ہوا۔
- جگر کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع شاہ جہاں کے استاد تھے۔
- جگر کے والد علی نظر صاحب دیوان شاعر تھے اور خواجہ وزیر لکھنوی سے اصلاح لیتے تھے۔
- جگر نے 14 برس کی عمر میں شاعری شروع کی اور جگر تخلص اختیار کیا۔
- جگر نے شروع میں والد سے اصلاح لی پھر داغ اور منشی امیر اللہ تسلیم کو استاد بنایا۔
- جگر کی شاعری کے موضوعات وہی ہیں جو ان کے اساتذہ یعنی داغ و تسلیم کے ہیں جیسے معشوق کا سراپا، حسن کی ادائیں، عشق کی جاں سپاری وغیرہ۔
- جگر کی ملاقات اصغر سے 1919 میں ہوئی۔ اور جگر اصغر کے ساڑھو بھائی تھے۔
- جگر نے بارہ تیرہ سال کی عمر سے شراب پینا شروع کی تھی اور اصغر گونڈوی کے سمجھانے پر مے نوشی ترک کردی تھی۔
- جگر نے 3 شادیاں کی تھیں۔
- اصغر گونڈوی کے انتقال کے بعد جگر نے اصغر کی بیوی سے شادی کر لی تھی۔
- جگر کو کیرم، شطرنج اور طاش میں دلچسپی تھی۔
- 1942 میں فضل احمد فضلی کے مسلسل اصرار پر ایک فلم 'آسمانی مشاعرہ' میں جگر مرادآبادی نے داغ دہلوی کا پارٹ ادا کیا تھا۔
- جگر نے احباب کی خوشنودی اور تفنن طبع کے لیے 'دارالکہلا' قائم کی تھی۔
- 1954 میں جگر مرادآبادی نے حج کا فریضہ انجام دیا۔
- جگر کی زندگی میں ان کی موت کی خبر دو مرتبہ اڑی پہلی مرتبہ 1935 میں اور دوسری مرتبہ 1958 میں۔
- بیسویں صدی میں اردو غزل کے 4 ستون: فانی، حسرت، اصغر اور جگر ہیں۔

- آل احمد سرور سے جگر کی خاص دوستی تھی۔

اعزازات

- آخری مجموعہ 'آتش گل' کے انجمن ترقی اردو ہند کے 1958 کے ایڈیشن پر جگر صاحب کو ساہتیہ اکیڈمی کا 5 ہزار کا انعام 1959 میں ملا تھا۔
- جگر اپنے زمانے تک کے پہلے اردو شاعر تھے، جنھیں پدم بھوشن کا خطاب ملا تھا۔
- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی تھی۔

جگر کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- وہ (جگر) آج کل کے مشہور فلم ایکٹر کی طرح تھے کہ جہاں جاتے تھے اپنے ساتھ جم غفیر لے جاتے اور یہ ہی ان کا سب سے بڑا اعزاز تھا۔ (علی سردار جعفری)
- غزل اگر اردو کی آبرو ہے تو جگر بلاشبہ غزل کی آبرو ہیں۔ (سعادت علی صدیقی)

آتش گل کی ابتدائی دس غزلیں

(1)

ہر حقیقت کو بانداز تماشا دیکھا
خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا

جستجو میں تری یہ حاصلِ سودا دیکھا
ایک اِک ذرّے کا آغوشِ طلب وا دیکھا

آئینہ خانۂ عالم میں کہیں کیا دیکھا
تیرے دھوکے میں خود اپنا ہی تماشا دیکھا

ہم نے ایسا نہ کوئی دیکھنے والا دیکھا
جو یہ کہہ دے کہ ترا حسنِ سراپا دیکھا

دلِ آگاہ میں کیا کہیے جگر کیا دیکھا
لہریں لیتا ہوا اِک قطرے میں دریا دیکھا

کوئی شائستہ و شایانِ غمِ دل نہ ملا
ہم نے جس بزم میں دیکھا اسے تنہا دیکھا

(2)

یادش بخیر جب وہ تصور میں آگیا
شعر و شباب و حسن کا دریا بہا گیا

جب عشق اپنے مرکزِ اصلی پہ آگیا
خود بن گیا حسین، دوعالم پہ چھا گیا

جو دل کا راز تھا اُسے کچھ دل ہی پاگیا
وہ کرسکے بیاں، نہ ہمیں سے کہا گیا

ناصح فسانہ اپنا ہنسی میں اڑا گیا
خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا
دل بن گیا نگاہ، نگہ بن گئی زباں
آج اک سکوتِ شوق قیامت ہی ڈھا گیا
میرا کمالِ شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گئے میں زمانے پہ چھا گیا

(3)

کوئی جیتا کوئی مرتا ہی رہا
عشق اپنا کام کرتا ہی رہا
جمع خاطر کوئی کرتا ہی رہا
دل کا شیرازہ بکھرتا ہی رہا
غم وہ میخانہ، کمی جس میں نہیں
دل وہ پیمانہ کہ بھرتا ہی رہا
حسن تو تھک بھی گیا لیکن یہ عشق
کارِ معشوقانہ کرتا ہی رہا
وہ مٹاتے ہی رہے لیکن یہ دل
نقش بن بن کر ابھرتا ہی رہا
دھڑکنیں دل کی سبھی کچھ کہہ گئیں
دل کو میں خاموش کرتا ہی رہا
تم نے نظریں پھیر لیں تو کیا ہوا
دل میں اِک نشتر اُترتا ہی رہا

(4)

گدازِ عشق نہیں کم جو میں جواں نہ رہا
وہی ہے آگ مگر آگ میں دھواں نہ رہا
نہیں کہ دل مرا وقفِ غمِ نہاں نہ رہا
مگر وہ شیوۂ فرسودۂ بیاں نہ رہا
زہے وہ شوق جو پابندِ این و آں نہ رہا
خوشا وہ سجدہ جو محدودِ آستاں نہ رہا
حجابِ عشق کو اے دل بہت غنیمت جان
رہے گا کیا جو یہ پردہ بھی درمیاں نہ رہا
چمن تو برقِ حوادث سے ہوگیا محفوظ
مری بلا سے اگر میرا آشیاں نہ رہا
جنونِ سجدہ کی معراج ہے یہی شاید
کہ تیرے در کے سوا کوئی آستاں نہ رہا
کمالِ قرب بھی شاید ہے عینِ بعد جگر
جہاں جہاں وہ ملے میں وہاں وہاں نہ رہا

(5)

دل کو سکون، روح کو آرام آگیا
موت آگئی کہ دوست کا پیغام آگیا
جب کوئی ذکرِ گردشِ ایام آگیا
بے اختیار لب پہ ترا نام آگیا
غم میں بھی ہے سرور، وہ ہنگام آگیا
شاید کہ دورِ بادۂ گلفام آگیا

اصغر گونڈوی

(1884ء-1936ء)

- نام اصغر حسین تھا اور تخلص اصغر
- اصغر 3 جمادی الاوّل 1301ھ مطابق یکم مارچ 1884ء میں گورکھ پور میں پیدا ہوئے۔
- اصغر کا انتقال 1936ء میں الہ آباد میں ہوا۔
- اصغر کے والد کا نام منشی تفضّل حسین تھا۔
- اصغر عمر کے آخری دس سال چھوڑ کر تمام زندگی گونڈہ میں رہے۔ اس نسبت سے گونڈوی کہلائے۔
- اصغر نے تین شادیاں کیں۔
- پہلی شادی والدین نے اوائل عمر ہی میں کر دی تھی۔
- دوسری شادی اصغر نے چھٹن سے کی جو نسیم کی بڑی بہن اور جگر کی سالی تھی۔
- تیسری شادی اصغر نے نسیم مطلقہ جگر سے کی تھی۔
- اصغر کی سات لڑکیاں تھیں جو پہلی بیوی سے ہوئی تھیں۔
- اصغر نے 07-1906 میں با قاعدہ شاعری شرع کر دی تھی۔
- اصغر نے ابتداً منشی خلیل احمد وجد بلگرامی سے مشورۂ سخن کیا پھر منشی امیر اللہ تسلیم سے اصلاحِ سخن لی۔
- اصغر کی طبیعت تصوف کی طرف مائل تھی۔ اصغر شاہ عبدالغنی منگلوری سے بیعت تھے۔
- اصغر اردو مرکز لاہور سے 1936 میں ملازمت کی غرض سے وابستہ ہوئے تھے۔
- اصغر ہندوستانی پریس (جو الہ آباد میں تھا) سے نکلنے والے رسالہ 'ہندوستانی' کے ایڈیٹر بھی رہے۔
- اصغر اس کے بعد آخر عمر تک الہ آباد ہی میں رہے۔
- اصغر کے کلام کا نشاطیہ رنگ ہمیں فارسی شاعر حافظ کی یاد دلاتا ہے۔
- اصغر کے کلام میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے۔
- اصغر جدید غزل میں نرم لہجہ کے شاعر تھے۔

'نشاطِ روح' کی ابتدائی دس غزلیں

(1)

ادنیٰ سایہ حیرت کا کرشمہ نظر آیا
جو تھا پسِ پردہ سر پر وہ نظر آیا

(2)

پھر میں نظر آیا نہ تماشا نظر آیا
جب تو نظر آیا مجھے تنہا نظر آیا

اللہ رے دیوانگیِ شوق کا عالم
اک رقص میں ہر ذرۂ صحرا نظر آیا

اٹھے عجب انداز سے وہ جوشِ غضب میں
چڑھتا ہوا اک حسن کا دریا نظر آیا

کس درجہ ترا حسن بھی آشوب جہاں ہے
جس ذرے کو دیکھا وہ تڑپتا نظر آیا

اب خود ترا جلوہ جو دکھاوے وہ دکھاوے
یہ دیدۂ بینا تو تماشا نظر آیا

تھا لطف جنون دیدۂ خونابۂ فشاں سے
پھولوں سے بھرا دامن صحرا نظر آیا

(3)

دل نثار مصطفیٰ جاں پائمال مصطفیٰ
یہ اویس مصطفیٰ ہے وہ بلالِ مصطفیٰ

دونوں عالم تھے مرے حرف دعا میں غرق و محو
میں خدا سے کر رہا تھا جب سوالِ مصطفیٰ

سب سمجھتے ہیں اے شمعِ شبستانِ حرا
نور ہے کونین کا لیکن جمالِ مصطفیٰ

عالم ناسوت میں اور عالم لاہوت میں
کوندتی ہے ہر طرف برقِ جمالِ مصطفیٰ

عظمتِ تنزیہہ دیکھی شوکتِ تشبیہ بھی
ایک حال مصطفیٰ ہے ایک قالِ مصطفیٰ

دیکھیے کیا حال کر ڈالے شب یلدائے غم
ہائے نظر آئے ذرا صبح جمالِ مصطفیٰ

ذرہ ذرہ عالم ہستی کا روشن ہوگیا
اللہ اللہ شوکت و شان جمالِ مصطفیٰ

(4)

خوب دن تھے ابتدائے عشق کے
اب دماغ نالہ و شیون کہاں

اس رخ رنگیں سے آنکھیں سینکیے
ڈھونڈھیے اب آتشِ ایمن کہاں

سارے عالم میں کیا تجھ کو تلاش
تو ہی بتلا ہے رگِ گردن کہاں

خوب تھا صحرا پر اے ذوق جنوں
پھاڑنے کو نت نئے دامن کہاں

شوق سے ہے ہر رگ جاں جست میں
لے اڑے گی بوئے پیراہن کہاں



حیران ہے زاہد مری مستانہ ادا سے
سو راہ طریقت کھلی اک لغزش پا سے

اک صورت افتادگی نقش فنا ہوں
اب راہ سے مطلب نہ مجھے راہ نما سے

میخانہ کی اک روح مجھے کھینچ کے دیدی
کیا کردیا ساقی نگہ ہوش ربا سے

(5)

فتنہ سامانیوں کو خو نہ کرے
مختصر یہ کہ آرزو نہ کرے

پہلے ہستی کی ہے تلاش ضرور
پھر جو گم ہو تو جستجو نہ کرے

ماورائے سخن بھی ہے کچھ بات
بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

(6)

وہ اک دل و دماغ کی شادابیِ نشاط
گونا چمک کے اف تری برق نگاہ کا

وہ لذتِ الم کا جو خوگر سمجھ گئے
اب ظلم مجھ پہ ہے ستم گاہ گاہ کا

شیشے میں موج مے کو یہ کیا دیکھتے ہیں آپ
اس میں جواب ہے اس برقِ نگاہ کا

(7)

عشق ہی سعی مری عشق ہی حاصل میرا
یہی منزل ہے یہی جادۂ منزل میرا

یوں اڑائے لیے جاتا ہے مجھے دل میرا
ساتھ دیتا نہیں اب جادۂ منزل میرا

اور آجائے نہ زندانی وحشت کوئی
ہے جنوں خیز بہت شور سلاسل میرا

(8)

میں سراپا ہوں تمنا ہمہ تن درد ہوں میں
ہر بن مو میں تڑپتا ہے مرے دل میرا

داستاں ان کی اداؤں کی ہے رنگیں لیکن
اس میں کچھ خونِ تمنا بھی ہے شامل میرا

بے نیازی کو تری کچھ بھی پذیرانہ ہوا
شکر اخلاص مرا شکوۂ باطل میرا

(9)

ہے ایک ہی جلوہ جو ادھر بھی ہے اُدھر بھی
آئینہ بھی حیران ہے آئینہ نگر بھی

ہو نور پہ کچھ اور ہی اک نور کا عالم
اس رخ پہ جو چھا جائے مرا کیف نظر بھی

تھا حاصلِ نظارہ فقط ایک تحیر
جلوے کو کہے کون کہ اب گم ہے نظر بھی

(10)

مستی میں فروغ رخ جاناں نہیں دیکھا
سنتے ہیں بہار آئی گلستاں نہیں دیکھا

زاہد نے مرا حاصل ایماں نہیں دیکھا
رخ پر تری زلفوں کو پریشاں نہیں دیکھا

آئے تھے سبھی طرح کے جلوے مرے آگے
میں نے مگر اے دیدۂ حیراں نہیں دیکھا

اس طرح زمانہ کبھی ہوتا نہ پر آشوب
فتنوں نے ترا گوشۂ داماں نہیں دیکھا

ہر حال میں بس پیش نظر ہے وہی صورت
میں نے کبھی روئے شب ہجراں نہیں دیکھا

کچھ دعوی تمکیں میں ہے معذور بھی زاہد
مستی میں تجھے چاک گریباں نہیں دیکھا

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں
جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

مجھ خستہ و مہجور کی آنکھیں ہیں ترستی
کب سے تجھے اے سرو خراماں نہیں دیکھا

کیا کیا ہوا ہنگام جنوں یہ نہیں معلوم
کچھ ہوش جو آیا تو گریباں نہیں دیکھا

شائستہ صحبت کوئی ان میں نہیں اصغرؔ
کافر نہیں دیکھے کہ مسلماں نہیں دیکھا



غالب جنگ

یگانہ یاس چنگیزی

(1884ء-1956ء)

- نام مرزا واجد حسین تھا اور تخلص پہلے یاس پھر یگانہ۔
- تاریخی نام مرزا افضل علی بیگ تھا اور عرف میں مرزا یاس یگانہ چنگیزی مشہور ہیں۔
- یگانہ بقول خود 27 ذی الحجہ 1301ھ مطابق 17 اکتوبر 1884ء میں پٹنہ کے محلہ مغل پورہ میں پیدا ہوئے۔
- یگانہ کا انتقال 1956ء میں لکھنؤ میں ہوا۔
- مرزا یگانہ کے والد کا نام مرزا غلام حسین عرف مرزا پیارے صاحب تھا۔
- یگانہ کے جد اعلیٰ مرزا احسن بیگ مغلوں کے زمانے میں ہندوستان آئے اور سرکار دہلی کی فوج میں ملازم ہوئے۔ انھیں خدمات کے صلے میں چند جاگیریں پرگنہ حویلی عظیم آباد میں عطا ہوئیں۔
- یگانہ نے 1903 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔
- یگانہ نے 1904 میں کلکتہ کا سفر کیا اور مٹیا برج میں واجد علی شاہ کے خاندان کے دو افراد یعنی شہزادہ محمد یعقوب علی اور شہزادہ محمد یوسف علی مرزا کی انگریزی تعلیم پر مقرر ہوئے۔
- یگانہ نے 1905 میں لکھنؤ کا سفر علاج کی غرض سے کیا اور یہیں زندگی کا بڑا حصہ گزار دیا۔
- یگانہ نے لکھنؤ میں لکھنؤ کے نامور حکیم اور 'مباحثہ گلزار نسیم' یعنی 'معرکہ' چکبست و شرر' کے مرتب حکیم مرزا محمد شفیع کی بیٹی کنیز حسین سے 1913 میں شادی کی۔
- یگانہ نے پہلے سید علی خاں بے تاب عظیم آبادی سے مشورۂ سخن کیا پھر شاد عظیم آبادی سے اصلاحِ سخن لی۔
- یگانہ نے 21-1920 سے 1927 تک یاس اور یگانہ دونوں تخلص استعمال کیا۔
- 1927 میں یاس تخلص بالکل ترک کر کے صرف یگانہ استعمال کرنے لگے۔
- شعرائے لکھنؤ چونکہ غالب کے مقلد تھے اس لیے یگانہ اپنے آپ کو 'آتش کا مقلد' کہتے تھے۔
- یگانہ نے اپنے پہلے شعری مجموعے 'نشتر یاس' 1914 کے سرورق پر اپنے نام سے پہلے خاک پائے آتش لکھا ہے۔
- 'چراغِ سخن' میں اپنے آپ کو 'آتش پرست' لکھا ہے۔

- یگانہ نے اپنے آپ کو غالب شکن اور غالب کا چچا کہا ہے۔
- یگانہ کے غالب شکنی کا آغاز ان کے پہلے شعری مجموعے نشترِ یاس سے ہوتا ہے جو 1914 میں شائع ہوا۔
- یگانہ نے غالب شکنی کے متعلق ایک رسالہ 'غالب شکن' کے نام سے پہلی مرتبہ 1934 میں اور اضافوں کے ساتھ دوسری مرتبہ 1935 میں شائع کیا۔
- یگانہ اپنے نام کے ساتھ امام الغزل یا خداوند معانی یا ابوالمعانی یا مجاہدالعصر یا غالب جنگ لکھا کرتے تھے۔ لیکن ابوالمعانی اور امام الغزل لکھنا زیادہ پسند تھا۔
- یگانہ نے پہلی مرتبہ اپنے نام کے ساتھ چنگیزی کا اضافہ 1932 میں کیا۔
- ان کے رباعیوں کے مجموعے 'ترانہ' کا انتساب بھی چنگیز خان کے نام سے ہے جسے یگانہ 'پیغمبر قہر وعذاب' اور 'شہنشاہِ بنی آدم' سمجھتے تھے۔
- یگانہ نے 1919 میں 'انجمن خاصانِ ادب' کے نام سے ایک ادبی انجمن بنائی۔
- 1924 میں یگانہ اٹاوہ جا کر اسلامیہ ہائی اسکول میں ملازمت کرنے لگے۔
- یگانہ نے اٹاوہ سے رسالہ 'صحیفہ' جاری کیا۔
- اٹاوہ میں یگانہ کے فانی اور جگر سے دوستانہ مراسم رہے۔
- یگانہ 1926 میں اصغر اور جگر کے ساتھ لاہور گئے۔
- یگانہ کی ملاقات لاہور میں اقبال سے ہوئی۔ اقبال یگانہ کی زبان دانی کے معترف تھے۔
- یگانہ 1927 میں حیدرآباد گئے۔
- یگانہ اودھ اخبار سے بھی وابستہ رہے۔

'آیات وجدانی' کی ابتدائی دس غزلیں

(1)

من کہ بر نمی تا بم دردِ زیستن تنہا
صبح دم چساں بینم شمعِ انجمن تنہا

تا کجا اماں یا بد از ہجومِ جاں بازاں
گوشہ گیرِ فانوسے، بہرِ سوختن تنہا

ہر گلے و ہر خارے فتنہ ہا برانگیزد
الحذر دلِ حیراں صد بہار و من تنہا

ذوق می تواں دانست رنگِ حسنِ نادیدہ
شاہدیست غمازے، بوے پیرہن تنہا

طرفہ محشرے دارد از فریبِ فردائے
زندہ زیرِ پیراہن، مردہ در کفن تنہا

اے کہ کارہا کردی، مدفنے مہیا کن
تاب کے نہاں دارد عیبِ من کفن تنہا

چارۂ پشیمانی، خوش دلی و خوش کامی — توبہ از ریاکاراں، خندہا زمن تنہا
رہبرانِ خود گم را، جز دعا چہ فرمایم — پا شکستہ و حیراں، ماندہ در وطن تنہا
ناخدا زمن بگزر سوے دیگراں بنگر — کارِ من بہ دریا در دست و پا زدن تنہا
صد رفیق و صد ہمدم پر شکستہ و دل تنگ — داورا نمی زیبد بال و پر بہ من تنہا
نکتہ دانِ خود سازم میرزا یگانہ را
دل نمی تواں برداشت لذتِ سخن تنہا

(2)

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزہ نہ ملا — کمالِ صبر ملا، صبر آزما نہ ملا
مری بہار وخزاں جس کے اختیار میں ہے — مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا
جواب کیا، وہی آوازِ بازگشت آئی — قفس میں نالۂ جاں گاہ کا مزہ نہ ملا
امیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے — جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس — عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
ہزار ہاتھ اُسی جانب ہے منزلِ مقصود — دلیلِ راہ کا غم کیا، ملا ملا نہ ملا
بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ — کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ ملا
اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر — کہاں کے دَیر و حرم، گھر کا راستا نہ ملا
خوشا نصیب، جسے فیضِ عشق شور انگیز — بقدرِ ظرف ملا، ظرف سے سوا نہ ملا
سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور — گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے — وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا
نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل — خدا کا ذکر تو، کیا بندۂ خدا نہ ملا

(3)

مجھے دل کی خطا پر یاس شرمانا نہیں آتا — پرایا جرم اپنے نام لکھوانا نہیں آتا
برا ہو پائے سرکش کا کہ تھک جانا نہیں آتا — کبھی گم راہ ہو کر راہ پر آنا نہیں آتا
ازل سے تیرا بندہ ہوں، ترا ہر حکم آنکھوں پر — مگر فرمانِ آزادی بجا لانا نہیں آتا
مجھے اے ناخدا آخر کسی کو منہ دکھانا ہے — بہانہ کرکے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا
مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا — مجھے سر مار کر تیشے سے مرجانا نہیں آتا
دلِ بے حوصلہ ہے اک ذرا سی ٹھیس کا مہماں — وہ آنسو کیا پیے گا جس کو غم کھانا نہیں آتا

اسیرِ شوقِ آزادی مجھے بھی گدگداتا ہے — مگر چادر سے باہر پاؤں پھیلانا نہیں آتا
سراپا راز ہوں میں کیا بتاؤں، کون ہوں، کیا ہوں
سمجھتا ہوں مگر دنیا کو سمجھانا نہیں آتا

(4)

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے، تدبیر دیکھنا — منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو، ایک دن — میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا
مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے — راس آئے تم کو جوہرِ شمشیر دیکھنا
آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بندگانِ عشق — پڑجائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا
مردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت — ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
ہوش اڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر — آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
چونکے تو چشمِ شوق میں عالم سیاہ تھا — خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا
پروانے کرچکے تھے سرانجامِ خودکشی — فانوس آڑے آگیا، تقدیر دیکھنا
شاید خدا نخواستہ آنکھیں دغا کریں — اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا
اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور — بے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا
ہر خوب و زشت آپ ہی اپنا مثال ہے — حدِّ کمالِ کاتبِ تقدیر دیکھنا
بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یاسؔ
پھر آگے بڑھ کے خوبیِ تقدیر دیکھنا

(5)

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزل کا — نگاہِ شوق سے آگے تھا کارواں دل کا
چراغ لے کے کسے ڈھونڈتے ہیں دیوانے — نشاں تو دور ہے یاں نام تک نہیں دل کا
کبھی تو موج میں آئے گا تیرا دیوانہ — اشارہ چاہیے ہے جنبشِ سلاسل کا
ازل سے اپنا سفینہ رواں ہے دھارے پر — ہوا ہنوز نہ گرداب کا نہ ساحل کا
نہ سر میں نشہ ہے باقی نہ دل میں کیفیت — زباں پہ رہ گیا اک ذکرِ خیر محفل کا
وہ دستِ شل جو دعا کے لیے بھی اٹھ نہ سکے — ارادہ کون سے بل پر کرے گا ساحل کا
نہ جانے جھوٹ ہے یا سچ ہے وعدۂ فردا — اجل پہ فیصلہ ٹھہرا ہے حق عدم کی و باطل کا
پرائی موت کا احساں بھی ہے ہمیں منظور — کہیں طلسم تو ٹوٹے عدم کی منزل کا
خود اپنی آگ میں جلتا تو کیمیا ہوتا — مزاج داں نہ تھا پروانہ شمعِ محفل کا

ہوا پھری افسردہ دلوں کی رُتبدلی — اُبل پڑا ہے پھر رنگ نقشِ باطل کا
امید و بیم نے وہ راستا ہی چھوڑ دیا — چراغ گل ہوا، جب آستانۂ دل کا
جوابِ حسنِ طلب بے دلوں سے بن نہ پڑا — حیا سے گڑ گئے جب نام آگیا دل کا
فلک ہے دونوں طرف کا نگاہ باں جب تک — نہ اپنی آنکھ اٹھے گی نہ پردہ محمل کا

حضور دوست یگانہ کچھ ایسے غائب تھے
زبانِ گنگ تک آیا نہ ماجرا دل کا

(6)

چراغِ زیست بجھا دل سے اِک دھواں نکلا — لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا
دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلانا کیا؟ — نہ کوئی شعلہ اٹھا اور نہ کچھ دھواں نکلا
سنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دل مرحوم — اِدھر سے ملک عدم کا جو کارواں نکلا
تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے اخر — تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا
لہو لگاکے شہیدوں میں ہوگئے داخل — ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا
حریمِ نازمیں شاید کسی کو دخل نہیں — دلِ عزیز بھی ناخواندہ میہماں نکلا
نہاں تھا خانۂ دل ہی میں شاہدِ مقصود — جو بے نشاں تھا وہ دیوار درمیاں نکلا
ہے فنِ عشق کا استاد بس دلِ وحشی — مریضِ غم کا یہی اک مزاج داں نکلا
لگا ہے دل کو اب انجامِ کار کا کھٹکا — بہارِ گل سے بھی اک پہلوے خزاں نکلا
زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا الٹی — چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا
ہمارے صبر کی کھاتے ہیں اب قسم اغیار — جفا کشی کا مزہ بعدِ امتحاں نکلا
خوشی سے ہوگئے بدخواہ میرے شادی مرگ — کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا
اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا — خدا کی شان کہ دشمن نگاہ باں نکلا
دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ — جو سر اٹھا کے کوئی زیرِ آسماں نکلا
لحد سے بڑھ کے نہیں کوئی گوشۂ راحت — قیامت آئی جو اِس گھر میں میہماں نکلا
اب اپنی روح سے اور سیرِ عالم بالا — کنویں سے یوسفِ گم کردہ کارواں نکلا

کلامِ یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زباں نکلا

(7)

قفس کو جانتے ہیں یاس آشیاں اپنا — مکان اپنا، زمین اپنی، آسماں اپنا

ہوائے تند میں ٹھہرا نہ آشیاں اپنا — چراغ جل نہ سکا زیر آسماں اپنا
سنا ہے رنگِ زمانہ کا اعتبار نہیں — بدل نہ جائے یقیں سے کہیں گماں اپنا
بس ایک سایۂ دیوار یار کیا کم ہے — اٹھا لے سر سے مرے سایہ آسماں اپنا
مزے کے ساتھ ہوں اندوہ و غم تو کیا کہنا — یقیں نہ ہو تو کرے کوئی امتحاں اپنا
شریک حال ہوا ہے جو فقر و فاقہ میں — گڑھے گا ساتھ ہی کیا اپنے مہماں اپنا
عجیب بھول بھلیاں ہے منزل ہستی — بھٹکتا پھرتا ہے گم گشتہ کارواں اپنا
کدھر سے آتی ہے یوسف کی بوے مستانہ — خراب پھرتا ہے جنگل میں کارواں اپنا
جرس نے مژدۂ منزل سنا کے چونکایا — نکل چلا تھا دبے پاؤں کارواں اپنا
خدا کسی کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے — قفس کے سامنے جلتا ہے آشیاں اپنا
ہمارے قتل کا وعدہ ہے غیر کے ہاتھوں — عجیب شرط پہ ٹھہرا ہے امتحاں اپنا

ہمارا رنگ سخن پاس کوئی کیا جانے
سوائے آتش ہے کون ہم زباں اپنا

(8)

وائے نادانی کہ وقت مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
چشم پوشی شیوۂ ما، حیلہ جوئی تا کجا — اے کہ باشی غائبانہ در پیے آزارِ ما
پیشِ پا افتادہ بینی صد بلند و پست را — بہرۂ یابی اگر ازنشۂ پندارِ ما
ہر سکونِ مضطرب، آئینۂ صد انقلاب — تا سحر محوِ تماشا دیدۂ بیدارِ ما
کیست ازیں ہر دو کہ بکشاید درے از معرفت — زاہدِ شب زندہ دارے، یا دلِ بیدارِ ما؟
تا بہ چشمِ ما نیر زد جز متاعِ بے خودی — رخصت اے ہوش و خرد، رد کردۂ بازارِ ما
دوستانِ زندہ دل را خندہ بر لب سوختی — اے نگاہِ بے زبان، اے برقِ بے زنہارِ ما
زخمِ عبرت خوردہ ایم از دستِ نقاشِ ازل — خندۂ غفلت مزن بر پیکرِ خونبارِ ما

ہر کس از بزمِ یگانہ دست بر دل می رود
خویش را بیگانہ سازد محرمِ اسرارِ ما

(9)

پالا اُمید و بیم سے ناگاہ پڑ گیا — دل کا بنا بنایا گھروندا بگڑ گیا
الٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی — میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

شربت کا گھونٹ جان کے پیتا ہوں خونِ دل
غم کھاتے کھاتے منھ کا مزہ تک بگڑ گیا

بوے وفا کہاں چمنِ روزگار میں
دل ہٹ گیا ہے جیسے کوئی پھول جھڑ گیا

کس سادگی سے میں نے بڑھایا تھا دستِ شوق
ہتھے سے بدمزاج یکایک اکھڑ گیا

ایسے کے پاؤں چومیے یا پیار کیجیے؟
قدموں پہ میں جھکا تو وہ دونا اکڑ گیا

منھ زوریوں کا حوصلہ سرکارِ حسن سے؟
آخر پڑی وہ مار کہ چرسہ اُدھڑ گیا

دونوں کے دل سے پوچھیے انجامِ کارِ عشق
سِل گھستے گھستے گھس گئی بٹا رگڑ گیا

وہ مرد ہے جو زیر کرے دیوِ نفس کو
وہ مرد کیا جو پیرِ فلک سے پچھڑ گیا

کھینچی جو صدقِ دل سے اسیروں نے آہِ سرد
پھر کیا تھا، پاؤں بادِ خزاں کا اکھڑ گیا

اللہ ری کشاکشِ دیر و حرم کہ یاس
حیرت کے مارے بیچ دوراہے پہ گڑ گیا

پہلے تو اپنے آپ کو پہچانتے نہ تھے
حسنِ یگانہ کس کی نگاہوں میں تڑ گیا

(10)

قیامت ہے شبِ وعدہ کا اتنا مختصر ہونا
فلک کا شام سے دست و گریبانِ سحر ہونا

شبِ تاریک نے پہلو دبایا روزِ روشن کا
زہے قسمت مرے بالیں پہ تیرا جلوہ گر ہونا

حریمِ ناز میں کب تک گھٹے گی بوے پیراہن
ہواے شوق میں لازم ہے اِک دن منتشر ہونا ہوتا

تماشاے چمن کی کیا حقیقت چشمِ عبرت میں
اثر ہونا تو لازم ہے مگر الٹا اثر ہونا

اسیروں کی فغاں اب اور تڑپانے لگی دل کو
قفس کی سختیوں کا چاہیے تھا کچھ اثر ہونا

ہواے تند سے کب تک لڑے گا شعلۂ سرکش
عبث ہے خود نمائی کی ہوس میں جلوہ گر ہونا

دلِ آگاہ نے بے کار میری راہ کھوٹی کی
بہت اچھا تھا انجامِ سفر سے بے خبر ہونا

بہار آتے ہی شادیِ مرگ ہو جاؤں تو اچھا ہے
خزاں سے پہلے ہی بہتر ہے قصہ مختصر ہونا

دیارِ بے خودی ہے اپنے حق میں گوشۂ راحت
غنیمت ہے گھڑی بھر خوابِ غفلت میں بسر ہونا

سما سکتے نہیں الفاظ میں معنیِ وجدانی
مگر لازم ہے دل ہی دل میں پوشیدہ اثر ہونا

وہی ساقی وہی ساغر وہی شیشہ وہی بادہ
مگر لازم نہیں ہر ایک پر یکساں اثر ہونا

سنا کرتے تھے آج آنکھوں سے دیکھیں دیکھنے والے
نگاہِ یاس کا سنگیں دلوں پر کارگر ہونا



فراق گورکھپوری

(28 اگست 1896ء-1982ء)

- فراق کا نام رگھو پتی سہائے تھا اور فراق تخلص
- فراق 28 اگست 1896ء میں بنواریار تحصیل بانس گاؤں ضلع گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔
- فراق کا انتقال 1982ء میں دہلی میں حرکت قلب رکنے کی وجہ سے ہوا۔
- والد کا نام گورکھ پرشاد تھا اور عبرت تخلص۔ پیشہ وکالت
- فراق کے والدہ کا نام دلاری دیوی تھا۔
- فراق کے شاعری کے پہلے استاد پروفیسر ناصری پھر وسیم خیرآبادی اور ریاض خیرآبادی ہیں۔
- فراق نے بی۔اے الہ آباد یونیورسٹی سے کیا تھا۔
- فراق کا پی سی ایس میں انتخاب 1919 میں ہوا تھا۔
- فراق یو جی سی کی طرف سے نیشنل پروفیسر 1959 میں ہوئے تھے۔
- فراق تحریک آزادی میں شریک ہوئے تھے جس کی پاداش میں 1920 میں ڈھائی سال قید کی سزا ہوئی تھی۔
- جیل میں فراق کی ملاقات عارف ہنسوی، حکیم آشفتہ، مولانا احمد علی، حسرت موہانی اور مولانا ابوالکلام سے ہوئی تھی۔
- فراق کے کلام میں ہندوستانی دیومالائی عناصر کا اثر سب سے زیادہ ہے۔
- بقول فراق انھوں نے 19 برس کے ہونے کے بعد شاعری شروع کی یعنی 1916 میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا تھا۔
- فراق مصحفی کے دلدادہ تھے۔
- فراق نے میر، مصحفی، ذوق، داغ اور ناسخ کا اثر قبول کیا ہے۔
- فراق اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور سنسکرت ادب سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔
- دیومالائی عناصر فراق کی شاعری میں جابجا نظر آتے ہیں۔
- فراق کی شاعری کا لب و لہجہ سکون، نرمی اور ٹھنڈک سے پہچان لیا جاتا ہے۔
- لہلہاتیں، رسمساہٹیں، ملگجاہٹیں جیسے الفاظ فراق نے وضع کیے تھے۔

- فراق کی غزلوں میں انگریزی کی شعری روایت کا پرتو نظر آتا ہے۔
- فراق کی شاعری کی بڑی خصوصیت رومانی نیم خوابی کی کیفیت ہے۔
- فراق کے کلام کی اہم خصوصیات جنسیت، جمالیات، فطرت پرستی اور ہندوستانیت ہے۔
- فراق کے کلام میں ہندوستانی صنمیات کا سب سے زیادہ اثر ہے۔
- فراق نے جمالیاتی رباعیاں کہی ہیں۔
- فراق اردو کے تاثراتی نقاد ہیں۔

اعزازات وانعامات

- فراق کو گل نغمہ پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 1962 میں ملا تھا۔
- فراق کو پدم بھوشن اور سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ 1968 میں ملا تھا۔
- فراق کو گل نغمہ پر گیان پیٹھ ایوارڈ 1969 میں ملا تھا۔
- فراق کو اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ گل نغمہ پر 1961 میں ملا تھا۔
- فراق کو ساہتیہ اکادمی فیلوشپ 1970 میں ملی تھی۔

فراق کے بارے میں مختلف آرا و خیالات

- محمد حسن نے فراق کو اردو شاعری کا 'آسکر والڈ' کہا ہے۔
- محمد حسن نے فراق کو اردو ادب کا 'جانسن' کہا ہے۔
- کامل قریشی نے فراق کو 'حسن و عشق کا رسیا' کہا ہے۔
- فراق نے اردو میں ہندوستانی دیومالائی تصور جمال کی ترجمانی کی ہے۔ (گوپی چند نارنگ)
- فراق حسن و جمال کی بولتی ہوئی روح کے شاعر ہیں۔ (گوپی چند نارنگ)
- فراق جیسی چند جامع شخصیتیں روز روز نہیں پیدا ہوا کرتیں۔ (مجنوں گورکھپوری)
- اردو شاعری میں آنے والی شخصیت فراق کی ہے۔ (اصغر گونڈوی)
- میں فراق کو اردو غزل کا ایک اہم ستون تسلیم کرتا ہوں۔ (کلیم الدین احمد)
- فراق نے اردو شاعری کی طاق میں ہندوستانیت اور آفاقیت کی شمع روشن کی۔ (سلام سندیلوی)
- دنیا سے جاتے ہوئے غزل کو فراق کے ذمے کیے جا رہا ہوں۔ (یگانہ چنگیزی)
- فراق کی شاعری حقیقی شاعری کی بہترین مثال ہے۔ (یگانہ چنگیزی)
- اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ آج کے شعرا میں سب سے درخشاں مستقبل کس کا ہے تو میں تنہا فراق

کا نام لوں گا۔(نیاز فتح پوری)

- فراق کو میں اس صدی کے موجودہ پچاس سال کے منفرد اور ممتاز غزل گویوں کی صف میں جگہ دیتا ہوں۔ غزل کا جو آئندہ رنگ و آہنگ ہوگا اس میں فراق کا بڑا حصہ ہوگا۔(رشید احمد صدیقی)
- فراق کی یہ خوبی ہے کہ انھوں نے احساس جمال کو حیات و کائنات سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کیا ہے اور ایسے جذبے اور فکر میں ڈوبے ہوئے نغموں کو ایسے آتشیں احساس کے ساتھ جگایا ہے کہ شعلہ سا لپک جائے ہے اور ہم تھوڑی دیر کے لیے نئی آگاہیوں کی ایک حسین دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔(خواجہ احمد فاروقی)۔
- راشد اور فیض کے بعد جدید نظم نگاری کے معیار پر صرف فراق کی نظمیں پورا اترتی ہیں۔ (عزیز احمد)
- جب ہم لوگوں کو بھول جائیں گے اس وقت بھی فراق کی یاد تازہ رہے گی۔(جگر مراد آبادی)
- اپنے فراق کو میں قرنوں سے جانتا اور ان کے اخلاق کا لوہا مانتا ہوں۔مسائل علم و ادب پر جب وہ زبان کھولتے ہیں لفظ و معنی کے لاکھوں موتی پرو لیتے ہیں۔(جوش ملیح آبادی)
- جو شخص یہ نہیں تسلیم کرتا کہ فراق کی عظیم شخصیت ہندوستان کے ماتھے پر ٹیکہ اور زبان کی آبرو اور شاعری کی مانگ کا صندل ہے وہ خدا کی قسم کورے مادرزاد ہے۔(جوش ملیح آبادی)

گل نغمہ کی ابتدائی دس غزلیں

(1)

آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے — اک شرحِ حیات ہو گئی ہے
جب دل کی وفات ہو گئی ہے — ہر چیز کی رات ہو گئی ہے
غم سے چھٹ کر یہ غم ہے مجھ کو — کیوں غم سے نجات ہو گئی ہے
مدت سے خبر ملی نہ دل کی — شاید کوئی بات ہو گئی ہے
جس شے پہ نظر پڑی ہے تیری — تصویرِ حیات ہو گئی ہے
اب ہو مجھے دیکھیے کہاں صبح — ان زلفوں میں رات ہو گئی ہے
دل میں تجھ سے تھی جو شکایت — اب غم کے نکات ہو گئی ہے
اقرارِ گناہِ عشق سن لو — مجھ سے اک بات ہو گئی ہے
جو چیز بھی مجھ کو ہاتھ آئی — تیری سوغات ہو گئی ہے

کیا جانیے موت پہلے کیا تھی — اب میری حیات ہو گئی ہے
گھٹتے گھٹتے تری عنایت — میری اوقات ہو گئی ہے
اس چشمِ سیہ کی یاد یکسر — شامِ ظلمات ہو گئی ہے
اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے
جیتی ہوئی بازیِ محبت — کھیلا ہوں تو مات ہو گئی ہے
مٹنے لگیں زندگی کی قدریں — جب غم سے نجات ہو گئی ہے
وہ چاہیں تو وقت بھی بدل جائے — جب آئے ہیں رات ہو گئی ہے
دنیا ہے کتنی بے ٹھکانہ — عاشق کی برات ہو گئی ہے
پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی — اب برق صفات ہو گئی ہے
جس چیز کو چھو دیا ہے تونے — اک برگِ نبات ہو گئی ہے
اکا دُکا صدائے زنجیر — زنداں میں رات ہو گئی ہے
ایک ایک صفت فراق اُس کی — دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

(2)

یہ سُرمئی فضاؤں کی کچھ کنمناہٹیں — ملتی ہیں مجھ کو پچھلے پہر تیری آہٹیں
اس کائناتِ غم کی فسردہ فضاؤں میں — بکھرا گئے ہیں آکے وہ کچھ مسکراہٹیں
اے جسمِ نازنینِ نگارِ نظر نواز — صبحِ شبِ وصال تری ملگجاہٹیں
پڑتی ہے آسمانِ محبت پہ چھوٹ سی — بَل بے جبینِ ناز تری جگمگاہٹیں
چلتی ہے جب نسیمِ خیالِ خرامِ ناز — سنتا ہوں دامنوں کی ترے سر سراہٹیں
چشمِ سیہ تبسمِ پنہاں لیے ہوئے — پو پھوٹنے سے قبل افق کی ادا ہٹیں
جنبش میں جیسے شاخ ہو گلہائے نغمہ کی — اک پیکرِ جمیل کی یہ لہلہاہٹیں
جھونکوں کی نذر ہے چمنِ انتظارِ دوست — یاد امید و بیم کی یہ سنسناہٹیں
ہو سامنا اگر تو تجلّی ہو نگاہِ برق — دیکھی ہیں عضو عضو میں وہ اچپلاہٹیں
کس دیس کو سدھار گئیں اے جمالِ یار — رنگیں لبوں پہ کھیل کے کچھ مسکراہٹیں
رُخسارِ تر سے تازہ ہو باغِ عدن کی یاد — اور اس کی پہلی صبح کی وہ رسمساہٹیں
سازِ جمال کی یہ نواہائے سرمدی — جو بن تو وہ فرشتے سنیں گنگناہٹیں
آزردگیِ حسن بھی کس درجہ شوخ ہے — اشکوں میں تیرتی ہوئی کچھ مسکراہٹیں

ہونے لگا ہوں خود سے قریں اے شبِ الم — میں پا رہا ہوں ہجر میں کچھ اپنی آہٹیں
میری غزل کی جان سمجھنا انھیں فراق — شمعِ خیالِ یار کی یہ تھرتھراہٹیں

(3)

ہے ابھی مہتاب باقی اور باقی ہے شراب — اور باقی میرے تیرے درمیاں صدہا حساب
دید اندر دید، حیرا نم حجاب اندر حجاب — وائے با وصفِ ایں قدر راز و نیاز ایں اجتناب
دل میں یوں بیدار ہوتے ہیں خیالات غزل — آنکھیں ملتے جس طرح اٹھے کوئی مستِ شباب
گیسوے خمدار میں اشعارِ تر کی ٹھنڈکیں — آتشِ رخسار میں قلبِ تپاں کا التہاب
چوڑیاں بجتی ہیں دل میں مرحبا بزمِ خیال — کھلتے جاتے ہیں نگاہوں میں جبینوں کے گلاب

کاش پڑھ سکتا کسی صورت سے تو آیاتِ عشق — اہلِ دل بھی تو ہیں اے شیخِ زماں اہلِ کتاب
ایک عالم پر نہیں رہتی ہیں کیفیاتِ عشق — گاہ ریگستاں بھی دریا گاہ دریا بھی سراب
کون رکھ سکتا ہے اس کو ساکن و جامد کہ زیست — انقلاب و انقلاب و انقلاب و انقلاب
ڈھونڈھیے کیوں استعارہ اور تشبیہ و مثال — حسن تو وہ ہے بتائیں جس کو حسنِ لاجواب
ہشت جنت کی بہاریں چند پنکھڑیوں میں بند — غنچہ کھلتا ہے تو فردوسوں کے کھل جاتے ہیں باب
آ رہا ہے ناز سے سمتِ چمن وہ خوش خرام — دوش پر وہ گیسوے شب گوں کے منڈلاتے سحاب
حسن خود اپنا نقیب آنکھوں کو دیتا ہے پیام — آمد آمد آفتاب آمد دلیلِ آفتاب
عظمتِ تقدیر آدم اہلِ مذہب سے نہ پوچھ — جو مشیت نے نہ دیکھے دل نے وہ دیکھے ہیں خواب
حسن وہ جو ایک کردے معنیِ فتح و شکست — رہ گئی سو بار جھک جھک کر نگاہِ کامیاب
غیب کی نظریں بچا کے کچھ چرا لے وقت سے — پھر نہ ہاتھ آئے گا کچھ ہر لحظہ ہے پا در رکاب
ہر نظر جلوہ ہے ہر جلوہ نظر حیران ہوں — آج کس بیت الحرم میں ہو گیا ہوں باریاب

بارہا ہاں بارہا میں نے دمِ فکرِ سخن — چھو لیا ہے اس سکوں کو جو ہے جانِ اضطراب
سر سے پا تک حسن ہے سازِ نمو رازِ نمو — آ رہا ہے ایک کمسن پر دبے پاؤں شباب
بزمِ فطرت سر بسر ہوتی ہے اک بزمِ سماع — وہ سکوتِ نیم شب کا نغمۂ چنگ و رباب
اے فراق اٹھتی ہیں حیرت کی نگاہیں با ادب — اپنے دل کی خلوتوں میں ہو رہا ہوں باریاب

(4)

دیدنی ہے نرگسِ خاموش کا طرزِ خطاب — گہہ سوال اندر سوال و گہہ جواب اندر جواب

جوہرِ شمشیر قاتل ہیں کہ ہیں رگ ہائے ناب
ساقیا تلوار کھنچتی ہے کہ کھنچتی ہے شراب

عشق کی آغوش میں بس اک دلِ خانہ خراب
حسن کے پہلو میں صدہا آفتاب و ماہتاب

سرورِ کفار ہے عشق اور امیرالمومنین
کعبہ و بت خانہ اوقافِ دلِ عالی جناب

راز کے صیغے میں رکھا تھا مشیت نے جنھیں
وہ حقائق ہوگئے میری غزل میں بے نقاب

ایک گنجِ بے بہا ہے اہل دل کو ان کی یاد
تیرے جورِ بے نہایت تیرے جورِ بے حساب

آدمیوں سے بھری ہے یہ بھری دنیا مگر
آدمی کو آدمی ہوتا نہیں ہے دستیاب

ساتھ غصے میں نہ چھوڑا شوخیوں نے حسن کا
برہمی کی ہر ادا میں مسکراتا ہے عتاب

عشق کی سرمستیوں کا کیا ہو اندازہ کہ عشق
صد شراب اندر شراب اندر شراب اندر شراب

عشق پر اے دل کوئی کیوں کرلگا سکتا ہے حکم
ہم ثواب اندر ثواب وہم عذاب اندر عذاب

نام رہ جاتا ہے ورنہ دہر میں کس کو ثبات
آج دنیا میں کہاں ہیں رستم و افراسیاب

راس آیا دہر کو خونِ جگر سے سینچنا
چہرۂ آفاق پر کچھ آچلی ہے آب و تاب

اس قدر رشک اے طلبگارانِ سامانِ نشاط
عشق کے پاس اک دل پرسوز اک چشمِ پُرآب

اب اِسے کچھ اور کہتے ہیں کہ حسنِ اتفاق
اک نظر اڑتی ہوئی سی کر گئی مجھ کو خراب

ایک سناٹا اٹوٹ اکثر اور اکثر اے ندیم
دل کی ہر دھڑکن میں صد زیر و بم چنگ و رباب

آرہے ہیں گلستاں میں خیر و برکت کے پیام
ہے صدا بادِ صبا کی یا دعاے مستجاب

مرغ ہوں اس دشت کا کوئی نہ مارے پر جہاں
ایک ہی پنجے کے ہیں اے چرخ شاہین وعقاب

ہم سمندر متھ کے لائے گوہرِ رازِ دوام
داستانیں مِلتوں کی ہیں جہاں نقشِ برآب

گر گئیں میری نظر سے آج اپنی سب دعائیں
واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب

پوچھتا ہے مجھ سے تو اے شخص کیا ہوں کون ہوں
میں وہی رسوائے عالم شاعروں میں انتخاب

اے فراق آفاق ہے کوئی طلسم اندر طلسم
ہے ہراک خوابِ حقیقت، ہر حقیقت ایک خواب

(5)

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی

ایک پیغامِ زندگانی بھی
عاشقی مرگِ ناگہانی بھی

اس ادا کا تری جواب نہیں
مہربانی بھی سرگرانی بھی

دل کو اپنے بھی غم تھے دنیا میں
کچھ بلائیں تھیں آسمانی بھی

منصبِ دل خوشی لٹانا ہے
غمِ پنہاں کی پاسبانی بھی

دل کو شعلوں سے کرتی ہے سیراب
زندگی آگ بھی ہے پانی بھی

شاد کاموں کو یہ نہیں توفیق
دلِ غم گیں کی شادمانی بھی

لاکھ حسنِ یقیں سے بڑھ کر ہے
ان نگاہوں کی بدگمانی بھی

تنگنائے دلِ ملول میں ہے
بحرِ ہستی کی بے کرانی بھی

عشق ناکام کی ہے پرچھائیں
شادمانی بھی کامرانی بھی

دیکھ دل کے نگار خانے میں
زخمِ پنہاں کی ہے نشانی بھی

خلق کیا کیا مجھے نہیں کہتی
کچھ سنوں میں تری زبانی بھی

آئے تاریخِ عشق میں سو بار
موت کے دورِ درمیانی بھی

اپنی معصومیوں کے پردے میں
ہو گئی وہ نظر سیانی بھی

دن کو سورج مکھی ہے وہ نو گل
رات کو ہے وہ رات رانی بھی

دلِ بدنام تیرے بارے میں
لوگ کہتے ہیں اک کہانی بھی

وضع کرتے کوئی نئی دنیا
کہ یہ دنیا ہوئی پرانی بھی

دل کو آدابِ بندگی بھی نہ آئے
کر گئے لوگ حکمرانی بھی

جورِ کم کم کا شکریہ بس ہے
آپ کی اتنی مہربانی بھی

دل میں اک ہوک بھی اٹھی اے دوست
یاد آئی تری جوانی بھی

سر سے پا تک سپردگی کی ادا
ایک اندازِ ترکمانی بھی

پاس رہنا کسی کا رات کی رات
میہمانی بھی میزبانی بھی

ہو نہ عکسِ جبینِ ناز کہ ہے
دل میں اک نورِ کہکشانی بھی

زندگی عینِ دید یار فراق
زندگی ہجر کی کہانی بھی

(6)

ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں جی بھر آئے تو اشک بہائیں
ایک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں اے دل رو رو کے سو جائیں

جانے والا گھر جائے گا کاش یہ پہلے سوچا ہوتا
ہم تو منتظر اس کے تھے بس کب ملنے کی گھڑیاں آئیں

الگ الگ بہتی رہتی ہے ہر انساں کی جیون دھارا
دیکھ ملیں کب آج کے بچھڑے لے لوں بڑھ کے تیری بلائیں

سنتے ہیں کچھ رو لینے سے جی ہلکا ہو جاتا ہے
شاید تھوڑی دیر برس کر چھٹ جائیں کچھ غم کی گھٹائیں
اپنے دل سے غافل رہنا اہلِ عشق کا کام نہیں
حسن بھی ہے جس کی پرچھائیں آج وہ من کی جوت جگائیں
سب کو اپنے اپنے دکھ ہیں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے
اے دلِ غم گیں تیری کہانی کون سنے گا کس کو سنائیں
جسم نازنیں میں سرتاپا نرم لویں لہرائی ہوئی سی
تیرے آتے ہی بزمِ ناز میں جیسے کئی شمعیں جل جائیں
ہاں ہاں تجھ کو دیکھ رہا ہوں کیا جلوہ ہے کیا پردہ ہے
دل دے نظارے کی گواہی اور یہ آنکھیں قسمیں کھائیں
لفظوں میں چہرے نظر آئیں گے چشمِ بینا کی ہے شرط
کئی زاویوں سے خلقت کو شعر مرے آئینہ دکھائیں
مجھ کو گناہ و ثواب سے مطلب ؟ لیکن عشق میں اکثر آئے
وہ لمحے خود میری ہستی جیسے مجھے دیتی ہو دعائیں
چھوڑ وفا و جفا کی بحثیں اپنے کو پہچان اے عشق
غور سے دیکھ تو سب دھوکا ہے کیسی وفائیں کیسی جفائیں
حسن اک بے بیندھا ہوا موتی یا اک بے سونگھا ہوا پھول
ہوش فرشتوں کے بھی اڑادیں تیری یہ دو شیزہ ادائیں
باتیں اس کی یاد آتی ہیں لیکن ہم پر یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پر اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں
ساقی اپنا غم خانہ بھی مے خانہ بن جاتا ہے
مستِ مے غم ہو کر جب ہم آنکھوں کے ساغر چھلکائیں
اہلِ مسافت ایک رات کا یہ بھی ساتھ غنیمت ہے
کوچ کرو تو صدا دے دینا ہم نہ کہیں سوتے رہ جائیں
ہوش میں کیسے رہ سکتا ہوں آخر شاعرِ فطرت ہوں
صبح کے ست رنگے جھرمٹ سے جب وہ انگلیاں مجھے بلائیں

ایک غزال رم خوردہ کا منھ پھیرے ایسے میں گزرنا
جب مہکی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں دن ڈوبے آنکھیں جھپکائیں
دیں گے ثبوتِ عالی ظرفی ہم میکش سرِ میخانہ
ساقی چشمِ سیہ کی باتیں زہر بھی ہوں تو ہم پی جائیں
موزوں کرکے سستے جذبے منڈی منڈی بیچ رہے ہیں
ہم بھی خریدیں جو یہ سخن ور اک دن ایسی غزل کہہ لائیں
رات چلی ہے جوگن بن کر بال سنوارے لٹ چھٹکائے
چھپے فراقؔ گگن پر تارے، دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں

(7)

بندگی سے کبھی نہیں ملتی — اس طرح زندگی نہیں ملتی
لینے سے تاج و تخت ملتا ہے — مانگے سے بھیک بھی نہیں ملتی
غیب داں ہے مگر خدا کو بھی — نیتِ آدمی نہیں ملتی
ہے جو اک چیز دارِ فانی میں — وہ تو جنت میں بھی نہیں ملتی
ایک دنیا ہے میری نظروں میں — پر وہ دنیا ابھی نہیں ملتی

رات ملتی ہے تیری زلفوں سے — پر وہ آراستگی نہیں ملتی
یوں تو ہر اک کا حسن کافر ہے — پر تری کافری نہیں ملتی
با صفا دوستی کو کیا روئیں — با صفا دشمنی نہیں ملتی
آنکھ ہی آنکھ ہوں مگر مجھ سے — نرگسِ سامری نہیں ملتی
جب تک اونچی نہ ہو ضمیر کی لو — آنکھ کو روشنی نہیں ملتی
سوزِ غم سے نہ ہو جو مالا مال — دل کو سچی خوشی نہیں ملتی
رونے دھونے سے حالِ عاشق کو — زلف کی ابتری نہیں ملتی
روئے جاناں کجا، کجا گلِ خُلد — وہ تر و تازگی نہیں ملتی
تجھ میں کوئی کمی نہیں پاتے — تجھ میں کوئی کمی نہیں ملتی
ہیں سوا میرے اور نرم نوا — پر وہ آہستگی نہیں ملتی
یوں تو پڑتی ہے ایک عالم پر — نگہہِ سر سری نہیں ملتی
صحنِ عالم کی سر زمینوں میں — دل کی افتادگی نہیں ملتی

آہ وہ مشک بیز زلفِ سیاہ
جس کی ہمسائیگی نہیں ملتی

عشق آزردہ بادشاہوں کو
تیری آزردگی نہیں ملتی

زہد و صوم صلوٰۃ و تقویٰ سے
عشق کی سادگی نہیں ملتی

حسن جس کا بھی ہے نرالا ہے
پر تری طرفگی نہیں ملتی

رنگِ دیوانگیِ عالم سے
میری دیوانگی نہیں ملتی

علم ہے دستیاب با افراط
عشق کی آگہی نہیں ملتی

دل کو بے انتہاے آگاہی
عشق کی بے خودی نہیں ملتی

آج رطب اللساں ہیں حضرتِ دل
آپ کی بات ہی نہیں ملتی

دوستو! محض طبعِ موزوں سے
دولتِ شاعری نہیں ملتی

ہے جو ان رسمساتے ہونٹوں میں
آنکھ کو وہ نمی نہیں ملتی

نگہہِ لطف سے جو ملتی ہے
ہائے وہ زندگی نہیں ملتی

یوں تو ملنے کو مل گیا ہے خدا
پر تری دوستی نہیں ملتی

میری آواز میں جو مضمر ہے
ایسی شادی غمی نہیں ملتی

وہ تو کوئی خوشی نہیں جس میں
درد کی چاشنی نہیں ملتی

میرے اشعار میں سرے سے ندیم
رجعتِ قہقری نہس ملتی

بس وہ بھر پور زندگی ہے فراق
جس میں آسودگی نہیں ملتی

(8)

بے ٹھکانے ہے دلِ غمگیں ٹھکانے کی کہو
شامِ ہجراں دوستو! کچھ اس کے آنے کی کہو

ہاں نہ پوچھو اک گرفتارِ قفس کی زندگی
ہم صفیرانِ چمن کچھ آشیانے کی کہو

اُڑ گیا ہے منزلِ دشوار میں غم کا سمند
گیسوے پر پیچ و خم کے تازیانے کی کہو

بات بنتی اور باتوں سے نظر آتی نہیں
اس نگاہِ ناز کی باتیں بنانے کی کہو

داستاں وہ تھی جسے دل بجھتے بجھتے کہہ گیا
شمعِ بزمِ زندگی کے جھلملانے کی کہو

کچھ دلِ مرحوم کی باتیں کروائے اہلِ غم
جس سے ویرانے تھے آباد اس دِوانے کی کہو

داستانِ زندگی بھی کس قدر دلچسپ ہے
جو ازل سے چھڑ گیا ہے اس فسانے کی کہو

یہ فسونِ نیم شب یہ خواب ساماں خامشی
سامری فن آنکھ کے جادو جگانے کی کہو

کوئی کیا کھائے گا یوں سچی قسم جھوٹی قسم
اس نگاہِ ناز کے سوگند کھانے کی کہو

شام ہی سے گوش بر آواز ہے بزمِ سخن
کچھ فراق اپنی سناؤ کچھ زمانے کی کہو

(9)

اُجاڑ بن میں کچھ آثار سے چمن کے ملے
دلِ خراب سے وہ اپنی یاد بن کے ملے

ہر اک مشام میں عالم ہے یوسفستاں کا
پرکھنے والے تو کچھ بوئے پیرہن کے ملے

تھی ایک بوئے پریشاں بھی دل کے صحرا میں
نشانِ پا بھی کسی آہوئے ختن کے ملے

عجب راز ہے تنہائیِ دلِ شاعر
کہ خلوتوں میں بھی آثار انجمن کے ملے

وہ حسن و عشق جو صبحِ ازل کے بچھڑے تھے
ملے ہیں وادیِ غربت میں پھر وطن کے ملے

فقیرِ عشق کو کیا جامہ زیبیوں سے غرض
یہی بہت ہے اگر چار گز کفن کے ملے

کچھ اہلِ بزمِ سخن سمجھے کچھ نہیں سمجھے
بہ شکلِ شہرتِ مبہم صلے سخن کے ملے

تھا جرعہ جرعہ نئی زندگی کا اک پیغام
جو چند جام کسی بادۂ کہن کے ملے

بزورِ طبع ہر اک تیر کو کمان کیا
ہوئے ہیں جھک کے وہ رخصت جو مجھ سے تن کے ملے

کمندِ فکرِ رسا میں حریف مان گئے
وہ پیچ و تاب تری زلفِ پُر شکن کے ملے

نظر سے مطلعِ انوار ہو گئی ہستی
کہ آفتاب ملا مجھ کو اس کرن کے ملے

ہر ایک نقشِ نگاریں ہر ایک نکہت و رنگ
لقائے ناز میں جلوے چمن چمن کے ملے

مزاجِ حسن چلو اعتدال پر آیا
جو روز روٹھ کے ملتے تھے آج من کے ملے

ارے اسی سے تو جلتے ہیں شاد کامِ حیات
کہ اہلِ دل کو خزانے غم و محن کے ملے

اسی سے عشق کی نیت بھی ہو گئی مشکوک
گنوا دیے کئی موقعے جو حسنِ ظن کے ملے

ادا میں کھنچتی تھی تصویر کرشن و رادھا کی
نگاہ میں کئی افسانے نل و من کے ملے

حواسِ خمسہ پکار اُٹھے یک زباں ہو کر
کئی ثبوت تری خوبیِ بدن کے ملے

نثارِ کج کلہی شوخیِ بہارِ چمن
گر اِس ادا سے شگوفوں کو بانکپن کے ملے

حیات وہ نگہِ شرمگیں جسے بانٹے
وہی شراب جو تیری مژہ سے چھن کے ملے

خدا گواہ کہ ہر دورِ زندگی میں فراق
نئے پیامِ گنہ مجھ کو اہرمن کے ملے

(10)

وہ آنکھ زبان ہو گئی ہے
ہر بزم کی جان ہو گئی ہے

آنکھیں پڑتی ہیں مے کدوں کی
وہ آنکھ جوان ہو گئی ہے

آئینہ دکھا دیا یہ کس نے — دنیا حیران ہو گئی ہے
اس نرگسِ ناز میں تھی جو بات — شاعر کی زبان ہو گئی ہے
اب تو تری ہر نگاہ کافر — ایمان کی جان ہو گئی ہے
ترغیبِ گناہ لحظہ لحظہ — اب رات جوان ہو گئی ہے
توفیقِ نظر سے مشکلِ زیست — کتنی آسان ہو گئی ہے
تصویرِ بشر ہے نقش آفاق — فطرت انسان ہو گئی ہے
پہلے وہ نگاہ اک کرن تھی — اب اک جہان ہو گئی ہے
سنتے ہیں کہ اب نوائے شاعر — صحرا کی اذان ہو گئی ہے
اے موت بشر کی زندگی آج — تیرا احسان ہو گئی ہے
کچھ اب تو امان ہو کہ دُنیا — کتنی ہلکان ہو گئی ہے

یہ کس کی پڑیں غلط نگاہیں — ہستی بہتان ہو گئی ہے
انساں کو خریدتا ہے انسان — دنیا بھی دکان ہو گئی ہے
اکثر شبِ ہجر دوست کی یاد — تنہائی کی جان ہو گئی ہے
شرکت تری بزم قصہ گو میں — افسانے کی جان ہو گئی ہے
جو آج مری زبان تھی کل — دنیا کی زبان ہو گئی ہے
اک سانحۂ جہاں ہے وہ آنکھ — جس دن سے جوان ہو گئی ہے
رعنائیِ قامتِ دل آرا — میرا ارمان ہو گئی ہے
دل میں اک وارداتِ پنہاں — بے سان گمان ہو گئی ہے
سنتا ہوں قضائے قہرماں بھی — اب تو رحمان ہو گئی ہے
واعظ مجھے کیا خدا سے — میرا ایمان ہو گئی ہے
میری تو یہ کائناتِ غم بھی — جان و ایمان ہو گئی ہے
میری ہر بات آدمی کی — عظمت کا نشان ہو گئی ہے
یادِ ایامِ عاشقی جب — ابدیت اک آن ہو گئی ہے
جو شوخ نظر تھی دشمنِ جاں — وہ جان کی جان ہو گئی ہے
ہر بیت فراق اس غزل کی — ابرو کی کمان ہو گئی ہے



مجروح سلطان پوری
(یکم اکتوبر 1919ء۔24 مئی 2000ء)

- مجروح کا نام اسرار الحسن خان تھا اور ابتدائی تخلص اسرار تھا۔
- مجروح سلطان پوری یکم اکتوبر 1919 میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔
- مجروح کا انتقال 24 مئی 2000ء میں ممبئی میں ہوا۔
- مجروح کے والد کا نام محمد حسن خان تھا اور وطن سلطان پور۔
- مجروح 1939 تک اسرار تخلص رکھتے تھے۔ بعد میں دوستوں کی ایما پر مجروح تخلص اختیار کیا۔
- مجروح نے 1935 یا 1936 میں شاعری شروع کی تھی۔
- مجروح نے 1938 میں لکھنؤ سے طب یونانی کی ڈگری حاصل کی۔
- مجروح نے جگر اور رشید احمد صدیقی سے استفادہ کیا ہے۔
- رشید احمد صدیقی نے مجروح کو تین سال تک اپنے گھر رکھا تھا۔
- مجروح ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔
- مجروح صرف غزل کے شاعر تھے۔
- مجروح کو ترقی پسند غزل کا نقیب کہا جاتا ہے۔
- 1945 میں مجروح جگر کے ساتھ بمبئی ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے گئے تھے۔جہاں فلم ڈائرکٹر کاردار مجروح کا کلام سن کر بہت متاثر ہوئے۔
- مجروح نے 1945 میں فلم شاہ جہاں کے لیے اپنا پہلا نغمہ لکھا۔
- ''جب دل ہی ٹوٹ گیا ہم جی کے کیا کریں۔''
- مجروح ایک سال تک جیل میں بھی رہے ہیں (کمیونسٹ پارٹی کے حامی ہونے کی وجہ سے)
- مجروح نے فلمی زندگی کے پچپن برسوں میں تقریباً ساڑھے تین سو گانے اردو میں اور تین بھوجپوری میں لکھے۔

اعزاز

- مجروح کو 1992 میں اقبال سمان ملا۔

غزل کی ابتدائی پانچ غزلیں

(1)

ختم شور طوفاں تھا دور تھی سیاہی بھی
دم کے دم میں افسانہ تھی مری تباہی بھی
التفات سمجھوں یا بے رخی کہوں اس کو
رہ گئی خلش بن کر اس کی کم نگاہی بھی
اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی
یاد کر وہ دن جس دن تیری سخت گیری پر
اشک بھر کے اٹھی تھی میری بے گناہی بھی
پستیِ زمیں سے ہے رفعت فلک قائم
میری خستہ حالی سے تیری کج کلاہی بھی
شمع بھی اجالا بھی میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہ بر بھی راہی بھی
گنبدوں سے پلٹی ہے اپنی ہی صدا مجروح
مسجدوں میں کی میں نے جا کے داد خواہی بھی

(2)

مسرتوں کو یہ اہل ہوس نہ کھو دیتے
جو ہر خوشی میں ترے غم کو بھی سمو دیتے
کہاں وہ شب کہ ترے گیسوؤں کے سائے میں
خیال صبح سے ہم آستیں بھگو دیتے
بہانے اور بھی ہوتے جو زندگی کے لیے
ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے
بچا لیا مجھے طوفاں کی موج نے ورنہ
کنارے والے سفینہ مرا ڈبو دیتے

جو دیکھتے مری نظروں پہ بندشوں کے ستم
تو یہ نظارے مری بے بسی پہ رو دیتے
کبھی تو یوں بھی امنڈتے سرشک غم مجروح
کہ میرے زخم تمنا کے داغ دھو دیتے

(3)

دور دور مجھ سے وہ اس طرح خراماں ہے
ہر قدم ہے نقش دل ہر نگہ رگ جاں ہے
بن گئی ہے مستی میں دل کی بات ہنگامہ
قطرہ تھی جو ساغر میں لب تک آ کے طوفاں ہے
ہم تو پائے جاناں پر کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے
میرے شکوۂ غم سے عالم ندامت میں
اس لب تبسم پر شمع سی فروزاں ہے
یہ نیاز غم خواری یہ شکست دل داری
بس نوازش جاناں دل بہت پریشاں ہے

منظر ہیں پھر میرے حادثے زمانے کے
پھر مرا جنوں تیری بزم میں غزل خواں ہے

فکر کیا انہیں جب تو ساتھ ہے اسیروں کے
اے غم اسیری تو خود شکست زنداں ہے

اپنی اپنی ہمت ہے اپنا اپنا دل مجروح
زندگی بھی ارزاں ہے موت بھی فراواں ہے

(4)

یہ رکے رکے سے آنسو یہ دبی دبی سی آہیں
یوں ہی کب تلک خدایا غم زندگی نباہیں

کہیں ظلمتوں میں گھر کر ہے تلاش دشت رہبر
کہیں جگمگا اٹھی ہیں مرے نقش پا سے راہیں

ترے خانماں خرابوں کا چمن کوئی نہ صحرا
یہ جہاں بھی بیٹھ جائیں وہیں ان کی بارگاہیں

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں بانہیں

مرے عہد میں نہیں ہے یہ نشان سربلندی
یہ رنگے ہوئے عمامے یہ جھکی جھکی کلاہیں

(5)

آہ جاں سوز کی محرومی تاثیر نہ دیکھ
ہو ہی جائے گی کوئی جینے کی تدبیر نہ دیکھ

حادثے اور بھی گزرے تری الفت کے سوا
ہاں مجھے دیکھ مجھے اب میری تصویر نہ دیکھ

یہ ذرا دور پہ منزل یہ اجالا یہ سکوں
خواب کو دیکھ ابھی خواب کی تعبیر نہ دیکھ

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

کچھ بھی ہوں پھر بھی دکھے دل کی صدا ہوں ناداں
میری باتوں کو سمجھ تلخی تقریر نہ دیکھ

وہی مجروح وہی شاعر آوارہ مزاج
کون اٹھا ہے تری بزم سے دلگیر نہ دیکھ



کلیم عاجز

- نام کلیم احمد تھا اور تخلص عاجز
- کلیم عاجز 11 اکتوبر 1926 کو پٹنہ کے قریب نالندہ ضلع کے تلہاڑہ میں پیدا ہوئے تھے۔ (اسکول کے ریکارڈ کے مطابق 11 اکتوبر 1924)
- کلیم عاجز کا انتقال 15 رفروری 2015 کو ہزاری باغ میں ہوا تھا۔
- کلیم عاجز کے والد کا نام شیخ کفایت حسین تھا اور والدہ کا امت الفاطمہ شہید
- کلیم عاجز نے ابتدائی تعلیم کا آغاز 1932 میں اپنے نانا مولوی سید ضمیر الدین کے مکتب سے کیا تھا۔
- کلیم عاجز نے میٹرک کے امتحان 1940 میں پورے بہار میں پانچویں پوزیشن حاصل کیا تھا۔
- کلیم عاجز کی شادی رئیس پٹنہ 'شیخ کنواں' کی پوتی انوار فاطمہ کے ساتھ 1942 میں ہوئی تھی۔
- کلیم عاجز نے بی اے آنرس (اردو) میں پٹنہ یونیورسٹی میں 1956 میں اوّل مقام حاصل کیا تھا اور چار طلائی تمغے سے سرفراز کیے گئے تھے۔
- کلیم عاجز نے ایم اے (اردو) میں 1958 میں پٹنہ یونیورسٹی میں اوّل مقام حاصل کیا تھا اور طلائی تمغے سے نوازے گئے تھے۔
- کلیم عاجز نے 'بہار میں اردو شاعری کا ارتقا' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پٹنہ یونیورسٹی سے 1965 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔
- کلیم عاجز پٹنہ یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرار 1965 میں مقرر ہوئے تھے۔
- کلیم عاجز نے پہلی بار مشاعرہ میں شرکت کر کے غزل 1949 میں پٹنہ میں پڑھی تھی۔
- کلیم عاجز پہلی بار پٹنہ سے باہر 'بزم فرخ' کی طرف سے جمشید پور 1951ء میں مشاعرہ میں بلائے گئے تھے۔
- کلیم عاجز پہلی بار ہندوستان سے باہر جدہ مشاعرہ میں 1966 میں بلائے گئے تھے۔
- کلیم عاجز کو اردو مشاورتی کمیٹی بہار کا صدر 2007 میں بنایا گیا تھا اور وہ دوبارہ اردو مشاورتی کمیٹی بہار کے صدر رہے تھے۔
- کلیم عاجز پٹنہ یونیورسٹی سے بحیثیت ریڈر ملازمت کی مدت مکمل کر کے 1984ء میں سبکدوش ہوئے تھے۔
- کلیم عاجز کو جانشین میر کہا جاتا ہے۔

- کلیم عاجز کی شاعری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری کا خمیر 1946 کے فساد سے تیار ہوا تھا۔
- کلیم عاجز کی شاعری میں میر کی طرح قنوطیت غالب ہے۔

اعزازات وانعامات

- کلیم عاجز کو میر اکادمی لکھنؤ نے 'امتیاز میر ایوارڈ' سے 1981ء میں نوازا تھا۔
- کلیم عاجز کو حکومت ہند نے پدم شری سے 1989 میں نوازنے اعلان کیا تھا۔
- کلیم عاجز کو محکمہ راج بھاشا حکومت بہار کے ذریعے ایک لاکھ اکیاون ہزار روپے کا مولانا مظہرالحق ایوارڈ 2001 میں ملا تھا۔
- کلیم عاجز کو میر تقی میر ایوارڈ سے 2008 میں نوازا گیا تھا۔
- کلیم عاجز کو غالب اکادمی دہلی نے غالب ایوارڈ سے 2012 میں نوازا تھا۔

کلیم عاجز کے کارنامے

* وہ جو شاعری کا سبب ہوا (پہلا مجموعۂ غزل مع خودنوشت)
* جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی (خودنوشت) * یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ (سفرنامۂ حج)
* اک دیس ایک بدیسی (سفرنامۂ امریکہ) * مجلس ادب (یادگار شعری محفلوں کی روداد)
* جب فصل بہاراں آئی تھی (غزلوں کا مجموعہ) * ابھی سن لو مجھ سے (خودنوشت)
* دیوانے دو (خطوط کا مجموعہ) * بہار میں اردو شاعری کا ارتقا (پی ایچ ڈی کا مقالہ)
* کوچۂ جاناں جاناں (نظموں کا مجموعہ) * پہلو نہ دُکھے گا (خطوط کا مجموعہ)
* میری زبان میرا قلم (دو حصے، مجموعۂ مضامین)
* پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا (ابتدائی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ

کلیم عاجز کے متعلق مختلف آراوخیالات

- ان (کلیم عاجز) کے شعروں میں ایک مخصوص سادگی ہے (کلیم الدین احمد)
- ان (کلیم عاجز) کے شعروں میں غم جاناں بھی ہے اور غم دوراں بھی اور دونوں اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں کیے جاسکتے۔ (کلیم الدین احمد)
- ان (کلیم عاجز) کی غزلوں میں دل کی باتیں بھی ہیں اور سیاسی باتیں بھی اور سیاسی باتیں غزل

کی زبان میں ہیں۔ان کے شعروں میں پھول نہیں اور پتھر بھی اور پھول پتھر بن جاتے ہیں اور پتھر پھول بن جاتے ہیں۔(کلیم الدین احمد)

- فراق نے کلیم عاجز کی شاعری پر رشک کا اظہار کیا ہے۔
- کلیم عاجز سراپا سوز ہیں اسی لیے ان کی غزلوں میں سنگن کی کیفیت اور آواز میں لہجے اور درد کا رقص نظر آتا ہے۔(کوثر مظہری)

'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' کی ابتدائی پانچ غزلیں

(1)

خوشی ہے کیا کسی آوارۂ وطن کے لیے — بہار آئی تو آیا کرے چمن کے لیے
نہ لالہ و گل و نسریں نہ نسترن کے لیے — مٹے ہیں ہم کسی غارت گرِ چمن کے لیے
کبھی جو گوشۂ خلوت میں شمع ہاتھ آئی — لپٹ کے رو لیے یارانِ انجمن کے لیے

ہم اُن سے شکوۂ بیداد کیا کریں عاجز
یہاں تو پاسِ وفا قفل ہے دہن کے لیے

(2)

جدا دیوانہ پن اب ایسے دیوانے سے کیا ہوگا — مجھے کیوں لوگ سمجھاتے ہیں سمجھانے سے کیا ہوگا
سلگنا اور شے ہے جل کے مرجانے سے کیا ہوگا — جو ہم سے ہو رہا ہے کام، پروانے سے کیا ہوگا
مرا قاتل انھیں کہتے ہیں سب اور ٹھیک کہتے ہیں — قسم سو بار وہ کھائیں قسم کھانے سے کیا ہوگا

مناسب ہے سمیٹو دامنِ دستِ دعا عاجز
زباں ہی بے اثر ہے ہاتھ پھیلانے سے کیا ہوگا

(3)

ستم کو بھی کرم ہائے نہاں کہنا ہی پڑتا ہے — کبھی نامہرباں کو مہرباں کہنا ہی پڑتا ہے
بنائے زندگی دو چار تنکوں پر سہی لیکن — انہی تنکوں کو آخر آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے
بھلا ہم اور تجھ کو ناز بردارِ عدو کہتے؟ — مگر اے بے نیازِ دوستاں! کہنا ہی پڑتا ہے
مری آہ و فغاں کو نالۂ بلبل سے کیا نسبت — مگر اک ہم وطن کو ہم زباں کہنا ہی پڑتا ہے
محبت خانۂ صیاد سے بھی ہو ہی جاتی ہے — قفس کو بھی کسی دن آشیاں کہنا ہی پڑتا ہے
بتوں سے اتنا دیرینہ تعلق باوجود اس کے — ہوا جو کچھ سرِ کوئے بتاں کہنا ہی پڑتا ہے

ہراک محفل میں جا کر ہم غزل کہتے نہیں لیکن
جہاں وہ شوخ ہوتا ہے ، وہاں کہنا ہی پڑتا ہے
یہ مانا عشق میں ضبطِ فغاں کی شرط لازم ہے
اُلجھتا ہے جو دل ، دردِ نہاں کہنا ہی پڑتا ہے

(4)

محبت بھی کیے جاتے ہیں غم کھائے بھی جاتے ہیں — گنہ کرتے بھی جاتے ہیں سزا پائے بھی جاتے ہیں
جفا کرتے بھی ہیں عذرِ جفا لائے بھی جاتے ہیں — لہو پیتے بھی جاتے ہیں قسم کھائے بھی جاتے ہیں
اِسی نے تم کو چمکایا ہمیں برباد کر ڈالا — وفا پر ناز بھی کرتے ہیں پچھتائے بھی جاتے ہیں
وہی ہر صبح امیدیں وہی ہر شام مایوسی — کھلے بھی جارہے ہیں پھول مرجھائے بھی جاتے ہیں
مزا یہ ہے لیے بھی جارہے ہیں جانبِ مقتل — تسلی بھی دیئے جاتے ہیں سمجھائے بھی جاتے ہیں
پڑے ہیں اس بتِ کافر کے سنگِ آستاں ہوکر
مگر پامال بھی ہوتے ہیں ٹھکرائے بھی جاتے ہیں

(5)

کچھ انتہائے سلسلۂ غم نہیں ہے آج — ہر ظلمِ آخریں ستمِ اوّلیں ہے آج
میرے مذاقِ غم پہ ہر اک نکتہ چیں ہے آج — اُن کی طرف نگاہ کسی کی نہیں ہے آج
بدنام کررہی ہے مجھے میری بندگی — ہر سنگِ آستاں پہ نشانِ جبیں ہے آج
درماں کہاں کہ پرسشِ غم بھی نہ کرسکی — اتنی بھی اس نگاہ کو فرصت نہیں ہے آج
پردہ حریمِ ناز کا اپنے بچایئے — فریاد کا مزاج بہت آتشیں ہے آج
انکار کررہے ہیں وہ اسی جرمِ قتل سے — جس کو گواہ ہر شکنِ آستیں ہے آج
زنجیر اپنا ہاتھ بڑھاتی ہی رہ گئی — دیوانۂ بہار کہیں سے کہیں ہے آج
عاجز مری فغاں پہ ہر اک یوں خموش ہے
جیسے کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں ہے آج



شہریار

- شہریار کا اصل نام کنور اخلاق محمد خان تھا اور تخلص شہریار
- شہریار 16 جون 1936 کو ضلع بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔
- شہریار کا انتقال 13 فروری 2011 کو علی گڑھ میں ہوا تھا (76 سال کی عمر میں)
- شہریار کے والد کا نام کنور ابو محمد خان تھا اور والدہ کا نام بسم اللہ بیگم
- شہریار کی شادی جوش کے قریبی عزیز محمود صاحب کی بیٹی نجمہ سے 1968 میں ہوئی تھی جو علی گڑھ کے وومنس کالج کے شعبۂ انگریزی میں لکچرر تھیں۔
- شہریار کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔
- شہریار نے 18 سال کی عمر میں ہائی اسکول کا امتحان سیکنڈ ڈویژن 1954 میں پاس کیا تھا۔
- شہریار نے سیکنڈ ڈویژن سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان 1956 میں پاس کیا تھا۔
- شہریار نے فرسٹ ڈویژن سے بی اے 1958 میں پاس کیا تھا۔
- شہریار نے ایم اے اردو فرسٹ ڈویژن سے 1962 میں پاس کیا تھا۔
- شہریار تخلص رکھنے کا واقعہ یہ ہے کہ حیدر آباد کے شاذ تمکنت نے شہزیار پر کسی محفل میں زور ڈالا کہ وہ شہریار اپنا قلمی نام رکھیں۔ شاذ تمکنت کا اس تجویز کو سب نے پسند کیا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے کہا کہ کنور کا متبادل شہریار ہے اس لیے تم اپنا نام شہریار رکھ لو۔ شہریار نے اس تجویز کو مان لیا اور وہ کنور اخلاق محمد خان سے شہریار ہو گئے۔
- شہریار نے پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں 'انیسویں صدی میں اردو تنقید کے رجحانات' نامی موضوع پر پی ایچ ڈی میں رجسٹریشن 1966 میں کرایا تھا۔
- شہریار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرر 1966 میں، ریڈر 1983 میں، پروفیسر 1987 میں اور ملازمت سے سبکدوش 1996 میں ہوئے تھے۔
- شہریار کی پہلی غزل 'مشرب' کراچی میں 1955 میں شائع ہوئی تھی۔
- شہریار نے باقاعدگی کے ساتھ شاعری 1958 میں شروع کی تھی۔
- شہریار کے مجموعوں کا انگریزی، ہسپانوی، جرمنی، فرنچ اور اطالوی کے علاوہ اڑیہ سمیت ہندوستان کے مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

- شہریار کا تعلق صحافت اور فلمی دنیا سے بھی تھا۔
- شہریار نے علی گڑھ میگزین، ماہنامہ غالب، ہماری زبان، فکر و نظر، شعر و حکمت وغیرہ کی ادارت کی ہے۔
- خلیل الرحمٰن اعظمی سے شہریار کے گہرے مراسم تھے۔

شہریار کے شعری کارنامے

- اسم اعظم 1965 (پہلا مجموعہ)
- ساتوں در 1969
- ہجر کے موسم 1978
- خواب کا در بند ہے 1985
- نیند کی کرچیں 1998
- حاصل سیر جہاں (کلیات) 2001
- شام ہونے والی ہے 2004
- قافلے یادوں کے (پہلا انتخاب) 1987
- دھوپ کی دیواریں 1998
- کلیات شہریار (پاکستان) 2007
- دھند کی روشنی (شہریار کی منتخب نظمیں 2003
- میرے حصے کی زمین (کلیاتِ ہندی) 1998

اعزازات وانعامات

- شہریار کو ان کے دوسرے مجموعے 'ساتواں در' پر اتر پردیش اردو اکادمی انعام سے 1971 میں نوازا گیا تھا۔ خواب کا در بند ہے پر بھی۔
- شہریار کو پانچواں مجموعہ 'نیند کی کرچیں' پر بنگال اردو اکادمی کی طرف سے پرویز شاہدی ایوارڈ سے 1997 میں سرفراز کیا گیا تھا۔
- شہریار کو اڑیسہ کی سمبل پور یونیورسٹی کا اعلیٰ ترین گنگا دھر راشٹریہ کویتا ایوارڈ سے 2009 میں نوازا گیا تھا۔
- شہریار کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے 1987 میں نوازا گیا تھا۔
- شہریار کو دہلی اردو اکادمی ایوارڈ سے 1998 میں نوازا گیا تھا۔
- شہریار کو فراق سمان سے 1998 میں نوازا گیا تھا۔
- شہریار کو ساہتیہ منچ ایوارڈ سے 1996 میں نوازا گیا تھا۔
- شہریار کو ادبی سنگم ایوارڈ نیو یارک سے 2000 میں نوازا گیا تھا۔
- شہریار کو حیدر آباد سینٹرل یونیورسٹی سے ڈی لٹ اعزازی سند سے 2010 میں نوازا گیا تھا۔

- شہریار کو یوپی فلم کرٹک انعام سے 2001 میں نوازا گیا تھا۔
- شہریار کو گیان پیٹھ ایوارڈ سے 2008 میں نوازا گیا تھا۔

اسم اعظم کی ابتدائی پانچ غزلیں

(1)

سینے میں جلن آنکھوں میں طوفان سا کیوں ہے
اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے

تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تا حد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

ہم نے تو کوئی بات نکالی نہیں غم کی
وہ زود پشیمان پشیمان سا کیوں ہے

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

(2)

مشعل درد پھر اک بار جلا لی جائے
جشن ہو جائے، ذرا دھوم مچا لی جائے

خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گذرا
دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے

جان بھی میری چلی جائے تو کچھ بات نہیں
وار تیرا نہ مگر ایک بھی خالی جائے

جو بھی ملنا ہے ترے در ہی سے ملنا ہے اسے
در ترا چھوڑ کے کیسے یہ سوالی جائے

وصل کی صبح کے ہونے میں ہے کچھ دیر ابھی
داستاں ہجر کی کچھ اور بڑھا لی جائے

(3)

حوصلہ دل کا نکل جانے دے
مجھ کو جلنے دے، پگھل جانے دے

آنچ پھولوں پہ نہ آنے دے مگر
خس و خاشاک کو جل جانے دے

مدتوں بعد صبا آئی ہے
موسم دل کو بدل جانے دے

چھا رہی ہیں جو مری آنکھوں پر
ان گھٹاؤں کو مچل جانے دے

تذکرہ اُس کا ابھی رہنے دے
اور کچھ رات کو ڈھل جانے دے

(4)

دیار دل نہ رہا بزم دوستاں نہ رہی
اماں کی کوئی جگہ زیر آسماں نہ رہی

رواں ہیں آج بھی رگ رگ میں خون کی موجیں
مگر وہ ایک خلش وہ متاع جاں نہ رہی

لڑیں غموں کے اندھیروں سے کس کی خاطر ہم ۔۔۔ کوئی کرن بھی تو اس دل میں ضوفشاں نہ رہی

میں اس کو دیکھ کے آنکھوں کا نور کھو بیٹھا ۔۔۔ یہ زندگی مری آنکھوں سے کیوں نہاں نہ رہی

زباں ملی بھی تو کس وقت بے زبانوں کو ۔۔۔ سنانے کے لیے جب کوئی داستاں نہ رہی

(5)

دام الفت سے چھوٹتی ہی نہیں ۔۔۔ زندگی تجھ کو بھولتی ہی نہیں

کتنے طوفاں اٹھائے آنکھوں نے ۔۔۔ ناؤ یادوں کی ڈوبتی ہی نہیں

تجھ سے ملنے کی تجھ کو پانے کی ۔۔۔ کوئی تدبیر سوجھتی ہی نہیں

ایک منزل پہ رک گئی ہے حیات ۔۔۔ یہ زمیں جیسے گھومتی ہی نہیں

لوگ سر پھوڑ کر بھی دیکھ چکے ۔۔۔ غم کی دیوار ٹوٹتی ہی نہیں



عرفان صدیقی

- نام محمد عرفان احمد صدیقی تھا اور تخلص عرفان صدیقی۔
- عرفان صدیقی 11 مارچ 1939 کو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔
- عرفان صدیقی کا انتقال 15 اپریل 2004 کو لکھنؤ میں ہوا تھا۔
- عرفان صدیقی کے والد کا نام سلمان احمد ہلالی تھا اور والدہ کا رابعہ خاتون۔
- عرفان صدیقی کی شادی سیدہ حبیب کے ساتھ 1964 میں ہوئی تھی۔
- عرفان صدیقی نے ابتدائی تعلیم اسکول اور اسلامیہ انٹر کالج بدایوں سے حاصل کی تھی۔
- عرفان صدیقی نے اعلیٰ تعلیم بریلی کالج بریلی سے حاصل کی تھی۔
- عرفان صدیقی نے ایم اے آگرہ یونیورسٹی سے کیا تھا۔
- عرفان صدیقی نے نو برس کی عمر میں شاعری شروع کی تھی۔
- عرفان صدیقی کے دادا مولوی اکرام احمد شاؔد صدیقی شاعر تھے اور احسن مارہروی کے شاگرد تھے۔
- عرفان صدیقی دہلی میں وزارت اطلاعات ونشریات کی مرکزی اطلاعاتی خدمات سے وابستہ 1962 میں ہوئے تھے۔
- عرفان صدیقی کا دہلی سے لکھنؤ تبادلہ 1974 میں ہوا تھا۔
- عرفان صدیقی حکومت ہند کے سینٹرل کماں میں پی آ او 1988 میں مقرر ہوئے تھے۔
- عرفان صدیقی ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن آفیسر کی ملازمت سے 1997 میں سبک دوش ہوئے تھے۔

اعزازات وانعامات

- عرفان صدیقی کو میرا اکادمی لکھنؤ نے 'نشانِ امتیاز میر' سے نوازا تھا۔
- عرفان صدیقی کو اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ سے مجموعی خدمات اعتراف میں 1998 میں نوازا گیا تھا۔
- عرفان صدیقی کو غالب ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

عرفان صدیقی کے کارنامے

- **شعری کارنامے:** * کینوس 1978 * شب درمیانی (1984) * سات سماوات (1992) * عشق نامہ (1997) * دریا (1999) (پہلے چار مجموعوں کی کلیات) * ہوائے دشت ماریہ (1998) سلام ومنقبت پر مشتمل
- **نثری تصنیفات:** * عوامی ترسیل (1977) * شہر ملال (کلیات) * رابطۂ عامہ (1984)

تراجم

- مترم سنگھار (کالی داس کی کتاب رتو سمہار) کا منظوم ترجمہ
- مالویکا اگنی مترا (کالی داس کے ڈرامہ کا سنسکرت سے ترجمہ)
- روٹی کی خاطر (عربی ناول نگار محمد شکری کے سوانحی ناول کا ترجمہ)

'عشق نامہ' کی ابتدائی پانچ غزلیں

(1)

خانہ درد ترے خاک بہ سر آگئے ہیں
اب تو پہچان کہ ہم شام کو گھر آگئے ہیں
جان و دل کب کے گئے ناقہ سواروں کی طرح
یہ بدن گرد اڑانے کو کدھر آگئے ہیں
رات دن سوچتے رہتے ہیں یہ زندانیِ ہجر
اس نے چاہا ہے تو دیوار میں در آگئے ہیں
اس کے ہی ہاتھ میں ہے شاخِ تعلق کی بہار
چھو لیا ہے تو نئے برگ و ثمر آگئے ہیں
ہم نے دیکھا ہی تھا دنیا کو ابھی اُس کے بغیر
لیجیے بیچ میں پھر دیدہ تر آگئے ہیں
اتنا آساں نہیں فیصلہ ترکِ سفر
پھر مری راہ میں دوچار شجر آگئے ہیں
نیند کے شہر طلسمات میں دیکھیں کیا ہے
جاگتے میں تو بہت خواب نظر آگئے ہیں

(2)

اس نے کیا دیکھا کہ ہر صحرا چمن لگنے لگا
کتنا اچھا اپنا من، اپنا بدن لگنے لگا
جنگلوں سے کون سا جھونکا لگا لایا اسے
دل کہ جگنو تھا چراغِ انجمن لگنے لگا
اس کے لکھے لفظ پھولوں کی طرح کھلتے رہے
روز ان آنکھوں میں بازارِ سمن لگنے لگا

اوّل اوّل اس سے کچھ حرف و نوا کرتے تھے ہم
رفتہ رفتہ رائیگاں کارِ سخن لگنے لگا
جب قریب آیا تو ہم خود سے جدا ہونے لگے
وہ حجابِ درمیانِ جان و تن لگنے لگا
ہم کہاں کے یوسفِ ثانی تھے لیکن اس کا ہاتھ
ایک شب ہم کو بلائے پیرہن لگنے لگا
تیرے وحشی نے گرفتاری سے بچنے کے لیے
رم کیا اتنا کہ آہوئے ختن لگنے لگا
ہم بڑے اہلِ خرد بنتے تھے یہ کیا ہو گیا
عقل کا ہر مشورہ دیوانہ پن لگنے لگا
کر گیا روشن ہمیں پھر سے کوئی بدرِ منیر
ہم تو سمجھے تھے کہ سورج کو گہن لگنے لگا

(3)

میرے تن کے بہت رنگ ہیں جانِ من، اور نہاں دل کے نیرنگ خانوں میں ہیں
لامسہ، شامہ و ذائقہ، سامعہ، باصرہ، سب مرے رازدانوں میں ہیں

اور کچھ دامنِ دل کشادہ کرو، دوستو شکرِ نعمت زیادہ کرو
پیڑ، دریا، ہَوا، روشنی، عورتیں، خوشبوئیں، سب خدا کے خزانوں میں ہیں
ناقہ حسن کی ہم رکابی کہاں، خیمۂ ناز میں باریابی کہاں
ہم تو اے بانوے کشورِ دِلبری پاس داروں میں ہیں، ساربانوں میں ہیں
میرے اندر بھی ہے ایک شہرِ دِگر، میرے مہتاب، اک رات اِدھر سے گزر
کیسے کیسے چراغ ان دریچوں میں ہیں، کیسے کیسے قمر اِن مکانوں میں ہیں
اِک سِتارہ ادا نے یہ کیا کر دیا، میری مٹی سے مجھ کو جدا کر دیا
اِن دنوں پاؤں میرے زمیں پر نہیں، اب مِری منزلیں آسمانوں میں ہیں

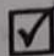
(4)

لپٹ سی داغ کہن کی طرف سے آتی ہے
جب اک ہوا ترے تن کی طرف سے آتی ہے
میں تیری منزل جاں تک پہنچ تو سکتا ہوں
مگر یہ راہ بدن کی طرف سے آتی ہے
یہ مشک ہے کہ محبت مجھے نہیں معلوم
مہک سی میرے ہرن کی طرف سے آتی ہے
پہاڑ چپ ہیں تو اب ریگ زار بولتے ہیں
ندائے کوہ ختن کی طرف سے آتی ہے

کسی کے وعدۂ فردا کے برگ و بار کی خیر
یہ آگ ہجر کے بن کی طرف سے آتی ہے
جگوں کے کھوئے ہوؤں کو پکارتا ہے یہ کون
صدا تو خاک وطن کی طرف سے آتی ہے

(5)

شہاب چہرہ کوئی گم شدہ ستارہ کوئی
ہوا طلوع افق پر مرے دوبارہ کوئی
امید واروں پہ کھلتا نہیں وہ باب وصال
اور اس کے شہر سے کرتا نہیں کنارہ کوئی
مگر گرفت میں آتا نہیں بدن اس کا
خیال ڈھونڈتا رہتا ہے استعارہ کوئی
کہاں سے آتے ہیں یہ گھر اجالتے ہوئے لفظ
چھپا ہے کیا مری مٹی میں ماہ پارہ کوئی
بس اپنے دل کی صدا پر نکل چلیں اس بار
کہ سب کو غیب سے ملتا نہیں اشارہ کوئی
گماں نہ کر کہ ہوا ختم کار دل زدگاں
عجب نہیں کہ ہو اس راکھ میں شرارہ کوئی
اگر نصیب نہ ہو اس قمر کی ہم سفری
تو کیوں نہ خاک گزر پر کرے گزارہ کوئی



Unit-4

اردو نظم

نظم کی صنفی شناخت

- نظم عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پرونا، موتیوں کو تاگے میں پرونا، لڑی، سلک۔
- کسی خاص موضوع پر تسلسل کے ساتھ اشعار کی صورت میں اظہار خیال کرنے کو نظم کہتے ہیں۔
- نظم میں موضوعات ایک سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ سب ایک بنیادی موضوع کے تحت یا اس سے مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔
- نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔
- ارتقا نظم کی ایک اہم خصوصیت ہے۔
- کولرج نے نظم کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا اساسی مقصد صداقت کی ترجمانی نہیں بلکہ مسرت کا ادراک ہے۔
- پابند نظم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ردیف، قافیہ اور بحر کے مقررہ اوزان کی پابندی کی جاتی ہے۔
- پابند نظم میں موضوعات اور اشعار کی تعداد کی قید نہیں ہوتی ہے۔
- آزاد نظم اس نظم کو کہتے ہیں جس میں ردیف اور قافیے کی پابندی نہیں کی جاتی۔
- آزاد نظم میں بحر اور وزن کی پابندی تو ہوتی ہے مگر ارکان بحر کی تعداد ہر مصرعے میں متعین نہیں ہوتی ہے جس کی وجہ سے مصرعے چھوٹے بڑے ہو جاتے ہیں۔
- نظم معریٰ اس نظم کو کہتے ہیں جس میں قافیے کی پابندی نہیں کی جاتی مگر بحر کے مقررہ اوزان استعمال ہوتے ہیں۔ یعنی اگر پہلے مصرعے میں بحر کے چار ارکان استعمال ہوتے ہیں تو اس کی پابندی نظم کے ہر مصرعے میں ہوتی ہے۔
- عام لفظوں میں نظم معریٰ بلا قافیہ نظم کو کہتے ہیں۔
- نظم معریٰ اردو میں انگریزی ادب سے آئی ہے۔
- مولوی عبدالحق نے بے قافیہ نظم کے لیے نظم معریٰ کی اصطلاح کو رواج دینے کا مشورہ دیا ہے۔
- عبدالحلیم شرر نے نظم معریٰ کو اپنے رسالے کے ذریعے ایک روایت کا درجہ دیا ہے۔

اردو میں نظم نگاری کا آغاز و ارتقا

- دیگر اصناف سخن کی طرح نظم گوئی کی بھی ابتدا دکن سے ہوئی تھی۔

- دکن کے مشہور صوفی حضرت بندہ نواز گیسودراز (یہ شہباز تخلص کرتے تھے) کو اردو کا پہلا نظم گو قرار دیا جاتا ہے اور ان کی نظم 'چکی نامہ' کو اردو کی پہلی نظم ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اردو نظم دکن میں:

- خواجہ بندہ نواز گیسودراز
- قلی قطب شاہ
- برہان الدین جانم
- علی عادل شاہ ثانی

اردو نظم کا ابتدائی دور شمالی ہند میں:

- افضل جھنجھانوی
- جعفر زٹلی (انقلاب زمانہ)
- فائز
- حاتم

- نظیر اکبر آبادی کا دور جو میر اور سودا کا دور کہلاتا ہے۔
- میر اور سودا کے دور میں نظیر اکبر آبادی تنہا ایسا شاعر ہے جس نے روایت سے الگ ہو کر شاعری کی ہے اور نظم کو اپنے تجربات و خیالات کا وسیلہ بنایا ہے۔

نظم جدید کا دور:

- نظم جدید کی ابتدا محمد حسین آزاد اور حالی نے کی تھی۔
- یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ نظم 1874ء میں قائم ہونے والی انجمن پنجاب جیسی ادبی تحریک کی شکل میں ہوا تھا جس کی نمائندگی آزاد اور حالی کر رہے تھے۔

* آزاد * حالی * انور حسین * ذوق کاکوری
* اشرف بیگ * قادر بیگ * مضطر دہلوی * راحت دہلوی
* مرزا اشرف * فکری * رفیق * کرشن لعل

انجمن پنجاب سے باہر نظم نگاری:

* اسمٰعیل میرٹھی * عبدالحلیم شرر * اکبرالہ آبادی * شاد عظیم آبادی
* اقبال * جوش ملیح آبادی * فراق گورکھپوری * ساغر نظامی
* نظم طباطبائی * شوق قدوائی * وحیدالدین سلیم * درگا سہائے
* نادر کاکوروی * منشی جوالا پرشاد برق * کیفی دہلوی * مہاراجہ کشن پرشاد شاد
* پنڈت امرناتھ * چکبست * تلوک چند محروم * اختر شیرانی
* شبلی * عظمت اللہ خان * حفیظ

ترقی پسند تحریک اور اردو نظم:

- فیض احمد فیض * اسرار الحق مجاز * جاں نثار اختر * علی سردار جعفری
- ساحر لدھیانوی * کیفی اعظمی * احمد ندیم قاسمی * مخدوم محی الدین
- مجروح * جذبی * وامق جونپوری * احسان دانش
- ظہیر کاشمیری * غلام ربانی تاباں * شمیم کرہانی * عرش ملسیانی
- اختر انصاری * میکش حیدرآبادی * میر حسن * جمیل مظہری
- پرویز شاہدی * سکندر علی وجد

حلقۂ ارباب ذوق اور اردو نظم:

- میراجی * ن م راشد * تصدق حسین خالق * قیوم نظر
- یوسف ظفر * مختار صدیقی

دیگر شعرا:

- ڈاکٹر تاثیر * مجید امجد * اختر الایمان * ضیا جالندھری
- عارف * ظہور نظر * بلراج کومل * منیر نیازی
- خلیل الرحمٰن اعظمی * قاضی سلیم * محمد علوی

آزادی کے بعد اردو نظم:

- عمیق حنفی * وحید اختر * ابن انشا * وزیر آغا
- سلیم احمد * فہمیدہ ریاض

اردو کے اہم نظم نگار اور ان کی نظمیں

عوامی شاعر

نظیر اکبر آبادی

(1740-1830ء)

- نام شیخ ولی محمد تھا اور تخلص نظیر
- نظیر 1740 کے قریب دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔
- نظیر کا انتقال 1246ھ مطابق 16 اگست 1830 کو ہوا (90 سال کی عمر میں)
- نظیر کے والد کا نام شیخ فاروق تھا۔
- نظیر 1757 میں احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت اپنی ماں کو لے کر اکبر آباد (آگرہ چلے آئے تھے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ہر جگہ آگرہ ہی کو اپنا وطن بتاتے تھے۔
- نظیر شیخ فاروق کی تیرہویں اولاد تھے۔ ان سے پہلے بارہ اولادیں فوت ہو چکی تھیں۔
- نظیر نے ادھیڑ عمر میں مسماۃ تہور النسا بیگم بنت عبدالرحمٰن خان چغتائی سے نکاح کیا تھا۔
- نظیر سے ایک لڑکا خلیفہ سید گلزار علی اسیر اور ایک لڑکی امانی بیگم تھیں۔
- نظیر اکبر آبادی نے شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی۔
- اردو شاعری میں سب سے زیادہ متروک الفاظ کا استعمال نظیر نے کیا ہے۔
- نظیر اکبر آبادی نے جتنے ہندوستانی الفاظ اپنی شاعری میں استعمال کیے ہیں اتنے کسی دوسرے نے ان سے پہلے استعمال نہیں کیا ہے۔
- نظیر میر تقی میر کے ہم عصر تھے۔
- نظیر اردو میں عوامی شاعری کے نمائندہ شاعر ہیں۔
- حبیب تنویر نے نظیر اکبر آبادی پر ایک ڈرامہ 'آگرہ بازار کے نام سے' لکھا ہے جو پہلے پہل جامعہ ملیہ میں کھیلا گیا تھا۔
- یاد رہے کہ نظیر کسی دبستان سے متعلق نہیں تھے، نہ دہلی سے نہ لکھنو سے۔

نظیر کے متعلق مختلف آرا و خیالات

(کلیم الدین احمد)

- نظیر کا وجود ہی اردو شاعری کی بے نظیر تنقید ہے۔
- نیاز فتح پوری نے نظیر کو 'چھچھلے باز شاعر' کہا ہے۔
- نظیر اکبر آبادی کے بارے میں نیاز فتح پوری نے کہا تھا کہ ''یہاں کبیر کے اخلاق اور خسرو کے ذہن کا ایک دلکش امتزاج ملتا ہے۔''
- نظیر کا دماغ چھوٹا اور تجربہ محدود ہے۔ (شمس الرحمٰن فاروقی)
- نظیر کی نظم کلجگ کو مجنوں گورکھ پوری نے روسو کے 'معاشرتی عہد نامہ' کے مماثل قرار دیا ہے۔
- نظیر اکبر آبادی اردو شاعری کے آسمان پر ایک درخشندہ ستارہ ہیں۔ (کلیم الدین احمد)

نظیر کی داخل نصاب نظمیں

مفلسی

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی   کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی
پیاسا تمام روز بٹھاتی ہے مفلسی   بھوکا تمام رات سلاتی ہے مفلسی
یہ دکھ وہ جانے جس پہ کہ آتی ہے مفلسی

کہیے تو اب حکیم کی سب سے بڑی ہے شاں   تعظیم جس کی کرتے ہیں نواب اور خاں
مفلس ہوئے تو حضرت لقمان کیا ہے یاں   عیسیٰ بھی ہو تو کوئی نہیں پوچھتا میاں
حکمت حکیم کی بھی ڈوباتی ہے مفلسی

جو اہل فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں   مفلس ہوئے تو کلمہ تلک بھول جاتے ہیں
پوچھے کوئی الف تو اسے بے بتاتے ہیں   وہ جو غریب غربا کے لڑکے پڑھاتے ہیں
اُن کی تو عمر بھر نہیں جاتی ہے مفلسی

مفلس کرے جو آن کے مجلس کے بیچ حال   سب جانیں روٹیوں کا یہ ڈالا ہے اس نے جال
گر گر پڑے تو کوئی نہ لیوے اسے سنبھال   مفلس میں ہوویں لاکھ اگر علم اور کمال
سب خاک بیچ آ کے ملاتی ہے مفلسی

جب روٹیوں کے بٹنے کا آ کر پڑے شمار   مفلس کو دیویں ایک تونگر کو چار چار
مانگے گر اور وہ تو اسے جھڑکیں بار بار   اس مفلس کا آہ بیاں کیا کروں میں یار
مفلس کو اس جگہ بھی چباتی ہے مفلسی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر　　دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر　　جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

کرتا نہیں حیا سے جو کوئی وہ کام آہ　　مفلس کرے ہے اس کے تئیں انصرام آہ
سمجھے نہ کچھ حلال نہ جانے حرام آہ　　کہتے ہیں جس کو شرم و حیا ننگ و نام آہ
وہ سب حیا و شرم اٹھاتی ہے مفلسی

یہ مفلسی وہ شے ہے کہ جس گھر میں بھر گئی　　پھر جتنی گھر میں ست تھی اس گھر کے در گئی
زن بچے روتے ہیں گویا نانی گزر گئی　　ہم سایہ پوچھتے ہیں کہ کیا دادی مر گئی
بن مردہ گھر میں شور مچاتی ہے مفلسی

لازم ہے گر غمی میں کوئی شور وغل مچائے　　مفلس بغیر غم کے ہی کرتا ہے ہائے ہائے
مر جاوے گر کوئی تو کہاں سے اسے اٹھائے　　اس مفلسی کی خواریاں کیا کیا کہوں میں ہائے
مردے کو بن کفن کے گڑاتی ہے مفلسی

کیا کیا میں مفلسی کی کہوں خواری پھکڑیاں　　جھاڑو بغیر گھر میں بکھرتی ہیں جھکڑیاں
کونوں میں جالے لپٹے ہیں چھپر میں مکڑیاں　　پیدا نہ ہوویں جن کے جلانے کو لکڑیاں
دریا میں ان کے مردے بہاتی ہے مفلسی

بی بی کی نتھ نہ لڑکوں کے ہاتھوں کڑے رہے　　کپڑے میاں کے بنیے کے گھر میں پڑے رہے
جب کڑیاں بک گئیں تو کھنڈر میں اڑے رہے　　زنجیر نے کواڑ نہ پتھر گڑے رہے
آخر کو اینٹ اینٹ کھداتی ہے مفلسی

نقاش پر بھی زور جب آ مفلسی کرے　　سب رنگ دم میں کر دے مصور کے کر کرے
صورت بھی اس کی دیکھ کے منہ کھنچ رہے پرے　　تصویر اور نقش میں کیا رنگ وہ بھرے
اس کے تو منہ کا رنگ اڑاتی ہے مفلسی

جب خوب رو پہ آن کے پڑتا ہے دن سیاہ　　پھرتا ہے بوسے دیتا ہے ہر اک کو وہ خواہ مخواہ
ہرگز کسی کے دل کو نہیں ہوتی اس کی چاہ　　گر حسن ہو ہزار روپے کا تو اس کو آہ
کیا کوڑیوں کے مول بکاتی ہے مفلسی

اس خوب رو کو کون دے اب دام اور درم　　جو کوڑی کوڑی بوسے کو راضی ہو دم بہ دم
ٹوپی پرانی دو تو وہ جانے کلاہ جم　　کیوں کر نہ جی کو اس چمن حسن کے ہو غم
جس کی بہار مفت لٹاتی ہے مفلسی

عاشق کے حال پر بھی جب آ مفلسی پڑے — معشوق اپنے پاس نہ دے اس کو بیٹھنے
آوے جو رات کو تو نکالے وہیں اسے — اس ڈر سے یعنی رات کو ایذا کہیں نہ دے
تہمت یہ عاشقوں کو لگاتی ہے مفلسی

کیسی ہی دھوم دھام کی رنڈی ہو خوش جمال — جب مفلسی کا آن پڑے سر پہ اس کے جال
دیتے ہیں اس کے ناچ کو ٹھٹھے کے بیچ ڈال — ناچے ہے وہ تو فرش کے اوپر قدم سنبھال
اور اس کو انگلیوں پہ نچاتی ہے مفلسی

اس کا تو دل ٹھکانے نہیں بھاؤ کیا بتائے — جب ہو پھٹا دوپٹہ تو کاہے سے منہ چھپائے
وہ شام سے لے صبح تلک گو کہ ناچے گائے — اوروں کو آٹھ سات تو وہ دو ٹکے ہی پائے
اس لاج سے اسے بھی لجاتی ہے مفلسی

جس +++ کا ہو ہلاکت سے دل حزیں — رکھتا ہے اس کو جب کوئی آ کر تماش بیں
اک پون پیسے تک بھی وہ کرتی نہیں نہیں — یہ دکھ اسی سے پوچھیے اب آہ جس کے تئیں
+++ ساری رات جگاتی ہے مفلسی

وہ تو یہ سمجھے دل میں کہ ڈھیلا جو پاؤں گی — دمڑی کے پان دمڑی کے مسی منگاؤں گی
باقی رہی چھدام سو پانی بھراؤں گی — پھر دل میں سوچتی ہے کہ کیا خاک کھاؤں گی
آخر چبینا اس کا بھناتی ہے مفلسی

جب مفلسی سے ہووے کلاونت کا دل اداس — پھرتا ہے لے طنبورے کو ہر گھر کے آس پاس
اک پاؤ سیر آٹے کی دل میں لگا کے آس — گوری کا وقت ہووے تو گاتا ہے وہ بھباس
یاں تک حواس اس کے اڑاتی ہے مفلسی

مفلس جو بیاہ بیٹی کا کرتا ہے بول بول — پیسا کہاں جو جا کے وہ لاوے جہیز مول
جورو کا وہ گلا ہے کہ پھوٹا ہو جیسے ڈھول — گھر کی حلال خوری تلک کرتی ہے ٹھٹھول
ہیبت تمام اس کی اٹھاتی ہے مفلسی

بیٹے کا بیاہ ہووے تو بیاہی نہ سائی ہے — نے روشنی نہ باجے کی آواز آتی ہے
ماں پیچھے ایک میلی چدر اوڑھے جاتی ہے — بیٹا بنا ہے دولہا تو باوا براتی ہے
مفلس کی یہ برات چڑھاتی ہے مفلسی

گر بیاہ کر چلا ہے سحر کو تو یہ بلا — شہداز نانہ ہیجڑا اور بھاٹ منڈ چڑا
گھیرے ہوئے اسے چلے جاتے ہیں جا بہ جا — وہ آگے آگے لڑتا ہوا جاتا ہے چلا
اور پیچھے تھپڑیوں کو بجاتی ہے مفلسی

دروازے پر زنانے بجاتے ہیں تالیاں — اور گھر میں بیٹھی ڈومنی دیتی ہیں گالیاں
مالن گلے کی ہار ہو دوڑے لے ڈالیاں — سقا کھڑا سناتا ہے باتیں رزالیاں
یہ خواری یہ خرابی دکھاتی ہے مفلسی

کوئی شوم بے حیا کوئی بولا نکھٹو ہے — بیٹے نے جانا باپ تو میرا نکھٹو ہے
بیٹے پکارتے ہیں کہ بابا نکھٹو ہے — بی بی یہ دل میں کہتی ہے کہ بھڑوا نکھٹو ہے
آخر نکھٹو نام دھراتی ہے مفلسی

مفلس کا درد دل میں کوئی ٹھانتا نہیں — مفلس کی بات کو بھی کوئی مانتا نہیں
ذات اور حسب نسب کو کوئی جانتا نہیں — صورت بھی اس کی پھر کوئی پہچانتا نہیں
یاں تک نظر سے اس کو گراتی ہے مفلسی

جس وقت مفلسی سے یہ آ کر ہوا تباہ — پھر کوئی اس کے حال پہ کرتا نہیں نگاہ
والیدری کہے کوئی ٹھہرا دے رو سیاہ — جو باتیں عمر بھر نہ سنی ہوویں اس نے آہ
وہ باتیں اس کو آ کے سناتی ہیں مفلسی

چولھے توانہ پانی کے مٹکے میں آبی ہے — پینے کو کچھ نہ کھانے کو اور نے رکابی ہے
مفلس کے ساتھ سب کے تئیں بے حجابی ہے — مفلس کی جورو سچ ہے کہ یاں سب کی بھابی ہے
عزت سب اس کے دل کی گنواتی ہے مفلسی

کیسا ہی آدمی ہو پر افلاس کے طفیل — کوئی گدھا کہے اسے ٹھہرا دے کوئی بیل
کپڑے پھٹے تمام بڑھے بال پھیل پھیل — منہ خشک دانت زرد بدن پر جما ہے میل
سب شکل قیدیوں کی بناتی ہے مفلسی

ہر آن دوستوں کی محبت گھٹاتی ہے — جو آشنا ہیں ان کی تو الفت گھٹاتی ہے
اپنو کی مہر غیر کی چاہت گھٹاتی ہے — شرم و حیا و عزت و حرمت گھٹاتی ہے
ہاں ناخن اور بال بڑھاتی ہے مفلسی

جب مفلسی ہوئی تو شرافت کہاں رہی — وہ قدر ذات کی وہ نجابت کہاں رہی
کپڑے پھٹے تو لوگوں میں عزت کہاں رہی — تعظیم اور تواضع کی بابت کہاں رہی
مجلس کی جوتیوں پہ بٹھاتی ہے مفلسی

مفلس کسی کا لڑکا جو لے پیار سے اٹھا — باپ اس کا دیکھے ہاتھ کا اور پاؤں کا کڑا
کہتا ہے کوئی جوتی نہ لیوے کہیں چرا — نٹ کھٹ اچکا چور دغاباز گٹھ کٹا
سو سو طرح کے عیب لگاتی ہے مفلسی

رہتی نہیں کسی کی یہ غیرت کی آن کو ۔۔۔ سب خاک میں ملاتی ہے حرمت کی شان کو
سو محنتوں میں اس کی کھپاتی ہے جان کو ۔۔۔ چوری پہ آ کے ڈالے ہی مفلس کے دھیان کو
آخر ندان بھیک منگاتی ہے مفلسی

دنیا میں لے کے شاہ سے اے یارو تا فقیر ۔۔۔ خالق نہ مفلسی میں کسی کو کرے اسیر
اشراف کو بناتی ہے اک آن میں فقیر ۔۔۔ کیا کیا میں مفلسی کی خرابی کہوں نظیرؔ
وہ جانے جس کے دل کو جلاتی ہے مفلسی

آدمی نامہ

دنیا میں بادشا ہے سو ہے وہ بھی آدمی ۔۔۔ اور مفلس و گدا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
زردار، بے نوا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی ۔۔۔ نعمت جو کھا رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال و قُطب و غوث و وَلی آدمی ہوئے ۔۔۔ مُنکِر بھی آدمی ہوئے اور کُفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے، کشف و کرامات کے کیے ۔۔۔ حتیٰ کے اپنے زہد و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا ۔۔۔ شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہا تا تھا بر ملا ۔۔۔ یہ بات ہے سمجھنے کی، آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی نار ہے، اور آدمی ہی نور ۔۔۔ یاں آدمی ہی پاس ہے، اور آدمی ہی دور
کل آدمی کا حُسن و قبح میں ہے یاں ظہور ۔۔۔ شیطان بھی آدمی ہے، جو کرتا ہے مکر و زُور
اور ہادی رہنما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں ۔۔۔ بنتے ہیں آدمی ہی، امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی، قرآن اور نماز، یاں ۔۔۔ اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی پہ جان کو وارے ہے آدمی ۔۔۔ اور آدمی ہی تیغ سے مارے ہے آدمی
پگڑی بھی آدمی کی اتارے ہے آدمی ۔۔۔ چلا کے آدمی کو پکارے ہے آدمی
اور سن کے دوڑتا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

چلتا ہے آدمی ہی، مسافر ہو، لے کے مال　　اور آدمی ہی مارے ہے، پھانسی گلے میں ڈال
یاں آدمی ہی صید ہے ، اور آدمی ہی جال　　سچا بھی آدمی ہی، نکلتا ہے میرے لال
اور جھوٹ کا بھرا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی شادی ہے، اور آدمی بیاہ　　قاضی وکیل آدمی، اور آدمی گواہ
تاشے بجاتے آدمی چلتے ہیں، خوامخواہ　　دوڑے ہیں آدمی ہی مشعلیں جلا کے واہ
اور بیاہنے چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو، بولے ہے بار بار　　اور آدمی ہی پیادے ہیں، اور آدمی سوار
حقہ ، صراحی، جوتیاں، دوڑیں بغل میں مار　　کاندھے پہ رکھ کے پالکی، ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

بیٹھے ہیں آدمی ہی، دکانیں لگا لگا　　کہتا ہے کوئی لو، کوئی کہتا ہے، لا رے لا
اور آدمی ہی پھرتے ہیں، رکھ سر پہ خوانچا　　کس کس طرح سے بیچیں ہیں، چیزیں بنا بنا
اور مول لے رہا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی قہر سے لڑتے ہیں گھورگھور　　اور آدمی ہی دیکھ انھیں بھاگتے ہیں دور
چاکر غلام آدمی اور آدمی مزدور　　یاں تک کہ آدمی ہی اٹھاتے ہیں جا ضرور
اور جس نے وہ پھرا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

طبلے منجیرے دائرے سارنگیاں بجا　　گاتے ہیں آدمی ہی ہر اک طرح جابجا
رنڈی بھی آدمی ہی نچاتے ہیں گت لگا　　وہ آدمی ہی ناچیں ہیں اور دیکھا یہ مزا
جو ناچ دیکھتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی ہی، لعل و جواہر ہے، بے بہا　　اور آدمی ہی خاک سے بد تر ہی ہو گیا
کالا بھی آدمی ہے ، اور اُلٹا ہے جُوں توا　　گورا بھی آدمی ہے کہ ٹکڑا سا چاند کا
بد شکل و بد نما ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اک آدمی ہیں جن کی ہی کچھ زرق برق ہیں　　روپے کے ان کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے ، تا بہ شرق ہیں　　کمخواب، تاش، شال، دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اک ایسے ہیں کہ، جن کے بچھے ہیں نئے پلنگ　　پھولوں کی سیج ان پہ جھمکتی ہے تازہ رنگ
سوتے ہیں لپٹے چھاتی سے معشوق شوخ وشنگ　　سوسوطرح سے عیش کے کرتے ہیں رنگ ڈھنگ
اور خاک میں پڑا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

جراں ہوں یارو، دیکھو تو، کیا یہ سوانگ ہے — اور آدمی ہی چور ہے، اور آپ ہی تھانگ ہے
ہے چھینا جھپٹی، اور کہیں مانگ تانگ ہے — دیکھا تو آدمی ہی یہاں مثل رانگ ہے
فولاد سے گھڑا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

رنے میں آدمی ہی، کفن کرتے ہیں تیار — نہلا دھلا اٹھاتے ہیں، کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں، روتے ہیں زار وزار — سب آدمی ہی کرتے ہیں، مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے، لے شاہ تا وزیر — ہیں آدمی ہی صاحبِ عزت بھی، اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں، اور آدمی ہی پیر — اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بنجارا

دنیا کا سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا

ٹک حرص و ہوا کو چھوڑ میاں مت دیس بدیس پھرے مارا

قزاق اجل کا لوٹے ہے دن رات بجا کر نقارا
کیا بدھیا بھینسا بیل شتر کیا گوئی پلا سر بھارا
کیا گیہوں چانول موٹھ مٹر کیا آگ دھواں کیا انگارا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

گر تو ہے لکھی بنجارا اور کھیپ بھی تیری بھاری ہے
اے غافل تجھ سے بھی چڑھتا اک اور بڑا بیوپاری ہے
کیا شکر مصری قند گری کیا سانبھر میٹھا کھاری ہے
کیا داکھ منقی سونٹھ مرچ کیا کیسر لونگ سپاری ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ بدھیا لادے بیل بھرے جو پورب پچھم جاوے گا
یا سود بڑھا کر لاوے گا یا ٹوٹا گھاٹا پاوے گا

قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گراوے گا
دھن دولت ناتی پوتا کیا اک کنبہ کام نہ آوے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر منزل میں اب ساتھ ترے یہ جتنا ڈیرا ڈانڈا ہے
زر دام درم کا بھانڈا ہے بندوق سپر اور کھانڈا ہے
جب نایک تن کا نکل گیا جو ملکوں ملکوں بانڈا ہے
پھر ہانڈا ہے نہ بھانڈا ہے نہ حلوا ہے نہ مانڈا ہے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
جب چلتے چلتے رستے میں یہ گون تری ڈھل جاوے گی

اک بدھیا تیری مٹی پر پھر گھاس نہ چرنے آوے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جاوے گی
دھی پوت جنوائی بیٹا کیا بنجارن پاس نہ آوے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ کھیپ بھرے جو جاتا ہے یہ کھیپ میاں مت گن اپنی
اب کوئی گھڑی پل ساعت میں یہ کھیپ بدن کی ہے کفنی
کیا تھال کٹوری چاندی کی کیا پیتل کی ڈبیا ڈھپنی
کیا برتن سونے روپے کے کیا مٹی کی ہنڈیا چینی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کچھ کام نہ آوے گا تیرے یہ لعل و زمرد سیم و زر
جب پونجی باٹ میں بکھرے گی ہر آن بنے گی جان اوپر
نقارے نوبت بان نشان دولت حشمت فوجیں لشکر
کیا مسند تکیہ ملک مکاں کیا چوکی کرسی تخت چھتر
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا
کیوں جی پر بوجھ اٹھاتا ہے ان گونوں بھاری بھاری کے
جب موت کا ڈیرا آن پڑا پھر دونے ہیں بیوپاری کے

کیا ساز جڑاؤ زر زیور کیا گوٹے تھان کناری کے
کیا گھوڑے زین سنہری کے کیا ہاتھی لال عماری کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

مغرور نہ ہو تلواروں پر مت پھول بھروسے ڈھالوں کے
سب پٹا توڑ کے بھاگیں گے منہ دیکھ اجل کے بھالوں کے
کیا ڈبے موتی ہیروں کے کیا ڈھیر خزانے مالوں کے
کیا بقچے تاش مشجر کے کیا تختے شال دوشالوں کے
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

کیا سخت مکاں بنواتا ہے کھم تیرے تن کا ہے پولا
تو اونچے کوٹ اٹھاتا ہے واں گور گڑھے نے منہ کھولا
کیا رینی خندق رند بڑے کیا برج کنگورا انمولا
گڑھ کوٹ رہکلہ توپ قلعہ کیا شیشہ دارو اور گولا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ہر آن نفع اور ٹوٹے میں کیوں مرتا پھرتا ہے بن بن
ٹک غافل دل میں سوچ ذرا ہے ساتھ لگا تیرے دشمن
کیا لونڈی باندی دائی دوا کیا بندا چیلا نیک چلن
کیا مندر مسجد تال کنویں کیا گھاٹ سرا کیا باغ چمن
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا

جب مرگ پھرا کر چابک کو یہ بیل بدن کا ہانکے گا
کوئی ناج سمیٹے گا تیرا کوئی گون سئے اور ٹانکے گا
ہو ڈھیر اکیلا جنگل میں تو خاک لحد کی پھانکے گا
اس جنگل میں پھر آہ نظیر اک بھنگا آن نہ جھانکے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاوے گا جب لاد چلے گا بنجارا



نوٹ: محمد حسین، آزاد حالات وکوائف یونٹ نمبر 7 میں ملاحظہ فرمائیں۔

محمد حسین آزاد کی داخل نصاب نظمیں

شب قدر

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو / عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے / پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
کلفت سے دن کی ہوگیا منہ تیرا زرد ہے / اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے
ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے / اور تو بھی تھکا ہوا دنیا کے کام سے
دامانِ کوہسار میں اب جا کے سو رہو / دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو
اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں / اور روشنی تھی عام زمیں آسمان میں
جو کچھ کہ تھے سیہ و سفید آشکار تھے / جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے
دولابِ چرخ پر مگر اپنا مدار ہے / چلتا اسی پہ دورِ خزاں و بہار ہے
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لیے / اور رات کو بنایا ہے آرام کے لیے
رخصت ہو تو کہ آتی شب مشک ریز ہے / پھر صبح اٹھ کے چلنا گریزا گریز ہے
آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو / عالم میں شاہزادۂ مشکیں نسب ہے تو
آمد کہ تیری شان تو زیب رقم کروں / پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
ہونا وہ بعدِ شام شفق میں عیاں ترا / اڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں / لہرانا پرنیاں و حریر سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پر / فرماں نشان میں یہ اڑے گا جہان پر
تا صبح ہوئے کارگہ روزگار بند / آرام حکم عام ہو اور کاروبار ہو
اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے / جو گوہر اس میں ملک حبش کا خراج ہے
لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں / ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں
اس رنگ پہ دکھا رہی کیا آب و تاب ہے / تیرا چمکتا چہرا سیاہ آفتاب ہے
عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی / ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم / کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں / اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں

بجلی ہنسے تو رخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کا موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے
اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے

خلقت خدا کی ہوتی ہے غافل پڑی ہوئی
اور رات سائیں سائیں ہی کرتی کھڑی ہوئی

سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر
ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر

ہے بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے
دامانِ دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے

گھوڑے پہ اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی
چوکا ہے بلکہ راہزن تاب کار بھی

القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے
عورت ہے یا کہ مردِ جواں ہے کہ پیر ہے

بچہ کو ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں
سب آ گئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے ملک عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر
بیٹھا تھا جس کا سکہ زمیں آسمان پر

کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے
رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے

اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے
سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جا بجا تھے تو دکھ درد پا رہے
اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے

بارِ گراں غریبوں نے سر پر اٹھائے ہیں
جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں میں سوئے پسار کے

دن بھر کے ہیں مسافر محنت زدہ بہت
آوارہ تا بہ شام ہیں شامت زدہ بہت

آئے ہیں دن کی دھوپ میں منزل جو مار کر
رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اتار کر

اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اس وقت ان بچاروں نے آرام پایا ہے

اس دم امیر زاد سے کئی بے نظیر ہیں
مسند کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں

دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اور ہے
پردے میں شب کے بادۂ گلگوں کا دور ہے

اک گلعذار سامنے سرگرم ناز ہے
اور جام دے رہی نگہ نیم باز ہے

کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں
پر دل کو ان کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں

سامان عیش سب ہیں مہیا کیے ہوئے
جو مانگیے زمانہ ہے حاضر لیے ہوئے

مخمل کا فرش ہے مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت سے ہیں
آرام نے دیے ہوئے ساماں بہت سے ہیں

دن ہووے یا ہو رات انھیں کام کچھ نہیں
اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں

وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹیں گے رات کو

اور ان کے زیرِسایہ پڑا اک غریب ہے
دن بھر اٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے

تھا صبح کا نکلا ہوا گھر سے کام کو
وہ حق حلال کرکے جو آیا ہے شام کو

اب اپنے نانِ خشک کو پانی میں چور کر
کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر

سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں
سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں

یہ بھی نہ کہنا تم کو جو آرام عام ہے
وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے

بندے خدا کے ایسے یہاں بے شمار ہیں
دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں

کچھ ذرا خیال کہ ملائے نکتہ داں
بیٹھا ہے سر جھکائے بپائے چراغ داں

کرتا نظر متن پہ بھی حاشیے پہ بھی
مضموں جو ہم دگر ہیں الجھتے کبھی کبھی

ہر لفظ کو پہناتا ہے معنی نئے نئے
دکھلاتا زورِ طبع ہے معنی نئے نئے

لیکن کبھی مقاصد اصلی سے چھوٹ کے
کرتا ہے آپ رد و قدح جھوٹ موٹ کے

بیٹھا حرام کرکے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں
کل صبح امتحاں ہے سو اس کے خیال میں

مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے
پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے

کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے
کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے پہ محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دکان میں

گنتی میں دام دام کی ہے دم دیے ہوئے
بیٹھا ہے گود میں بہی کھاتہ لیے ہوئے

ہے سارے لین دین کی میزاں تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھ دام کی

اور دیکھنا نجومیٔ دانا کی شان کو
ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو

اک آنکھ دور بین پہ ہے اک کتاب پر
ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر

گنتی ہے اس کی تارے ہی گن کر تمام رات
پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات

پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں
نکلے نئے ستارے سر چرخ پیر ہیں

اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چمکے جو اس میں اپنا ستارہ تو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
زردِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں

بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکان میں ہے
اور ہاتھ ڈالا اس کے ہر اک این وآں میں ہے

اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئے گا
دیکھو، کمایا کس نے ہے اور کون اڑائے گا

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے

ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
اڑتا پھرے ہے کھولے ہوئے پر خیال کے

لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر
جاتا زمیں کی تہہ میں ہے پھر غوطہ مار کر

پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے
ہوجاتے ہیں وہی درِ مضموں نئے نئے

مضمونِ تازہ گر کوئی اس آن مل گیا
یوں خوش ہے ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا

اس تیرہ شب کے پردے میں شاعر جو چور ہے
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے

مطلب اڑاتا شعر سے مضموں غزل سے ہے
لاتا ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بستر راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں

پھیلائے ہاتھ صورتِ امیدوار ہے
اور کرتا صدق دل سے دعا باربار ہے

مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض

یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں

کرجاتا صاف دشمنِ بد بیں پہ چوٹ ہے
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

اے رات یہ جو تونے سر شام آنکر
سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر

اور اس پہ حق پرست جو یادِ خدا میں ہے
بیٹھا وہ فنا پہ ہوائے بقا میں ہے

اس کو اسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی
اور دل میں دمبدم ہے تگ و دو لگی ہوئی

کب تک رہے حباب گلا گھوٹ گھوٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ ٹوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے
اہلِ جہاز جن کا خدا کارساز ہے

بیٹھے اسی کی آس پہ ہیں دل دیے ہوئے
کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لیے ہوئے

باد مراد دیتی ہوائے مراد ہے — یہ دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پر — اور جاتی ہے دعا کی صدا آسمان پر
یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی امید پر — اے ناخدا تو رہیو خدا کی امید پر
دل دے رہا جو شیر محبت کا جام ہے — ہاں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی — بچہ کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے — ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے — کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے
پر جائے حیف حال اسی جاں بلب کا ہے — سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے — لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی — اور بیکسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہے — اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے
کون اس کا ساتھ دیوے گا ہو صبح جب تلک — روئے گا کوئی شام کے مردے کو کب تلک
آزاد آفریں تری لطف زبان کو — پر کروٹ رات نے دی آسمان کو
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دیے ہوئے — تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پیے ہوئے
کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے — وقتِ سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

مثنوی موسوم بہ صبح امید

جب کیا صبح نے روشن فلک مینائی — بستر خواب سے میں لے کے اٹھا انگڑائی
آنکھ مَل کر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں — ذرّہ ذرّہ میں نظر آیا رخ جانِ جہاں
کام کرتی تھی جہاں تک نگہہ دور انداز — تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرت راز
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ — جس پہ ہے فرش زمیں گلشن گردوں کی شکوہ
برگ برگ اُس کا ہے آئینہ لیے پیش نظر — جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر
آرزوؤں سے کھلے ہیں گل رعنا یکسر — جن سے نکلیں گے ثمر ہائے تمنا یکسر
قلّۂ کوہ کہ تھا چرخ بریں سے ہمراز — رکھتا تھا طول امل سے بھی سوا راہ دراز
تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اس کی — اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اس کی
اس پہ چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے — دم اکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے

گرچہ تھا پاؤں اٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

کہ چڑھائی جو نظر آرہی تھی دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

جشن شاہانہ کا سامان نظر آتا تھا وہاں
سازِ عشرت کوئی درپردہ بجاتا تھا وہاں

دل اس آواز پہ اس طرح کھچے جاتے تھے
گویا ذرّے سوئے خورشید اڑے جاتے تھے

اس طرف میرا دل زار بھی یوں آہ چلا
جیسے بلبل سوئے گل کبک سوئے ماہ چلا

کاہ کی طرح سوئے کاہ ربا پہنچا میں
الغرض منزل مقصود پہ جا پہنچا میں

دیکھا ایک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گل خود رو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں

گل سبز سے ہے سبزۂ ترپا انداز
رنگ گل اس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

ہر کوہ چوپانی کا ہے چشمہ جاری
نہر بن بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر ہے بدامان جبل مار رہا
سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا

سنگ مرمر کی لب آب جو ایک سِل ہے پڑی
اُس پہ اک رشک پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

رنگ رخ کو گل گلزار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی ایک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے

اس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال
پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال

نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے
فرش گلہا سے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے

سر پہ جو اس کے دھری ہے کلہ تاجوری
ہے بجائے دُر الماس وہ پھولوں سے بھری

اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ
کہ ہر ایک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ

اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے
ہر دماغ اس سے نئے ڈھب کا مزہ لیتا ہے

رخ جو ہے آئینۂ روئے تمنا اس کا
شمعساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اُس کا

ایک طرف عقل ہے ایک سمت کو تدبیر کھڑی
آگے جام مئے غفلت لیے تاثیر کھڑی

دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا
کامیابی کی دکھا دیتی ہے تصویر جدا

رکھتی ہے ایسا اثر نرگس جادو اُس کی
پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر ایک سو اُس کی

ہے ہر ایک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے
تڑپ اٹھتا ہے ہر ایک دل کہ پکارا ہے مجھے

اس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے
اپنے دامان تمنا کو ہیں پھیلائے ہوئے

ہجوم ہے جو نسیم سحر آتی جاتی
بوئے امید ہے ایک ایک کو سنگھاتی جاتی

اس نے دربار یہ جس وقت دکھایا مجھ کو
اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھ کو

دیر تک دل رہا تصویر تہہ آئینہ
پر جو تہہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ

دیر تک دل رہا تصویر تہہ آئینہ

غور کی راز نہفتہ میں بہت سی میں نے ― شجرِ چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے
دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال ― دونوں پر کھولے ہوئے ہے بہ ہوائے اقبال
دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوشحالی ― آؤ آزاد تمھاری ہی جگہ تھی خالی
آؤ تم قید تعلق سے ہو آزاد بہت ― اپنی وارستگی دل میں ہو تم شاد بہت
آؤ یہاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو ― لاؤ کیا آرزوئے دل ہے کہ دیویں تم کو
آؤ اِس سایہ میں تم ابر گہربار ہے یہ ― یعنی شہزادیٔ امید کا دربار ہے یہ
اُس کے نغمے سے جو یہ راز پر افسوں نکلا ― دل سے بے ساختہ یہ مطلع موزوں نکلا
آ کہ آباد ترے دم سے ہے دائم دنیا ― اور مثل ہے کہ بامید ہے قائم دنیا
آ کہ ہے تیرے ہوا میں دل شیدا گلشن ― لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلشن
دل کے گلشن پہ ہے چھایاہوا نیرنگ ترا ― کون سا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا
کون سا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا ― کون انسان ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا
کونسا باغ ہے جس میں کہ صبا تیری نہیں ― کون سا گل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں
کون سا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری ― کون سا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ تری
تار برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے ― دیکھا جس ملک میں وہاں سکہ ترا چلتا ہے

عہدِ آئندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل ― غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل
اس میں چلتے تری تدبیر کے ہیں تیر سدا ― اسی میداں میں ہیں پھرتے ترے نخچیر سدا
ذرّہ ذرّہ سے ترے اگتے ہیں اشجار مراد ― خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزار مراد
جب سے کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی ― اور ہوا باغ میں ہے خاک اڑاتی پھرتی
چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے ― چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے دولاب پڑے
پیرِ دہقان ہے کہیں بے سروساماں بیٹھا ― باغبان خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا
ہوتا اس وقت مصیبت میں نہیں یار کوئی ― نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی
ہاں مگر تو کہ جب اس وقت میں آجاتی ہے ― جلوہ گر باغِ مراد اس کو دکھا جاتی ہے
ابرِ تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی ― پھلے پھولے اسے اشجار دکھاتی ہے کبھی
کبھی کھیتوں کو ہرا کرکے دکھا دیتی ہے ― کرکے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے
دمبدم تازہ فسوں آکے سناتی ہے اسے ― باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اُسے

تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھ کے وہ　　اٹھ کھڑا ہوتا ہے یکبار کمر باندھ کے وہ
دھوپ میں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینہ اپنا　　کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا
ہر مصیبت میں غرض تو ہے سہارا اُس کا　　تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گزارا اس کا

اہلِ ہمت جو ہیں مردانِ تجارت پیشہ　　مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ
کوہ و صحرا میں ہیں وہ زادِ سفر باندھے ہوئے　　اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے
نہ تو پانی کا ہے آرام نہ کھانے کا مزا　　اٹھ گیا ان کے نصیبوں سے زمانے کا مزا
ہر قدم پر بسرِ راہ خطر ہیں لاکھوں　　ایک جوکھوں ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں
خلشِ خار سے ہے دامن دل چاک کبھی　　صدمۂ یاد وطن کرتا ہے غمناک کبھی
دل تو ہے سنگ مصیبت سے شکستہ اُن کا　　اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ اُن کا
ہر قدم تو ہے مگر اُن کی کمر باندھ رہی　　سمتِ مقصود پہ ہے تار نظر باندھ رہی
حسن انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں　　کرسیاں جاہ و مراتب کی سجاتی ہے کہیں
سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے انھیں　　اور خزانے کہیں پر مال دکھاتی ہے انھیں
کامیابی سے کبھی پھر ہے وطن میں لاتی　　آبِ رفتہ کو ہے پھر جوئے چمن میں لاتی
طائرِ دل پر پرواز ہیں پھیلائے ہوئے　　اور ترا شوق لیے جاتا ہے دوڑائے ہو

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازار ستیز　　تیغ خونبار کہیںا ورکہیں خنجر خونریز
ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا　　عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا
نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں منہ مڑ جاتے　　بلکہ ہیں گنبد نیلی کے دھوئیں اڑ جاتے
کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے　　سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے
پر وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تو آتی　　ہاتھ میں ہے لیے ایک شیشہ جادو آتی
ایسا مست مئے جرأت انھیں کر دیتی ہے　　بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے
کہ نشا آنکھوں پہ عینک ہے لگاتا گویا　　سیرِ فانوس خیالی ہے دکھاتا گویا
دیتی ہے چشم تصور میں ہر ایک کام دکھا　　ہے پھر اس کام کا دیتی انھیں انجام دکھا
کہ رخ فتح کبھی دیکھتے ہیں گلناری　　زیب سر دیکھتے ہیں تاج سپہ سالاری
فتح یابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی　　پیش لشکر ہے بہ سرداری لشکر لاتی

شہرتِ عام کے دربار میں لاتی ہے انھیں
فخر و اعزاز کی کرسی پہ بٹھاتی ہے انھیں
نام پر فتح کے نقارے بجا دیتی ہے
شرق سے غرب تک ایک دھوم مچا دیتی ہے
پرچم فتح کبھی لا کے ہے لہرا دیتی
فتح یابوں کے ہے سر پر اسے جلوہ دیتی
نام ایک ایک کے نشانوں پہ رقم دیکھتے ہیں
ان کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں
سینکڑوں دورِ فلک سر پہ گزر جائیں گے
وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئیں گے

دیکھتی چشم تصور ہے یہ جب باغ مراد
اور چمک اٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغ مراد
سر بکف برسرِ میداں ہیں دلاور آتے
اہل جوہر ہیں دکھاتے ہوئے جوہر آتے
جامِ دل خون شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
نعرۂ اہلِ دغا تا بہ فلک جاتے ہیں
آتے جانباز جو ہیں سر بہ کفن باندھے ہوئے
اورہوائیں بسر چرخ کہن باندھے ہوئے
آب شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں
اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں
خون دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہہ جاتے
اور جگر سینوں میں خون ہو کے ہیں رہ جاتے
گرم ہوجاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں
کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں
جان و تن موت کے منہ کا ہیں نوالا ہوتے
آسماں اور زمیں ہیں تہہ و بالا ہوتے
فتح یابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے
اور بہت تن بسر خاک ہیں پرخوں ہوتے
اے امیدا یسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے
یونہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے

ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم
اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالب علم
سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے
حسرتوں سے کیے لبریز ہیں سینے اپنے
نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال
ذوق راحت ہے نہ ہے لطف جوانی کا خیال
ہوگئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح
بلکہ پیوند ورق ہیں جز اصلی کی طرح
پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لیے سودائی سے
ہاتھ اٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے
تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں
دن ہو یا رات انھیں محنت کے سوا کام نہیں
روز و شب خون جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ
اور بلا بارِ مشقت کے اٹھاتے ہیں وہ
ان مصائب کی ہے تو ہی انھیں طاقت دیتی
لطف انجام سے ہے حسن لیاقت دیتی
دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سرمے کیا کیا
دیتی ہے شاہد مقصود کو جلوے کیا کیا

اہل تصنیف کو ہے عمر دوامی دیتی — بادۂ شوق سے ہے عیش مدامی دیتی
سطح کاغذ پہ تو ایک باغ کھلا دیتی ہے — برگ و بار اس میں مرادوں کے لگا دیتی ہے
عوض آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات — اور دکھا دیتی ہے اس طرح سے شاداب حیات
شہرہ گلزار زمانہ میں رہے عام اِن کا — پتے پتے پہ سدا نقش رہے نام ان کا

کبھی طیار لیاقت کے ہے تمغے کرتی — کہیں ایم۔اے ہے بناتی کہیں بی اے کرتی
برسر کرسی دربار بٹھاتی ہے انھیں — خلعت بوقلموں لا کے پنہاتی ہے انھیں
بزم کو جلوۂ رنگین ہے دکھاتی اُن کے — اس طرح فخر سے دامن ہے اڑاتی ان کے
ہوتے شاداب ہیں دلہائے فسردہ ان سے — تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دل مردہ ان سے
کلفتِ محنت و آفت سے ہیں سب جی جاتے — زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

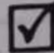
ایک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا — دشت پرخار میں ہے بے سروساماں جاتا
نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لیے — اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لیے
اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اسے — رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے
طپش راہ سے جلتا ہے جگر سینہ میں — بجھ کے رہ جاتا ہے دل مثل شرر سینہ میں
دفعۃً آب رواں دور نظر آتا ہے — اور وہ اس لطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے
کہ دل سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا — اور خوشی سے تن بے دم میں ہے دم آجاتا
دل جو تھا لوٹ رہا سینہ میں بے آبی سے — جاتا ہے بے سروپا دوڑتا بے تابی سے
جامِ ہمت جو اسے تونے ہیں پلوائے ہوئے — کوسوں ایک دم میں لیے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے
زور ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی — اتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

یاس اُس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے — دل مایوس کو جب اس کے یقین آجائے
کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ — سر دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ
یہ سمجھتے ہی اندھیرا ہو جہاں آنکھوں میں — ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں
دل میں ہمت نہ رہی جسم میں حالت نہ رہی — صورت نقش قدم ہلنے کی طاقت نہ رہی
جان پانی میں ہوا نکی ہوئی دم سینہ میں — وہ بھی پرضعف سے آکر رہے تھم سینہ میں

اُس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تو
سربالیں وہ مسافر کوئی لاتی ہے تو
حضرتِ خضر کی ہے شان دکھاتا آتا
ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا
اس کے آجانے سے ہوتی ہے نجات اس کے لیے
ہوتا ہے قطرۂ آب آبِ حیات اس کے لیے

کرتے زاہد جو خدا کی ہیں عبادت دن رات
ترک دنیا سے ہیں سرگرم ریاضت دن رات
ذکر فردوس ہیں تونے انھیں سنوائے ہوئے
لطف ہر دم ہیں وہی پیش نظر آئے ہوئے
رند آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ
بارِ عصیاں سے ہے بیچارہ گرانبار گناہ
نہیں جز رحمت حق کوئی سہارا اس کا
تیری ہی چشم کرم پر ہے گزارا اس کا
تو نہووے تو تڑپ کر دل مضطر رہ جائے
وہ گنہگار تو غم سے ابھی مر کر رہ جائے

رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سروکار سدا
کارِ اربابِ جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا
ہے شب تار تو سونے سے انھیں کام نہیں
دن کو جز فکر مضامین کبھی آرام نہیں
لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے
اور یہ بیٹھے در مضموں ہیں پرویا کرتے
یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اٹھائے بیٹھے
یا کہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے
باغ سبز اپنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے انھیں
مژدۂ خلعت و انعام سناتی ہے انھیں
انھیں مطلب نہیں پر اور کسی بات سے ہے
ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے
کہ جو آہ ان کے دل سوختہ جاں سے نکلے
یا کوئی نالہ موزوں کہ زباں سے نکلے
اثرِ درد سے ناخن بہ جگر ہووے سدا
اور جگر درد سے لبریزِ اثر ہووے سدا
ہووے اس پر بھی جو آشوبِ جہاں حد سے زیاد
قول آزاد سے کرتی ہے انھیں یوں ارشاد
کہ سخن فہم تہہ چرخ بریں ہوئیں گے
خوردہ بیں ہیں تو سخنداں بھی یہیں ہوئیں گے
داد مل جائے گی جب اور کوئی دیکھے گا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھے گا



نوٹ: حالی کے حالات وکوائف یونٹ نمبر 7 میں ملاحظہ فرمائیں۔

حالی کی داخل نصاب نظمیں

نشاطِ امید

مرتبہ: 1874ء

اے مری امید میری جاں نواز — اے مری دل سوز میری کارساز
میری سپر اور مرے دل کی پناہ — درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ
عیش میں اور رنج میں میری شفیق — کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
کاٹنے والی غم ایام کی — تھامنے والی دل ناکام کی
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ — تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
تو نے نہ چھوڑا کبھی غربت میں ساتھ — تو نے اٹھایا نہ کبھی سر سے ہاتھ
جی کو ہو کبھی اگر عسرت کا رنج — کھول دیے تو نے قناعت کے گنج
تجھ سے ہے محتاج کا دل بے ہراس — تجھ سے ہے بیمار کو جینے کی آس
خاطر رنجور کا درماں ہے تو — عاشق مہجور کا ایماں ہے تو
نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو — چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو
رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو — پانڈو کے بھی ساتھ پھری بن میں تو
تو نے سدا قیس کا بہلایا دل — تھام لیا جب کبھی گھبرایا دل
ہو گیا فرہاد کا قصہ تمام — پر ترے فقروں پہ رہا خوش مدام
تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس — ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس
ہوتی ہے تو پشت پہ ہمت کی جب — مشکلیں آساں نظر آتی ہیں سب
ہاتھ میں جب آ کے لیا تو نے ہات — سات سمندر سے گزرنا ہے بات
ساتھ ملا جس کو ترا دو قدم — کہتا ہے وہ یہ ہے عرب اور عجم
گھوڑے کی لی اپنے جہاں تو نے باگ — سامنے ہے تیرے گیا اور پراگ
عزم کو جب دیتی ہے تو میل جست — گنبد گردوں نظر آتا ہے پست
تو نے دیا آ کے ابھارا جہاں — سمجھے کہ مٹھی میں ہے سارا جہاں
ذرے کو خورشید میں دے کھپا — بندے کو اللہ سے دے تو ملا

Scanned by CamScanner

دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ
دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ

نیکیوں کی تجھ سے ہے قائم اساس
تو نہ ہو تو جائیں نہ نیکی کے پاس

دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو
تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو

خشک تھا بن تیرے درخت عمل
تو نے لگائے ہیں یہ سب پھول پھل

دل کو لبھاتی ہے کبھی بن کے حور
گاہ دکھاتی ہے شراب طہور

نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا
روز نرالا ہے تماشا ترا

کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل
جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال و قیل

روپ ہیں ہر پنتھ میں تیرے الگ
ہے کہیں فردوس کہیں ہے سورگ

چھوٹ گئے سارے قریب اور بعید
ایک نہ چھوٹی تو نہ چھوٹی امید

تیرے ہی دم سے کٹے جو دن تھے سخت
تیرے ہی صدقہ سے ملا تاج و تخت

خاکیوں کی تجھ سے ہے ہمت بلند
تو نہ ہو تو کام ہوں دنیا کے بند

تجھ سے ہی آباد ہے کون و مکاں
تو نہ ہو تو ہو بھی برہم جہاں

کوئی پڑتا پھرتا ہے بہر معاش
ہے کوئی اکسیر کو کرتا تلاش

اک تمنا میں ہے اولاد کی
ایک کو دل دار کی ہے لو لگی

ایک کو ہے دھن جو کچھ ہاتھ آئے
دھوم سے اولاد کی شادی رچائے

ایک کو کچھ آج اگر مل گیا
کل کی ہے یہ فکر کہ کھائیں گے کیا

قوم کی بہبود کا بھوکا ہے ایک
جن میں ہو ان کے لیے انجام نیک

ایک کو ہے تشنگیِ قرب حق
جس نے کیا دل سے جگر تک ہے شق

جو ہے غرض اس کی نئی جستجو
لاکھ اگر دل ہیں تو لاکھ آرزو

تجھ سے ہیں دل سب کے مگر باغ باغ
گل کوئی ہونے نہیں پاتا چراغ

سب یہ سمجھتے ہیں کہ پائی مراد
کہتی ہے جب تو کہ اب آئی مراد

وعدہ ترا راست ہو یا ہو دروغ
تو نے دیے ہیں اسے کیا کیا فروغ

وعدے وفا کرتی ہے گو چند تو
رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو

بھاتی ہے سب کو تری لیت و لعل
تو نے کہاں سیکھی ہے یہ آج کل

تلخ کو تو چاہے تو شیریں کرے
بزم عزا کو طرب آگیں کرے

آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس — رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس
پاس کا پاتی ہے جو کچھ تو لگاؤ — سیکڑوں کرتی ہے اتار اور چڑھاؤ
آنے نہیں دیتی دلوں پر ہراس — ٹوٹنے دیتی نہیں طالب کی آس
جن کو میسر نہ ہو کملی پھٹی — خوش ہیں توقع پہ وہ زر بفت کی
چٹنی سے روٹی کا ہے جن کی بناؤ — بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ
پاؤں میں جوتی نہیں پر ہے یہ ذوق — گھوڑا جو سبزہ ہو تو نیلا ہو طوق
فیض کے کھولے ہیں جہاں تو نے باب — دیکھتے ہیں جھونپڑے محلوں کے خواب
تیرے کرشمے ہیں غضب دل فریب — دل میں نہیں چھوڑتے صبر و شکیب
تجھ سے مہوس نے جو شوریٰ لیا — پھونک دیا کان میں کیا جانے کیا
دل سے بھلایا زن و فرزند کو — لگ گیا گھن نخل برومند کو
کھانے سے پینے سے ہوا سرد جی — ایسی کچھ اکسیر کی ہے لو لگی
دین کی ہے فکر نہ دنیا سے کام — دھن ہے یہی رات دن اور صبح شام
دھونکنی ہے بیٹھ کے جب دھونکتا — شہ کو سمجھتا ہے اک ادنیٰ گدا
پیسے کو جب تاؤ پہ دیتا ہے تاؤ — پوچھتا یاروں سے ہے سونے کا بھاؤ
کہتا ہے جب ہنستے ہیں سب دیکھ کر — رہ گئی اک آنچ کی باقی کسر
ہے اسی دھند میں وہ آسودہ حال — تو نے دیا عقل پہ پردہ سا ڈال
تول کر گر دیکھیے اس کی خوشی — کوئی خوشی اس کو نہ پہنچے کبھی
پھرتے ہیں محتاج کئی تیرہ بخت — جن کے بڑوں میں تھا کبھی تاج و تخت
آج جو برتن ہیں تو کل گھر گرو — ملتی ہے مشکل سے انہیں نان جو
تیرے سوا خاک نہیں ان کے پاس — ساری خدائی میں ہے لے دے کے آس
پھولے سماتے نہیں اس آس پر — صاحب عالم انہیں کہیے اگر
کھاتے ہیں اس آس پہ قسمیں عجیب — جھوٹے کو ہو تخت نہ یارب نصیب

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم جھوم
لگتی ہے ہمت کی کمر ٹوٹنے — حوصلہ کا لگتا ہے جی چھوٹنے
ہوتی ہے بے صبری و طاقت میں جنگ — عرصۂ عالم نظر آتا ہے تنگ

جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے   پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
بیٹھنے لگتا ہے دل آوے کی طرح   یاس ڈراتی ہے چھلاوے کی طرح
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا   اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا
ٹھنتی ہے گردوں سے لڑائی کبھی   ہوتی ہے قسمت کی ہنسائی کبھی
جاتا ہے قابو سے آخر دل نکل   کرتا ہے ان مشکلوں کو تو ہی حل
کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں   رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی   ہو گئی کافور سب افسردگی

تجھ میں چھپا راحت جاں کا ہے بھید
چھوڑیو حالی کا نہ ساتھ اے امید

برکھا رت

گرمی کی تپش بجھانے والی   سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان   عارف کے لیے کتاب عرفاں
وہ شاخ و درخت کی جوانی   وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات   وہ کون خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد   وہ سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جاں   سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہماں
گرمی سے تڑپ رہے تھے جان دار   اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگ صحرا   اور کھول رہا تھا آب دریا
سانڈے تھے بلوں میں منہ چھپائے   اور ہانپ رہے تھے چارپائے
تھیں لومڑیاں زباں نکالے   اور لو سے ہرن ہوئے تھے کالے
چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ   ہرنوں کو نہ تھی قطار کی سدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں ست   گھڑیال تھے رود بار میں ست
ڈھوروں کا ہوا تھا حال پتلا   بیلوں نے دیا تھا ڈال کندھا
بھینسوں کے لہو نہ تھا بدن میں   اور دودھ نہ تھا گئو کے تھن میں
گھوڑوں کا چھٹا تھا گھاس دانہ   تھا پیاس کا ان پہ تازیانہ

گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا — اور انس نکل رہا تھا سب کا
طوفان تھے آندھیوں کے برپا — اٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے — شعلے تھے زمین سے نکلتے
تھی آگ کا دے رہی ہوا کام — تھا آگ کا نام مفت بد نام
رستوں میں سوار اور پیدل — سب دھوپ کے ہاتھ سے تھے بے کل
گھوڑوں کے نہ آگے اٹھتے تھے پاؤں — ملتی تھی کہیں جو روکھ کی چھاؤں
تھی سب کی نگاہ سوے افلاک — پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی — وہ بادِ سموم سے سوا تھی
بجھتی نہ تھی آتشِ درونی — لگتی تھی ہوا سے آگ دونی
سات آٹھ بجے سے دن چھپے تک — جانداروں پہ دھوپ کی تھی دستک
ٹٹی میں تھا دن گنواتا کوئی — تہہ خانے میں منہ چھپاتا کوئی
بازار پڑے تھے سارے سنسان — آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان
چلتی تھی دکان جن کی دن رات — بیٹھے تھے وہ ہات پر دھرے ہات
خلقت کا ہجوم کچھ اگر تھا — یا پیاؤ پہ یا سبیل پر تھا
تھا شہر میں قحط آدمی زاد — سلطان کا ایک کنواں تھا آباد
پانی سے تھی سب کی زندگانی — میلہ تھا وہیں جہاں تھا پانی
تھیں برف پہ نیتیں لپکتی — فالودے پہ رال ٹپکتی
پھل پھول کی دیکھ کر طراوت — پاتے تھے دل و جگر طراوت
کنجڑوں کی وہ بولیاں سہانی — بھر آتا تھا سن کے منہ میں پانی
تھے جو خفقانی اور مراقی — گرمی سے نہ تھا کچھ ان میں باقی
کھانے کا نہ تھا انھیں مزا کچھ — آٹھ آٹھ پہر نہ تھی غذا کچھ
بن کھائے کئی کئی دن — اکثر رہتے تھے فقط ٹھنڈائیوں پر
شب کٹتی تھی ایڑیاں رگڑتے — مر پیٹ کے صبح تھے پکڑتے
اور صبح سے شام تک برابر — تھا العطش العطش زباں پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال — کملائے ہوئے تھے پھول سے گال
آنکھوں میں تھا ان کا پیاس سے دم — تھے پانی کو دیکھ کرتے ''مم مم''
ہر بار پکارتے تھے ماں کو — ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

پانی دیا گر کسی نے لاکر
پھر چھوڑتے تھے نہ منہ لگا کر
بچے ہی نہ پیاس سے تھے مضطر
تھا حال بڑوں کا ان سے بدتر
تخصیص تھی کچھ نہ میری تیری
پانی سے نہ تھی کسی کو سیری

کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
پُروا کی دہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھرر ہی ہے
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
اک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مینھ کا ہے زمین پر دڑیڑا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آرہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
قدرت ہے نظر خدا کی آتی
سورج نے نقاب لی ہے منہ پر
اور دھوپ نے تہہ کیا ہے بستر
باغوں نے کیا ہے غسلِ صحت
کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار
انکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر کی ایک وردی
عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار
دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل
ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو
اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی
گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
مینڈک جو ہیں بولنے پہ آتے
سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
سب خوانِ کرم سے حق کے ہیں سیر
پانی میں مگر، کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست
قلانچ ہیں اپنی کھال میں مست

ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر
کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر

مسجد میں ہے درد اہل تقویٰ
یا ربّ لنا ولا علینا

مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا
کرپا ہوئی تیری میگھ راجا

کرتے ہیں گرو گرو گرنتھی
گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی

جاتا ہے کوئی ملار گاتا
ہے دیس میں کوئی گنگناتا

بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے
اور بانسریاں بجاتے پھرتے

سردن کوئی گا رہا ہے بیٹھا
چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا

رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے
ڈھکنے ہیں دیوں پر ڈھکتے پھرتے

کرتے ہیں وہ یوں جیوں کی رکھیا
تا جل نہ بجھے کوئی پتنگا

ہیں شکر گزار تیرے برسات
انسان سے لے کے تا جمادات

دنیا میں بہت تھی چاہ تیری
سب دیکھ رہے تھے راہ تیری

تجھ سے کھلا یہ رازِ قدرت
راحت ملتی ہے بعدِ کلفت

شکریۂ فیضِ عام تیرا
پیشانیٔ دہر پر ہے لکھا

گلشن کو دیا جمال تو نے
کھیتی کو کیا نہال تو نے

طاؤس ناچنا بتایا
کوئل کو الاپنا سکھایا

جب مور ہے ناچنے پہ آتا
آپے سے ہے اپنے گزرا جاتا

کوئل کو نہیں قرار اک پل
ایسی کوئی تو نے کوک دی کل

شب بھر میں ہوا سماں دگر گوں
کیا پڑھ دیا آ کے تو نے افسوں

سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا
اٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا

لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن
کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن

امرت سا ہوا بھر دیا کچھ
اک رات میں کچھ سے کر دیا کچھ

دریا تجھ بن سسک رہے تھے
اور بَن تری راہ تک رہے تھے

دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان
اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

جن جھیلوں میں کل تھی خاک اڑتی
ملتی نہیں آج تھاہ ان کی

جو دانے تھے خاک میں پریشان
سب آگے چڑھائے تو نے پروان

دولت جو زمین میں تھی مخفی
آگے ترے اس نے سب اگل دی

پڑتے تھے ڈلاؤ جس زمیں پر — وہاں سبزۂ گل ہیں جلوہ گستر
جن پودوں کو کل تھے ڈھور چرتے — باتیں ہیں وہ آسماں سے کرتے
جن باغوں میں اڑتے تھے بگولے — وہاں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار — ہے بیر بہٹیوں سے گلنار

کھم باغوں میں جابجا گڑے ہیں — جھولے ہیں کہ سو بسو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن — جن کے ہیں یہ کھیل کود کے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری — اورجھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں سارے مل کے گاتی — جنگل کو ہیں سر پہ وہ اٹھاتی
اک سب کو کھری جھلا رہی ہے — اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملار گاتی — اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا — کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جاکر — سب ہنستی ہیں قہقہے لگا کر
ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں — تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی — اور تیر کے پہنچا پار کوئی
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی — مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے — دن بھر میں ہیں بیڑے جا کے لگتے
زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی — موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں — موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملاحوں کے اڑ رہے ہیں اوسان — بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
منجدھار کی رو بھی زور پر ہے — مچھلی کو بھی جان کا خطر ہے
بیزار اک اپنی جان و تن سے — بچھڑا ہوا صحبتِ وطن سے
غربت کی صعوبتوں کا مارا — چلنے کا نہیں ہے جس کو یارا
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو — اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی
ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا — اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا

برق آکے لگی تڑپنے پیہم　　اور پڑنے لگی پھوار کم کم
آنے جو لگے ہوا کے جھوکے　　تھے جتنے سفر کے رنج بھولے
سامان ملے جو دل لگی کے　　یاد آئے مزے کبھی کبھی کے
دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم　　وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا　　اور جوش میں کبھی یہ گانا
''اے چشمۂ آبِ زندگانی　　گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری　　بستی ہے اسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو　　دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اول کہیو سلام میرا　　پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنا لکھا　　فرقت میں تمھاری آئی برکھا
آتا ہے تمھارا دھیان جس دم　　مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یوں ہی صبح و شام اکثر　　تالاب میں تیرتے تھے جاکر
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے　　صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یوں ہی ہات میں دیے ہات　　پھرتے تھے ہوا میں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا　　میں تم کو ادھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو　　دیتا ہوں دعائیں بیکسی کو
رُت آم کی آئے اور نہ ہوں یار　　جی اپنا ہے ایسی رت سے بیزار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی　　چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی　　پر دل میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد　　جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی　　فریاد یہ دردناک اس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز　　پکڑا دل سن کے اس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر　　روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر

پھر غور سے اک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

مناجات بیوہ

اے سب سے اول اور آخر
جہاں تہاں، حاضر اور ناظر

اے سب داناؤں سے دانا
سارے تواناؤں سے توانا

اے سمجھے بوجھے بن سوجھے
جانے پہچانے بن بوجھے

ہوا سے اونچے اور پربت سے
چاند سے اور اس نیلی چھت سے

سب سے انوکھے سب سے نرالے
آنکھ سے اوجھل دل کے اجالے

ناؤ جہاں کی کھینے والے
دکھ میں تسلی دینے والے

جوت ہے تیری جل اور تھل میں
باس ہے تیری پھول اور پھل میں

ہر دل میں ہے تیرا بسیرا
تو پاس اور گھر دور ہے تیرا

سوچ میں دل بہلانے والے
بپتا میں یاد آنے والے

اے رحمت اور ہیبت والے
شفقت اور دباغت والے

اے انکل اور دھیان سے باہر
جان سے اور پہچان سے باہر

عقل سے کوئی پا نہیں سکتا
بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا

ایک کو تو نے شاد کیا ہے
ایک کے دل کو داغ دیا ہے

اس سے نہ تیرا پیار کچھ ایسا
اس سے نہ توبیزار کچھ ایسا

مینہ کہیں دولت کا ہے برستا
ہے کوئی پانی تک کو ترستا

رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا
تحفہ یہی لے دے کے ہے یاں کا

پر نہیں اٹھ سکتی وہ مصیبت
آئے گی جس کے بعد نہ راحت

شاد ہو اس رہ گیر کا کیا دل
مر کے کٹے گی جس کی منزل

ان بچھڑوں کا کیا ہے ٹھکانا
جن کو نہ ملنے دے گا زمانہ

اب یہ بلا ٹلتی نہیں ٹالی
مجھ پہ ہے جو تقدیر نے ڈالی

آئیں بہت دنیا میں بہاریں
عیش کی گھر گھر پڑی پکاریں

پڑے بہت باغوں میں جھولے
ڈھاک بہت جنگل میں پھولے

گئیں اور آئیں چاندنی راتیں
برسیں کھلیں بہت برساتیں

پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی
وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

آس ہی کایاں نام ہے دنیا — جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا
ایسے بدیسی کا نہیں غم کچھ — جس کو نہ ہو ملنے کی قسم کچھ
رونا ان بن باسیوں کا ہے — دیس نکالا جن کو ہوا ہے
حکم سے تیرے پر نہیں چارا — کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
قسمت ہی میں جب تھی جدائی — پھر ٹلتی یہ کس طرح آئی

اے مرے زور اور قدرت والے — حکمت اور حکومت والے
میں لونڈی تیری دکھیارے — دروازے کی تیری بھکاری
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
سہہ کے بہت آزار چلی ہوں — دنیا سے بیزار چلی ہوں
تجھ پہ ہے روشن سب دکھ دل کا — تجھ سے حقیقت اپنی کہوں کیا
بیاہ کے دم پائی تھی نہ لینے — لینے کے یاں پڑ گئے دینے
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے — ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
چین سے رہنے دیا نہ جی کو — کر دیا ملیامیٹ خوشی کو
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک — اور روؤں تو روؤں کہاں تک
ہنسی سے دل بہلاؤں کیوں کر — اوسوں پیاس بجھاؤں کیوں کر
لیٹوں گر سونے کے بہانے — پائنتی کل ہے اور نہ سرہانے
اب کل ہم کو پڑے گی مر کر — گور ہے سونی سیج سے بہتر
کوئی نہیں دل کا بہلاوا — آ نہیں چکتا میرا بلاوا
آٹھ پہر کا ہے یہ جلاپا — کاٹوں گی کس طرح رنڈاپا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں — وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں — وہ ارمان بھری برساتیں
رت گئی ساری سر ٹکراتے — اڑ نہ سکے پر ہوتے سارے
اے دین اور دنیا کے مالک — راجا اور پرجا کے مالک
بے پر اور پردار کے والی — اے سارے سنسار کے والی
چیونٹا، کیڑا، مچھر، بھنگا — کچھوا، مینڈک، سیپ اور گھونگا
سارے پنچھی اور پکھیرو — مور، پپیہا، سارس، پیرو

بھیڑ اور بکری، شیرا ور چیتے — تیرے جلائے ہیں سب جیتے
خاک سے تونے بیج اگائے — پھر پودے پروان چڑھائے
سیپ کو بخشی تونے دولت — اور بخشا مکھی کو امرت
ہیرا بخشا کان کو تونے — مشک دیا حیوان کو تونے
جگنو کو بجلی کی چمک دی — ذرّے کو کندن کی دمک دی
عام ہے سب پر تیری رحمت — ہیں محروم مگر بدقسمت
پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں — آئی تھی کیوں میں اس نگری میں
باپ اور بھائی، چچا بھتیجے — سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے
پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا — جس کو ہو میری جان کی پروا

تیرے سوا اے رحم کے بانی — کون سنے یہ رام کہانی
ایک کہانی ہو تو کہوں میں — ایک مصیبت ہو تو سہوں میں
گر سسرال میں جاتی ہوں میں — نحس قدم کہلاتی ہوں میں
میکے میں جس وقت ہوں آتی — رو رو کر ہوں سب کو رلاتی
سوچ میں میرے سارا گھر ہے — میرے چلن پر سب کی نظر ہے
آپ کو ہوں ہر وقت مٹاتی — پہنتی اچھا میں ہوں نہ کھاتی
مہندی میں نے لگانی چھوڑی — پٹی میں نے جمانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی — عطر نہیں میں بھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی — بال نہیں برسوں گوندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی — اٹھواڑوں کنگھی نہیں ہوتی
آپ کو یہاں تک میں نے مٹایا — پر دنیا کو صبر نہ آیا

اے ایمان کے رکھنے والے — اے نیت کے پرکھنے والے
میں نہیں رکھتی کام کسی سے — چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پہ چلتی تیرے اگر میں — چین سے کرتی عمر بسر میں
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی — مرضی غم خواروں کی یہی تھی



اسماعیل میرٹھی

- اسماعیل میرٹھی کا پورا نام شیخ محمد اسماعیل تھا۔
- اسماعیل میرٹھی 12 رنومبر 1844 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔
- اسماعیل میرٹھی کا انتقال یکم نومبر 1917 کو ہوا تھا۔
- اسماعیل میرٹھی کے والد کا نام پیر بخش تھا۔
- اسماعیل میرٹھی نے عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد روڑ کی انجینئر نگ کالج سے ڈپلومہ کیا تھا۔
- اسماعیل میرٹھی نے سولہ سال کی عمر میں جولائی 1860ء میں محکمۂ تعلیم کے دفتر میں ملازمت اختیار کی تھی۔
- اسماعیل میرٹھی نے اپنی کریئر کا آغاز کلرک کی ملازمت سے کیا تھا۔
- اسماعیل میرٹھی نے آگرہ کے سنٹرل نارمل اسکول میں بھی ایک استاد کی حیثیت سے کام کیا تھا۔
- اسماعیل میرٹھی نے شاعری 1860ء میں شروع کی تھی جب وہ سولہ سال کے تھے۔
- اسماعیل میرٹھی کی شاعری کے استاد غالب ہیں۔
- اسماعیل میرٹھی کو بچوں کا شاعر کہا جاتا ہے۔
- اسماعیل میرٹھی نے اسکولی بچوں کے لیے درسی کتابیں لکھی تھیں۔
- انگریزی نظموں کا اردو میں ترجمہ سب سے پہلے اسماعیل میرٹھی نے کیا تھا۔
- سرسید کی طرح اسماعیل میرٹھی کو بھی سب سے زیادہ دلچسپی تعلیم میں تھی۔
- اسماعیل میرٹھی کا نام جدید اردو شاعری کی تاریخ میں محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کے ساتھ آتا ہے۔
- اسماعیل میرٹھی نے سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کے دست مبارک پر 1870ء میں بیعت کی تھی۔
- اسماعیل میرٹھی نے 88 غزلیں اور 19 قصائد لکھے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کی داخل نصاب نظمیں

خدا کی صنعت

جو چیز خدا نے ہے بنائی — اُس میں ظاہر ہے خوشنمائی
کیا خوب ہے رنگ ڈھنگ سب کا — چھوٹی بڑی جس قدر ہیں اشیا
روشن چیزیں بنائیں اُس نے — اچھی شکلیں دکھائیں اس نے
ہر چیز کی ہے ادا نرالی — حکمت سے نہیں ہے کوئی خالی
ہر چیز ہے ٹھیک ٹھیک لاریب — ہیں اس کے تمام کام بے عیب
ننھی کلیاں چٹک رہی ہیں — چھوٹی چڑیاں پھدک رہی ہیں
اس کی قدرت سے پھول مہکے — پھولوں پہ پرند آکے چہکے
چڑیوں کے عجیب پر لگائے — اور پھول ہیں عطر میں بسائے
چڑیوں کی ہے بھانت بھانت آواز — پھولوں کا جدا جدا ہے انداز
محلوں میں امیر ہیں بہ آرام — ہے در پہ کھڑا غریب ناکام
ہے کوئی غنی تو کوئی محتاج — بے گھر ہے کوئی کسی کے گھر راج
روزی دونوں کو دی ہے خدا نے — معمور ہیں قدرتی خزانے
تاروں بھری رات کیا بنائی! — دن کو بخشی عجب صفائی!
موتی سے پڑے ہوئے ہیں لاکھوں — ہیرے سے جڑے ہوئے ہیں لاکھوں
کیا دودھ سی چاندنی ہے چھٹکی! — حیران ہوکر نگاہ ٹھٹکی!
تارے رہے صبح تک نہ وہ چاند — آگے سورج کے ہوگئے ماند
نیلا نیلا اب آسماں ہے — وہ رات کی انجمن کہاں ہے
شام آئی تو اس نے پردہ ڈالا — پھر صبح نے کردیا اجالا
جاڑا، گرمی، بہار، برسات — ہر رُت میں نیا سماں نئی بات
جاڑے سے بدن ہے تھرتھراتا — ہر شخص ہے دن میں دھوپ کھاتا
سردی سے ہے ہاتھ پاؤں ٹھرتے — سب لوگ الاؤ پر ہیں گرتے
سرسوں پھولی بسنت آئی — ہولی پھاگن میں رنگ لائی
پھوٹیں نئی کوپلیں شجر میں — اک جوش بھرا ہوا ہے سر میں

جاڑے کی جو رُت پلٹ گئی ہے — دن بڑھ گیا رات گھٹ گئی ہے
گرمی نے زمین کو تپایا — بھانے لگا ہر کسی کو سایہ
برسات میں دَل ہیں بادلوں کے — ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے
روآئی ہے زور شور کرتی — دامانِ زمین کو کترتی
کس زور سے بہہ رہا ہے نالا — اونچے ٹیلے کو کاٹ ڈالا
بل کھا کے ندی نکل گئی ہے — رخ اپنا اُدھر بدل گئی ہے
دریا ہے رواں پہاڑ کے پاس — بستی ہے بستی اجاڑ کے پاس
بستی کے اِدھر اُدھر ہے جنگل — جنگل ہی میں ہورہا ہے منگل
مٹی سے خدا نے باغ اگائے — باغوں میں اُسی نے پھل لگائے
میوے سے لدی ہوئی ہے ڈالی — دانوں سے بھری ہوئی ہے بالی
سبزے سے ہرا بھرا ہے میداں — اونچے اونچے درخت ذی شاں
ہم کھیلتے ہیں وہاں کبڈّی — میری ہے کوئی۔ کوئی پھسڈّی
گائیں بھینسیں عجب بنائیں — کیا دودھ کی ندیاں بہائیں
پیدا کیے اونٹ بیل گھوڑے — ہر شے کے بنا دیئے ہیں جوڑے
روشن آنکھیں بنائیں دودو — قدرت کی بہار دیکھنے کو
دو ہونٹ دیئے کہ منہ سے بولیں — شکر اس کا کریں زبان کھولیں

ہر شے اس نے بنائی نادر
بیشک ہے خدا قوی و قادر

آثارسلف

مشعر کیفیتِ قلعہ اکبر آباد موسوم بہ آثار سلف

یارب! یہ کسی مشعلِ کشتہ کا دھواں ہے — یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمی بزم کی فریاد و فغاں ہے — یا قافلۂ رفتہ کا پس خیمہ رواں ہے
ہاں دور گزشتہ کی مہابت کا نشاں ہے — بانیِ عمارت کا جلال اس سے عیاں ہے

اڑتا تھا یہاں پرچم جم جا ہی اکبر
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہی اکبر

باہر سے نظر ڈالیے اس قلعہ پہ یک چند　　بر پا ہے لبِ آب جمن صورتِ الوند
گویا کہ ہے اک سورما مضبوط تنومند　　یا ہند کا رجپوت ہے یا ترکِ سمرقند
کیا بارۂ سنگین کا پہنا ہے قزاگند　　رنگی کا قزاگند پہ باندھا ہے کمربند
مسدود ہے خندق سے رہِ فتنہ و آشوب
اربابِ تمرد کے لیے برج ہیں سرکوب

تعمیرِ درِ قلعہ بھی البتہ ہے موزوں　　پرشوکت و ذی شان ہے اس کا رخِ بیروں
کی ہے شعرا نے صفتِ طاق فریدوں　　معلوم نہیں اِس سے وہ کمتر تھا کہ افزوں
گو ہم سرِ کیواں ہے نہ ہم پلہ گردوں　　محراب کی ہیئت سے نپکتا ہے یہ مضموں
پیلانِ گراں سلسلہ با ہودجِ زرّین
اِس در سے گزرتے تھے بصد رونق و تزئین

اکبر سا کبھی مخزنِ تدبیر یہاں تھا　　یا طنطنۂ دورِ جہاں گیر یہاں تھا
یا شاہِ جہاں مرجعِ توقیر یہاں تھا　　یا مجمعِ ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا
القصہ کبھی عالمِ تصویر یہاں تھا　　دنیا سے سوا جلوۂ تقدیر یہاں تھا
بہتا تھا اسی کاخ میں دولت کا سمندر
تھے جشن ملوکانہ اسی قصر کے اندر

وہ قصرِ معلیٰ کہ جہاں عام تھا دربار　　آئینہ نمط صاف ہیں جس کے در و دیوار
اور سقفِ زراندود ہے مانندِ چمن زار　　اور فرش ہے مرمر کا مگر چشمۂ انوار
اب بانگِ نقیب اس میں نہ چاؤش کی للکار　　سرہنگِ کمر بستہ نہ وہ مجمعِ حضار
کہتا ہے کبھی مرکزِ اقبال تھا میں بھی
ہاں! قبلہ گہہ عظمت و اجلال تھا میں بھی

جب تک کہ مشیت کو مرا وقر تھا منظور　　نافذ تھا زمانہ میں مری جاہ کا منشور
شاہانِ معاصر کا متعین تھا یہ دستور　　کرتے تھے سفیران ذوی القدر کو مامور
تا میری زیارت سے کریں چشم کو پرنور　　آوازہ میری شان کا پہنچا تھا بہت دور
اکنافِ جہاں میں تھا مراد بدبہ طاری
تسلیم کو جھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری

وہ چتر وہ دیہیم وہ سامان کہاں ہیں   وہ شاہ و نوئین، وہ خاقان کہاں ہیں
وہ بخشی و دستور وہ دیوان کہاں ہیں   خدام ادب اور وہ دربان کہاں ہیں
وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں   فیضی و ابوالفضل سے اعیان کہاں ہیں
سنسان ہے، وہ شاہ نشیں آج صد افسوس
ہوتے تھے جہاں خان و خوانین زمیں بوس

وہ بار گہ خاص کی پاکیزہ عمارت   تاباں تھے جہاں نیر شاہی و وزارت
بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت   آتی تھی جہاں فتحِ ممالک کی بشارت
جوں شحنۂ معزول پڑی ہے وہ اکارت   سیاح کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت
کہتا ہے سخن فہم سے یوں کتبہ دروں کا
تھا مخزنِ اسرار یہی تاج وروں کا

اورنگ سیہ رنگ جو قائم ہے لبِ بام   بوسہ جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظام
اشعار میں ثبت اس پہ جہاں گیر کا ہے نام   شاعر کا قلم اس کی بقا لکھتا ہے مادام
پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام   سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردش ایام
فرسودگی دہر نے شق اب تو کیا ہے
آئندہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے

ہاں! کس لیے خاموش ہے او! تخت جگر ریش   کس غم میں سیہ پوش ہے؟ کیا سوگ ہے درپیش
کملی ہے تیرے دوش پہ کیوں صورت درویش   جوگی ہے ترا پنتھ، کہ صوفی ہے ترا کیش
بولا کہ زمانہ نہ دیا نوش کبھی نیش   صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش
صدقے کبھی مجھ پر گہر و لعل ہوئے تھے
شاہانِ معظم کے قدم میں نے چھوئے تھے

وہ رنگ محل برج مثمن کا وہ انداز   صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرافراز
یاں مطرب خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز   گہہ ہند کی دھرپت تھی کبھی نغمہ شیراز
اب کون ہے بتلائے جو کیفیتِ آغاز   زنہار کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز
جن تاروں کے پرتو سے تھا یہ برج منور
اب ان کا مقابر میں تہہ خاک ہے بستر

اس عہد کا باقی کوئی ساماں ہے نہ اسباب — فوارے شکستہ ہیں تو سب حوض ہیں بے آب
وہ جام بلوریں ہیں نہ وہ گوہر نایاب — وہ چلمنِ زرتار نہ وہ بستر کمخواب
ہنگامہ جو گزرا ہے سو افسانہ تھا یا خواب — یہ معرضِ خدام تھا وہ موقفِ حجاب
وہ بزم نہ وہ دور نہ وہ جام نہ ساقی
ہاں طاق ورواق، اور در و بام ہیں باقی

مستور سراپردۂ عصمت میں تھے جو گل — سودودۂ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے کل
کچھ خیری فرغانہ تھے، کچھ لالۂ کابل — پھر مولسری ہند کی ان میں گئی مل جل
تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامل — تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجمل
سیاح جہاں دیدہ کے نزدیک یہ تعمیر
اکبر کے خیالات مرکب کی ہے تصویر

درشن کے جھروکے کی پڑی تھی یہیں بنیاد — ہوتی تھی تُلا دان میں کیا کیا دہش و داد
وہ عدل کی زنجیر ہوئی تھی یہیں ایجاد — جو سمع شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد
وہ نور جہاں اور جہاں گیر کی اُفتاد — اس کاخ ہمایوں کو بہ تفصیل ہے سب یاد
ہر چند کہ بے کار یہ تعمیر پڑی ہے
قدر اِس کی مورخ کی نگاہوں میں بڑی ہے

اب دیکھیے وہ مسجد و حمام زنانہ — وہ نہر، وہ حوض اور وہ پانی کا خزانہ
صنعت میں ہر اک چیز ہے یکتا و یگانہ — ہے طرزِ عمارت سے عیاں شان شہانہ
کیا ہوگئے وہ لوگ کہاں ہے وہ زمانہ؟ — ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ
چغتائیہ گلزار کی یہ فصل خزاں ہے
ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جہاں ہے

وہ قصر جہاں جودھپوری رہتی تھی بائی — تھی دولت و ثروت نے جہاں دھوم مچائی
دیکھا اُسے جاکر تو بری گت نظر آئی — صحنوں میں جمی گھاس تو دیواروں پہ کائی
گویا در و دیوار یہ دیتے ہیں دہائی — ممکن نہیں طوفان حوادث سے رہائی
جس گھر میں تھے نسریں دسمن یاگل و لالہ
اب نسل ابابیل میں ہے اُس کا قبالہ

وہ مسجدِ زیبا کہ ہے اِس بزم کی دلہن
خوبی میں یگانہ ہے و لے سادۂ و پرفن
محراب و در و بام ہیں سب نور کا مسکن
موتی سے ہیں دالان تو ہے دود سا آنگن
کافور کا تودہ، ہے کہ الماس کا معدن
یا فجر کا مطلع ہے، کہ خود روز ہے روشن
بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس
باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوتِ احساس

ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے
سانچہ میں عمارت کو مگر ڈھال دیا ہے
یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو سیا ہے
مرمر میں مہ و مہر کا سا نور وضیا ہے
گو شمع نہ فانوس نہ بتی نہ دیا ہے
ہاں! چشمۂ خورشید سے اب اِس نے پیا ہے
چلیے جو یہاں سے تو نظر کہتی ہے فی الفور
نظارہ کی دو مجھ کو اجازت کوئی دم اور

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی
اس قلعہ میں ہوں شاہجہاں کی میں نشانی
کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اس نے کہانی
کچھ حالتِ موجود بایں سحر بیانی
ان حجروں میں ہے شمع نہ اس حوض میں پانی
فواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی
تسبیح نہ تہلیل نہ تکبیر و اذاں ہے
بس گوشۂ تنہائی ہے اور قفل گراں ہے

جمگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا
مجمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا
چرچا تھا شب و روز یہاں ذکر خدا کا
ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا
اک قافلہ ٹھیرا تھا یہاں عز و علا کا
جو کچھ تھا گزر جانے میں جھونکا تھا ہوا کا
ہیں اب تو نمازی میرے باقی یہی دو تین
یا دھوپ ہے یا چاندنی یا سایۂ مسکیں

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایام و لیالی
جو واقعہ حسی تھا سو ہے آج خیالی
ہر کوشک و ایوان ہر اک منزل عالی
عبرت سے ہے پر اور مکینوں سے ہے خالی
آقا نہ خداوند، اہالی نہ موالی
جز ذاتِ خدا کی کوئی نہ وارث ہے نہ والی
یہ جملہ محلات جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کیے حیران کھڑے ہیں

جب کند ہوئی دولتِ مغلیہ کی تلوار   اور لوٹ لیا جاٹ نے ایوانِ طلا کار
تب لیک جو تھا لشکر انگلش کا سپہ دار   افواج مخالف سے ہوا برسرِ پیکار
یہ بادۂ و برج اور یہ ایوان یہ دیوار   کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی بہ ناچار
ہے گردشِ ایام کے حملوں کی کسے تاب
پھر قلعۂ اکبر ہی میں تھا کیا پرِ سرخاب

آخر کو لٹیروں کی شکستہ ہوئی قوت   اونچا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت
لہرانے لگا پھر علمِ امن و حفاظت   آثار قدیمہ کی لگی ہونے مرمت
یہ بات نہ ہوتی تو پہنچتی وہی نوبت   دیوار گری آج، تو کل بیٹھ گئی چھت
حکامِ زماں کی جو نہ ہوتی نگرانی
رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی

اربابِ خرد چشم بصیرت سے کریں غور   اکبر کی بنا اس سے بھی پائندہ ہے اک اور
سردی کی جفا جس پہ نہ گرمی کا چلے جور   ہر چند گزر جائیں بہت قرن بہت دور
برسوں یونہیں پھرتے رہیں برج حمل و ثور   اس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور
انجینئروں کی بھی مرمت سے بری ہے
وہ حصنِ حصیں کیا ہے؟ فقط ناموری ہے

او اکبرِ ذی جاہ! تیری عزت و تمکیں   محتاج مرمت ہے نہ مستلزم تزئیں
کندہ ہیں دلوں میں تری الفت کی فرامیں   ہے تیری محبت کی بنا اک دزِ روئیں
گو حملۂ بے سود کرے بھی کوئی کم بیں   زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تحسیں
پشتوں سے رعایا میں بہ آئینِ وراثت
قائم چلی آتی ہے تیرے نامِ کی عظمت

بکرم کی سبھا کو تیری صحبت نے بھلایا   اور بھوج کا دورہ تری شہرت نے بھلایا
ارجن کو تری جرأت و ہمت نے بھلایا   کسریٰ کو ترے دور عدالت نے بھلایا
اسکندر و جم کو تری شوکت نے بھلایا   پچھلوں کو غرض تیری عنایت نے بھلایا
آتے ہیں زیارت کو تو اب تک ہے یہ معمول
زائر تری تربت پہ چڑھا جاتے ہیں دو پھول

ہو کہنہ و فرسودہ ترا قلعہ تو کیا غم — شہرت ہے تیرے نام کی سو قلعوں سے محکم
بھرتا ہے ہر اک فرقہ محبت کا تری دم — لکھتے ہیں مورخ بھی تجھے اکبر اعظم
رتبہ ہے ترا ہند کے شاہوں میں مسلم — یہ فخر ترے واسطے زنہار نہیں کم
گو خاک میں مل جائے ترے عہد کی تعمیر
ہے کتبۂ عزت ترا ہر سینہ میں تحریر

ہاں! قوم کے نوعمر جوانو اِدھر آؤ — ہے دیدۂ بینا تو اسے کام میں لاؤ
آثار صنادید کی عینک کو لگاؤ — عبرت کی نگاہوں کو پس و پیش پھراؤ
راہ طلب و شوق میں اک شمع جلاؤ — گنجینۂ اعزاز کو پانا ہے تو پاؤ
یہ نقش و نگارِ در و دیوار شکستہ
دیکھو! تمھیں دکھلاتے ہیں آئندہ کا رستہ

اسلاف نے ملکوں پہ اگر کی تھی چڑھائی — یا کاخِ حکومت کی تھی بنیاد اٹھائی
یا طرح کیے کوشکِ سیمین و طلائی — یا بحر میں کشتیِ تجارت تھی چلائی
یا کشورِ تہذیب میں کی قلعہ کشائی — کس برتے پہ یہ کام تھے آخر میرے بھائی
جب بحر مصائب کو شنا کرکے ہوئے پار
تب دہرِ مخالف بھی ہوا غاشیہ بردار

عزت کی ملی تھی انھیں جاگیر دوامی — دولت کے طرفدار تھے اور دین کے حامی
خصلت میں خوشامد تھی نہ عادت میں غلامی — رسموں میں خرابی تھی نہ اطوار میں خامی
گر فہم و فراست کی مجالس میں تھے نامی — تدبیر ممالک میں تھے وہ صدر گرامی
گر فتح و ظفر میں تھے سکندر سے زیادہ
تھے دانش و حکمت میں ارسطو کے بھی دادہ

کیا کیا طلبِ علم میں کرتے تھے جگر خوں — لیلیٰ تھا اگر علم تو وہ لوگ تھے مجنوں
کچھ بوعلی سینا ہی نہ تھا رشک فلاطوں — بہتوں نے کدایا یوہیں تحقیق کا گلگوں
مدت کی کہانی ہے اگر سیرتِ ماموں — تاریخ میں دیکھو سببِ مرگ ہمایوں
اکبر بھی تھا آخر اسی تہہ جرعہ کا مخمور
تھا فیضی علامہ اسی کام پہ مامور

یہ کہنہ عمارات کہ ہیں وقف تباہی — اسلاف کے اوصاف پہ دیتی ہیں گواہی
صرف اصل و نسب ہی پہ نہ تھے اپنی مباہی — مکتب میں تھے استاد ریاضی و الہی
میدان مساعی میں تھے اک مرد سپاہی — زیبا تھا انھیں چتر جہاں بانی و شاہی
کنیاتے تھے محنت سے نہ آلام سے تھکتے
کوشش کی گھٹا میں تھے وہ بجلی سے کڑکتے

وہ عیش کے مملوک تھے بندۂ راحت — گلگشت چمن زار تھی گویا انھیں عزت
برداشت جفا کرتے تھے سہتے تھے صعوبت — اوروں کے بھروسے پہ نہ کرتے تھے معیشت
دنیا کے کسی کام میں ہیٹی نہ تھی ہمت — بے غیرتی زنہار نہ تھی ان کی جبلت
ہمت میں تھے شاہین تو جرأت میں تھے شہباز
عزت کی بلندی پہ کیا کرتے تھے پرواز

وہ صولت و سطوت میں تھے جوں شیر نیستاں — عزت کے لیے جان کیا کرتے تھے قرباں
تھا انجمنِ عیش سے خوشتر انھیں میداں — محنت کے تھے بودے نہ مشقت سے گریزاں
دشوار تھی بے حرمتی اور ننگ مگر ہاں — آسان تھی تیرہ کی انی، تیر کا پیکاں
خیرات کے ٹکڑے پہ نہ گرتے تھے وہ حاشا
تھا لعل بہا ان کو یہ دولت کا تماشا

وہ کعبۂ مقصود تھے یا قبلۂ حاجات — کس منہ سے بزرگوں پہ کریں فخر و مباہات
سر اپنے گریباں میں ذرا ڈالیے ہیہات — اوصافِ اضافی سے نہیں کچھ شرف ذات
تلوار میں جب کوئی اصالت کی نہ ہو بات — گاہک تو نہ پوچھے گا یہ کس کان کی ہے دھات
بندوق دمِ صید گر اچھی نہ چلی ہو
مردود ہے گو لندن و پیرس میں ڈھلی ہو

دل اپنی ستائش سے نہ بہلایئے حضرت — اِس راہ میں دھوکا نہ کہیں کھایئے حضرت
شیخی کو بہت کام نہ فرمایئے حضرت — شعلہ کو تعلّی کے نہ بھڑکایئے حضرت
آبا کی بزرگی پہ نہ اترایئے حضرت — یہ گو ہے یہ میدان، اِدھر آیئے حضرت
اب بھی تو وہی خیر سے نسلِ شرفا ہے
آخر سبب اِس نیک سر انجام کا کیا ہے

کیوں قوم کی حالت میں تنزل کا پڑا ڈھنگ   کیوں انجمنِ عیش پرستی کا جما رنگ
کیوں تیغ شرافت کو دنائت کا لگا زنگ   مغلوب سفاہت ہوئے کیوں دانش و فرہنگ
روباہ بنے کس لیے شیرانِ صفِ جنگ   کیوں بارگیِ عزم ہوا دونِ خرلنگ
کیوں ٹوٹ گئے بازِ عمل کے پروبازو
کیوں ذروۂ عزت پہ لگا بولنے اُلو

جز پہلے زمانہ میں جمی جیسے شجر کی   لذت ہمیں چکھنی ہے ضرور اس کے ثمر کی
بے شک ہے یہ پاداش اسی شور کے شر کی   ہاں مستحق اولاد ہے میراث پدر کی
تفتیش کر و دوستو! اخبار و سیر کی   فہرست مرتب کرو ہر عیب و ہنر کی
دو ڈیڑھ صدی پہلے سے جو اپنا ڈھچر تھا
انصاف سے دیکھو اسے کیا پوچ و لچر تھا

جو راہ نمائی کو چلے آپ تھے گمراہ   حالات سے واقف نہ مقامات سے آگاہ
شیروں کی جگہ جمع ہوا گلۂ روباہ   ہر کرمکِ شب تاب بنا مدعی ماہ
ہر شخص کو تھی خود غرضی سے طلب باہ   ویسے ہی امیرالامرا جیسے شہنشاہ
رسم حسد و بغض و عداوت ہوئی تازہ
آخر کو اٹھا دولت و عزت کا جنازہ

وہ غور کے غزنیں کے دلیرانِ ظفرمند   وہ شاہ سوارانِ بخارا و سمرقند
جو ہند کے خطے میں ہوئے خاک کے پیوند   جی اٹھتے دوبارہ اگر ان میں سے تنے چند
ہاں ...... اوّل میں تو ہوتے ہی وہ خرسند   پھولے نہ سماتے کہ ہمارے ہیں یہ فرزند
پر دیکھتے جب ان کے برے فعل سے برقول
جا بیٹھتے قبروں ہی میں پڑھتے ہوئے لاحول

کیا حال تھا حضراتِ ملوک اور امرا کا   انبوہ تھا بیہودہ مشاغل کی بلا کا
یا فوج کی کنیزوں کی تھی اک قہر خدا کا   یا بولتا طوطی تھی کسی خواجہ سرا کا
یا شور خوشامد کا تھا یا مدح و ثنا کا   تھا غول گویوں کا، تو جمگھٹ شعرا کا
سفلے تھے مشیر اور مصاحب تھے چھچھورے
وہ عقل کے دشمن تو حضوران سے بھی کورے

کاسد ہوا بازار ہر اک طرزِ عمل کا   عالم نظر آتا ہے بتر آج سے کل کا
مفلس ہیں تو پیشہ ہے فریب اور دغل کا   اندیشہ نہیں کچھ انھیں ایماں کے خلل کا
مدت سے گیا ڈھانچ بگڑ اہلِ دول کا   چکھا ہے مزہ خوب ہی اسراف کے پھل کا

اب کوئی اگر دولتِ قومی کی کرے جانچ
ٹٹ پونجیے البتہ نکل آئیں گے دس پانچ

اب نام کو ہم میں جو گروہِ شرفا ہے   سو حالتِ افلاس میں جینے سے خفا ہے
یا شامتِ اعمال سے پامال جفا ہے   کچھ حسن معیشت نہ کہیں صدق و صفا ہے
کچھ دولت دنیا ہے تو بے مہر و وفا ہے   کچھ دین کا چرچا ہے تو وہ روبہ قفا ہے

چھائے گی تنزل کی ابھی ہم پہ گھٹا اور
ہم اور ہوا میں ہیں زمانہ کی ہوا اور

جو لوگ یہ سمجھے کہ ہیں صرف اپنے لیے ہم   اغراض و مقاصد ہیں فقط اپنے مقدم
یاروں کی انھیں فکر نہ غیروں کا انھیں غم   ہمدرد عشیرت ہیں نہ ہمسایوں کے ہمدم
وہ فہم و فراست میں بہائم سے بھی ہیں کم   یا سنگ ہیں یا خشت ہیں جائیں بہ جہنم

ان مردہ دلوں سے تو کرو قطع نظر بس
لے ڈوبیں گے تم کو بھی چلے ان کا اگر بس

جو قوم کے اوصاف تھے سو ان میں سے اکثر   آپس کی کشاکش میں گلا گھٹ کے گئے مر
غمخواری و احسان و مروّت کا لٹا گھر   انصاف کا اور دین و دیانت کا کٹا سر
نیکوں سے ہوئے بد، تو بدوں سے ہوئے بدتر   کاشانۂ دولت کی جگہ رہ گئے چھپّر

جو کام تھے یاروں کے سو گردن زدنی تھے
خود اپنے لیے مستعدِ بیخ کنی تھے

جرأت تھی سو آپس کی عداوت میں ہوئی صرف   قوت تھی، سو رشک اور رقابت میں ہوئی صرف
شوکت تھی سو خود بینی و نخوت میں ہوئی صرف   فرصت تھی سو بیکاری و غفلت میں ہوئی صرف
عزت تھی، سو افلاس و فلاکت میں ہوئی صرف   دولت تھی سو عیاشی و عشرت میں ہوئی صرف

اس وقت ہمیں عاقبت الامر ہوا ہوش
جب رہ گئے ہم لوگ بیک بینی و دوگوش

مدت سے زمانہ میں ترقی کا پھنکا صور　　عالم میں بجا اور ہی تحقیق کا طنبور
آفاق میں پھیلا نئی ایجاد کا منشور　　خورشید برآمد ہوا بھاگی شب دیجور
ہم دے کے ڈھئی کلبۂ احزاں میں بدستور　　سوتے رہے غفلت میں پڑے بے خود و مخمور
ناوقت کھلی آنکھ تو حیراں ہیں اب ہم
ہم کون ہیں کیا چیز ہیں اے وائے عجب ہم

ہم چاہتے ہیں عیش بھی اور ناموری بھی　　دولت بھی ہمیں چاہیے اور بے ہنری بھی
اعزاز بھی مطلوب بیہودہ سری بھی　　آوارگی منظور ہے اور راہبری بھی
مقصود رفو بھی ہے مگر جامہ دری بھی　　گر پستیٔ ہمت ہے تو عالی نظری بھی
یہ بات تو ہوگی نہ ہوئی ہے کبھی آگے
پھرتے ہیں محالات کے پیچھے یونہیں بھاگے

خیر اب کوئی تدبیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے　　کفارۂ تقصیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
کچھ چارۂ تاخیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے　　اس حال کو تغئیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
فریاد میں تاثیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے　　اس خواب کی تعبیر بھی ہے یا کہ نہیں ہے
کچھ بھی نہیں دشوار اگر ٹھان لو جی میں
گھنٹوں میں ہو وہ کام جو ہوتا ہو صدی میں

بے کوشش و بے جہد ثمر کس کو ملا ہے　　بے غوطہ زنی گنج گہر کس کو ملا ہے
بے خون پیے لقمۂ تر کس کو ملا ہے　　بے جور کشی تاج ظفر کس کو ملا ہے
بے خاک کے چھانے ہوئے زر کس کو ملا ہے　　بے کاوشِ جاں علم و ہنر کس کو ملا ہے
جو رتبۂ والا کے سزاوار ہوئے ہیں
وہ پہلے مصیبت کے طلبگار ہوئے ہیں

کوشش ہی نے اجرام سماوی کو ہے تولا　　کوشش ہی نے طبقات زمیں کو ہے ٹٹولا
کوشش ہی نے رستہ نئی دنیا کا ہے کھولا　　کوشش ہی نے گوہر ہے تہہِ بحر سے رولا
کوشش ہی کا طوطی ہے سدا دہر میں بولا　　کوشش ہے غرض طرفہ طلسمات کا گولا
قدرت نے فتوحات کی رکھی ہے یہی را
سعی اپنی طرف سے ہو تو اتمام من اللہ

ہیں آج کل اسکول کے کمرے صفِ ہیجا　　سرمایۂ علم و ہنر و فضل ہے یغما
ہر قوم کا پُر مالِ غنیمت سے ہے کیسا　　لیکن تمھیں کچھ سود و زیاں کی نہیں پروا
کیوں قوم کے اعزاز کی لٹیا کو ڈبویا　　کیوں کسبِ کمالات میں تم ہوگئے پس پا
• اوروں سے تو بودے نہ تھے مانا کہ تم ایسے
میدان سے کیوں بھاگ گئے نوک دم ایسے

ہر چند کہ دعویٰ تھا تمھیں سیف و قلم کا　　تھا فخر تمھیں نسلِ عرب اور عجم کا
لیکن نہ رہا طرز وہ عادات و شیم کا　　سیکھا نہ وتیرہ کوئی اربابِ ہمم کا
ناچار ہر اک قوم نے تم کو لیا دھمکا　　بے سعی کسی کا بھی ستارہ نہیں چمکا
تم راہ طلب میں ہو اگر اب بھی شتاباں
ہو کوکبِ عزت افقِ دہر پہ تاباں

اب تک بھی سکت ہے وہی ہڈی میں تمھاری　　اب تک بھی وہی خوں ہے شرائین میں جاری
افغانی و ترکی و حجازی و تتاری　　ایرانی و تورانی و بلخی و بخاری
اے دوستو! ہمت ہی مگر تم نے تو ہاری　　اِس واسطے بس کرکری شیخی ہوئی ساری
مدِّ علما دفترِ قومی میں ہے خالی
فارابی و طوسی ہیں نہ رازی و غزالی

تلواروں کا سایہ تھا جنھیں سایہ طوبیٰ　　جولان گہہ ہمت تھی جنھیں وسعتِ دنیا
تھا ریگ رواں جن کے لیے بسترِ دیبا　　اور خیمہ اطلس تھا یہی قبۂ خضرا
ہے تم کو اگر ان کے خلف ہونے کا دعویٰ　　دکھلاؤ حریفوں کے مقابل ہنر اپنا
ترتیب سے جم جاؤ قرینہ بقرینہ
میدانِ ترقی میں لڑو سینہ بہ سینہ

یہ جنگ نہیں توپ کی یا تیغ و تبر کی　　اِس جنگ میں کچھ جان کی جوکھوں ہے نہ زر کی
یہ جنگ ہے اخلاق کی اور علم و ہنر کی　　یہ جنگ ہے تحصیل عمل اور نظر کی
اس جنگ میں آسودگی ہے نوعِ بشر کی　　آزادی ہے ملکوں کی تو آبادی ہے گھر کی
یہ جنگ نہیں وضع مروت کے منافی
اس جنگ سے مافات کی ممکن ہے تلافی

ہے جنگ سے مقصود بلندیِ ارادہ — وہ ہم سے زیادہ ہیں تو ہم ان سے زیادہ
رستہ ہو تعصب کا نہ کینہ کا ہو جادہ — نقشِ حسد و بغض سے افعال ہوں سادہ
دل صاف رہے اور طبیعت بھی کشادہ — اس طور سے حاصل کرو عزت کا وسادہ
گر جوہر ہمت ہے تو سبقت میں کرو کد
نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد

باقی ہے اگر جوشِ حمیت کا حرارہ — تو معرکۂ علم میں ہوجاؤ صف آرا
جاں ڈال دو ناموس کے قالب میں دوبارہ — پیچھے نہ ہٹاؤ قدمِ عزم خدارا
ذلت نہیں ہوتی کبھی مردوں کو گوارا — چمکو فلکِ جاہ پہ تم بن کے ستارا
آبا نے کیا فتح جو بنگال و دکن کو
تسخیر کرو تم عمل و علم کو فن کو

ادنیٰ سا بھی ہر کام ہے اب علم کا محکوم — بے علم ہے جو قوم سو حال اُس کا ہے معلوم
دولت سے ہے بیگانہ تو عزت سے ہے محروم — اقوال کمینہ ہیں تو افعال ہیں مذموم
اربابِ ہنر کی کرۂ ارض پہ ہے دھوم — سب حلقہ بگوش ان کے ہیں وہ سب کے ہیں مخدوم
دنیا میں اسی قوم کا گلزار ہے پھولا
جو رکھتی ہے دانش میں ہنر میں یدِ طولا

تم جانتے ہو خوب کہ انسان ہے فانی — فانی ہے بلاشبہ مگر اس کی نشانی
کیا اس کی نشانی ہے سنو میری زبانی — امثال میں مذکور ہے پچھلوں کی کہانی
خوش بخت تھے وہ۔ کرگئے جو فیض رسانی — بدبخت تھے مغلوبِ صفاتِ حیوانی
گر تم بھی یو ہیں اٹھ گئے حیوان سے رہکر
آئندہ کی نسلیں تمھیں کیا روئیں گی کہہ کر

پھل خدمتِ قومی ہے اگر نخل ہیں اقوال — تنِ خدمت قومی ہے اگر جامہ ہیں افعال
جانِ خدمتِ قومی ہے اگر جسم ہیں اعمال — ملحوظ رکھو خدمتِ قومی کو بہرحال
پر نفع یہ ہی شغل ہے من جملۂ اشغال — جو زندۂ جاوید ہیں ان کی ہے یہی چال
پر الفتِ قومی سے ہے جن کا رگ و ریشہ
مرنے کو تو مرتے ہیں۔ پہ جیتے ہیں ہمیشہ

قوت ہے اگر دل میں دماغوں میں ہے طاقت　　پہنچاؤ بہم حسنِ بیاں اور طلاقت
اصلاحِ معائب میں کرو صرف لیاقت　　دکھلاؤ مریضوں کے مداوا ہیں حذاقت
رکھو نہ غریبوں پہ روا طعنِ حماقت　　قومی ضعفا کی نہ کرو ترک رفاقت
کیا دولتِ ہستی ہے پئے نفس پرستی
آباد کرو قوم کی اجڑی ہوئی بستی

ہے قوم اگر باغ تو تم اس کے شجر ہو　　ہے قوم اگر نخل تو تم اس کے ثمر ہو
ہے قوم اگر آنکھ تو تم نورِ بصر ہو　　ہے قوم اگر چرخ تو تم شمس و قمر ہو
ہے قوم اگر کان تو تم لعل و گہر ہو　　نظارگی ہے قوم، تو تم مدنظر ہو
موسیٰ بنو اور قوم کو ذلت سے بچاؤ
گو سالۂ غفلت کی پرستش کو چھڑاؤ

او باغِ خزاں دیدہ کے نوخیز منہالو!　　او ساحتِ ہستی کے نئے دوڑنے والو!
مضبوط کرو دل کو طبیعت کو سنبھالو　　کچھ دور نہیں۔ منزلِ مقصود کو جالو
ہاں! مدِّ مقابل بنو ہتھیار نہ ڈالو　　میدانِ ترقی کی زمیں سر پہ اٹھالو
زنہار گوارا نہ کرو ننگِ ہزیمت
موقع ہے ابھی گرم کرو رخشِ عزیمت

غیرت ہو تو گر کر بھی سنبھلنا نہیں مشکل　　جرأت ہو تو زرغہ سے نکلنا نہیں مشکل
ہو صبر تو آفات کا ٹلنا نہیں مشکل　　ہو آنچ تو پتھر کا پگھلنا نہیں مشکل
ہمت ہو تو حالت کا بدلنا نہیں مشکل　　انجن ہو تو گاڑی کا بھی چلنا نہیں مشکل
گرمی سے کرو پہلے بخارات مہیا
پیدا حرکت ہو تو لگے گھومنے پہیا

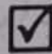
ہمت ہی حرارت ہے وہی ہے حرکت بھی　　ہمت ہی سے ہر قوم نے پائی ہے ترقی
گر چیونٹی تیمور کی ہمت نہ بندھاتی　　ہتھیار بھی بے کار تھے اور فوج نکمی
ہمت ہے سر انجامِ مہمات کی کنجی　　ہمت ہی حقیقت میں ہے توفیقِ الٰہی
ہمت ہی بنا دیتی ہے مفلس کو تونگر
ہمت کے سفینہ کا اٹھا دیجیے لنگر

ہمت ہے اگر تم میں تو میدان لیا مار   ڈٹ جاؤ کمر باندھ کے ہشیار! خبردار!
اوروں ہی کے گنڈے پہ نہ رہنا کبھی زنہار   ہونے نہ دو اعزاز کے جھنڈے کو نگونسار
لو ہاتھ میں اب تم بھی کوئی پین کی تلوار   اس معرکۂ سخت میں مردانہ کرو وار
ہاں قوتِ بازو سے بلا شرکتِ غیرے
آگے کو بڑھو کھول دو نصرت کے پھریرے

قسمت کی برائی ہے نہ تقدیر کا ہے پھیر   خود اپنے ہی کرتوت سے برپا ہے یہ اندھیرا
تحصیلِ فضائل میں جوانو! نہ کرو دیر   فرصت کو اگر اور مگر میں نہ کرو تیر
بزدل نہ بنو حق نے بنایا ہے تمھیں شیر   کہسار بھی ہو تو اسے کردو زبر و زیر
یلغار کرو علم کے میداں میں عزیزو
آخر تو ہو تم قومِ مسلماں میں عزیزو

جس بستی میں دیکھو کہ نحوست ہے برستی   غالب ہے کہ ہوگی وہ اسی قوم کی بستی
گرتی چلی جاتی ہے ابھی جانبِ پستی   چلتی ہے فضولی کی سدا تیغ دودستی
لے دے کے یہی جنس ہے اس دور میں سستی   فاقہ پہ ہے فاقہ مگر اب تک وہی مستی
مل بیٹھ کے اندیشۂ انجام نہ کرنا
روٹی ملے جس کام سے وہ کام نہ کرنا

خیلِ علما کی بھی حمیت ہوئی زائل   تبدیل رذائل سے ہوئے جملہ فضائل
مرتے ہیں مشیخت پہ تفاخر پہ ہیں مائل   چھپتے ہیں فریقین سے پرزہر رسائل
لاکھوں ہیں پڑے خنجرِ تکفیر کے گھائل   باعث ہیں جدل کے یہی فقیہ مسائل
برپا ہے شب و روز یہاں چپقلش ایسی
عالم ہے لقب اور بہم کش مکش ایسی



لسان العصر

اکبر الٰہ آبادی

(1846-1921ء)

- نام اکبر حسین تھا اور تخلص اکبر
- اکبر 16 نومبر 1846 میں بمقام بارہ ضلع الٰہ آباد میں پیدا ہوئے۔
- اکبر کا انتقال 9 ستمبر 1921 میں ہوا۔(75 سال کی عمر)
- اکبر کے والد کا نام تفضل حسین تھا۔
- اکبر کی دو شادیاں ہوئی تھیں۔
- اکبر نے بیس سال کی عمر میں مختاری کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا تھا۔
- اکبر نے گیارہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔
- اکبر نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی۔
- اکبر کے شاعری کے استاد غلام حسین وحید الٰہ آبادی ہیں۔
- اپنی شاعری میں اکبر شیخ، بدھو، جمن، اونٹ، ٹٹو، گائے، ریل گاڑی جیسے لفظ بھی ظرافت کے لیے استعمال کرتے تھے۔
- اکبر کو انگریزی لفظ استعمال کرنے کا بہت شوق تھا۔
- اکبر مزاحیہ شاعر تھے۔
- اکبر کہتے تھے کہ ”شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف“
- اکبر نے اپنے کلام میں مغربی طرزِ حیات کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔
- اکبر کی جوڈیشری خدمات کے عوض 1898 میں خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔
- اکبر الٰہ آبادی سرسید تحریک، (علی گڑھ تحریک) کے مخالف تھے۔
- سرسید کی موت پر اکبر نے کہا تھا ”ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا۔“
- مہاراجہ سر کشن بہادر سے اکبر کے گہرے تعلقات تھے۔
- خواجہ حسن نظامی سے اکبر کے گہرے تعلقات تھے۔
- داغ اور ہیرا اکبر کا تنقیدی مضمون ہے۔

- نظم گاندھی نامہ میں تین سو اکہتر اشعار ہیں۔
- اکبر کی کلیات چار حصوں میں ہے۔

اکبر کے متعلق مختلف آراو خیالات

- اکبر کی نظم ' جلوۂ دربار دہلی ' کو حامد کاشمیری نے ایک ' انفرادی رنگ ' کی نظم کہا ہے۔
- اکبر روایتی ہوتے ہوئے بھی باغی اور باغی ہوتے ہوئے اصلاحی ہیں۔(رشید احمد صدیقی)
- اکبر کی نظر قوم کی میراث پر بھی تھی اور قوم کی تقدیر پر بھی۔(رشید احمد صدیقی)
- حالی ماضی کے، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے شاعر قرار دیے جاسکتے ہیں۔(رشید احمد صدیقی)
- اردو ادب میں طنز وظرافت کا سلیقہ وصحیفہ غالب اور اکبر کا دیا ہوا ہے۔(رشید احمد صدیقی)
- جو فقرے ان (اکبر) کی زبان سے نکلتے ہیں انشاپردازی کے جواہر ریزے ہوتے ہیں۔ (مہدی افادی)
- وہ (اکبر) شوہر پرست بیوی کو پبلک پسند لیڈی پر ترجیح دیتے ہیں۔(رشید احمد صدیقی)
- اکبر مشاق غزل گو اور روایتی غزل گو صوفی تھے۔ (آل احمد سرور)
- یگانہ یاس چنگیزی نے اکبر کی شاعری کو غالب سے برتر قرار دیا ہے۔
- اقبال نے اکبر کو اپنا استادِ معنوی کہا ہے۔

اکبر الہ آبادی کی داخل نصاب نظمیں

فرضی لطیفہ

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں
نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ
کیا ہے جس کو میں نے زیب قرطاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے
کہ بیٹا تو اگر کر لے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے
بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس
کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی
کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوش طبیعت
کجا ٹھونسی ہوئی چیزوں کا احساس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے
ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی
مجھے سمجھا ہے کوئی ہرچرن داس

دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود
نہیں منظور مغز سر کا آماس

یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ
تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

برقِ کلیسا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار

زلف پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید
قدرِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

آنکھیں وہ فتنہ دوراں کہ گنہ گار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

گرم تقریر جسے سننے کو شعلہ لپکے
دلکش آواز کہ سن کر جسے بلبل جھپکے

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں
سر کشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتشِ حسن سے تقویٰ کو جلانے والی
بجلیاں لطف تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حسن بیاں شوخیِ تقریر میں غرق
ٹرکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یاحفیظ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائیں کوئی میداں میں تو اترا جائیں
پائیں سامان اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیوں کر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

دشمن صبر کی نظروں میں لگاوٹ پائی
کامیابی کی دلِ زار نے آہٹ پائی

عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحت روح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح

شجر طور کا اس باغ میں پودا ہی نہیں
گیسوئے حور کا اس دور میں سودا ہی نہیں

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم ہیں باقی نہیں اب خالد (رض) جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوشِ سپاہ
سب کے سب آپ ہی پڑھتے ہیں سبحان اللہ

جوہر تیغ مجاہد ترے ابرو پہ نثار
نور ایماں کا ترے آئینہ رو پہ نثار

اٹھ گئی صفحہ خاطر سے وہ بحث بد و نیک
دو دلے ہو رہے ہیں کہتے ہیں اللہ کو نیک

موج کوثر کی کہاں اب ہے مرے باغ کے گرد
میں تو تہذیب میں ہوں پیرِ مغاں کا شاگرد

مجھ پہ کچھ وجہ عتا آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

جب کہا صاف یہ میں نے کہ جو ہو صاحب فہم
تو نکالو دلِ نازک سے یہ شبہ یہ وہم

میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

جلوۂ دربار دہلی

سر میں شوق کا سودا دیکھا
دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ . دیکھا اچھا دیکھا
کیا بتلائیں کیا کیا دیکھا

جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

پلٹن اور رسالے دیکھے
گورے دیکھے کالے دیکھے
سنگینیں اور بھالے دیکھے
بینڈ بجانے والے دیکھے

خیموں کا اک جنگل دیکھا
اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا
عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری
پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری
تیزی تھی .ہر جمپ سے جاری

ڈالی میں نارنگی دیکھی
محفل میں سارنگی دیکھی

بیرنگی بارنگی دیکھی　　دہر کی رنگارنگی دیکھی

اچھے اچھوں کو بھٹکا دیکھا　　بھیڑ میں کھاتے جھٹکا دیکھا
منہ کو اگرچہ لٹکا دیکھا　　دل دربار سے اٹکا دیکھا

ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم　　ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم　　میلوں تک وہ چم چم چم چم

پر تھا پہلوئے مسجد جامع　　روشنیاں تھیں ہر سو لامع
کوئی نہیں تھا کسی کا سامع　　سب کے سب تھے دید کے طامع

سرخی سڑک پر کٹتی دیکھی　　سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتش بازی چھٹتی دیکھی　　لطف کی دولت لٹتی دیکھی

چوکی اک چوکھی دیکھی　　خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی　　شہد اور دودھ کی مکھی دیکھی

ایک کا حصہ من و سلویٰ　　ایک کا حصہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا　　میرا حصہ دور کا جلوا

اوج برٹش راج کا دیکھا　　پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا　　رخ کرزن مہراج کا دیکھا

پہنچے پھاند کے سات سمندر　　تخت میں ان کے بیسوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر　　اپنی جگہ ہر ایک سکندر

اوج بخت ملاقی ان کا　　چرخ ہفت طبقاتی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا　　آنکھیں میری باقی ان کا

ہم تو ان کے خیر طلب ہیں　　ہم کیا ایسے ہی سب کے سب ہیں

ان کے راج کے عمدہ ڈھب ہیں
سب سامان عیش و طرب ہیں

انگریزش کی شان انوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی
ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
من بھر سونے کی لاگت سوکھی

جشن عظیم اس سال ہوا ہے
شاہی فورٹ میں بال ہوا ہے
روشن ہر اک ہال ہوا ہے
قصۂ ماضی حال ہوا ہے

ہے مشہور کوچہ و برزن
ہال میں ناچیں لیڈی کرزن
طائر ہوش تھے سب کے لرزن
رشک سے دیکھ رہی تھی ہر زن

ہال میں چمکیں آ کے یکا یک
زریں تھی پوشاک جھکا جھک
محو تھا ان کا اوج سما تک
چرخ پہ زہرہ ان کی تھی گاہک

گو رقاصۂ اوج فلک تھی
اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی
بزمِ عشرت صبح تلک تھی

کی ہے یہ بندش ذہنِ رسا نے
کوئی مانے خواہ نہ مانے
سنتے ہی ہم تو یہ افسانے
جس نے دیکھا ہو وہ جانے



قومی شاعر

برج نرائن چکبست

(1882-1926ء)

- نام پنڈت برج نرائن چکبست تھا اور تخلص چکبست۔
- چکبست 19 جنوری 1882 میں فیض آباد میں پیدا ہوئے تھے۔
- چکبست کا انتقال فالج کی وجہ سے رائے بریلی اسٹیشن پر 1926 میں ہوا تھا۔
- چکبست کے والد کا نام پنڈت اودت نرائن چکبست تھا جو یقین تخلص کرتے تھے۔
- چکبست نے 1900 میں میٹرک، 1905 میں بی اے اور 1907 میں ایل ایل بی کے امتحانات پاس کیے۔
- چکبست نے شہنشاہ حسین رضوی کے جونیئر کی حیثیت سے وکالت شروع کی تھی۔
- چکبست کشمیری پنڈت تھے۔
- چکبست کی پہلی شادی پرتھوی ناتھ ناگو کی صاحب زادی سے 1905 میں ہوئی تھی۔
- چکبست کی دوسری شادی پنڈت سورج ناتھ آغا کی بیٹی کھیما دیوی سے 1907 میں ہوئی تھی۔
- چکبست نے شعر گوئی نو برس کی عمر میں شروع کی تھی اور غزل کہی تھی۔
- چکبست نے اپنی پہلی نظم 'حب قومی' 1894 میں کشمیری پنڈتوں کی کانفرنس میں سنائی تھی۔
- چکبست اساتذہ میں آتش غالب اور انیس کے کلام کے شیدا تھے۔
- چکبست کی غزل پر آتش اور مسدس پر انیس کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔
- چکبست کی شاعری کے استاد مرحمت الدولہ حکیم اور افضل الدولہ افضل ہیں۔
- چکبست کی شاعری مخصوص طور پر وطنی شاعری ہے۔
- چکبست نے ماہنامہ 'صبح امید' 1918 میں جاری کیا تھا۔
- چکبست نے حالی اور مقدمہ شعر و شاعری پر سخت اعتراض کیا ہے۔
- چکبست رسم پردہ کے مخالف اور تعلیم نسواں کے موید تھے۔
- چکبست نے اپنے مجموعے کلام کو بشن نرائن کے نام انتساب کیا ہے۔
- چکبست انیس سے بہت متاثر تھے۔
- چکبست شخصی مرثیہ نگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔

۰ اگر ان کی نظم کو انیس کے کسی مرثیے میں شامل کر دیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ انیس کے سوا کسی اور کا کلام ہے۔ (نیاز فتح پوری)

چکبست کی داخل نصاب نظمیں

رامائن کا ایک سین

(راجہ رامچندر کا ماں سے رخصت ہونا)

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام — راہ وفا کی منزل اول ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام — دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہار بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اداس تو غم ہوگا اور بھی

دل کو سنبھالتا ہوا آخر وہ نونہال — خاموش ماں کے پاس گیا صورت خیال
دیکھا تو ایک در میں ہے بیٹھی وہ خستہ حال — سکتا سا ہو گیا ہے یہ ہے شدت ملال
تن میں لہو کا نام نہیں زرد رنگ ہے
گویا بشر نہیں کوئی تصویر سنگ ہے

کیا جانے کس خیال میں گم تھی وہ بے گناہ — نور نظر پہ دیدۂ حسرت سے کی نگاہ
جنبش ہوئی لبوں کو بھری ایک سرد آہ — لی گوشہ ہائے چشم سے اشکوں نے رخ کی راہ
چہرہ کا رنگ حالت دل کھولنے لگا
ہر موئے تن زباں کی طرح بولنے لگا

آخر اسیر یاس کا قفل دہن کھلا — افسانۂ شدائد رنج و محن کھلا
اک دفتر مظالم چرخ کہن کھلا — وا تھا دہان زخم کہ باب سخن کھلا
درد دل غریب جو صرف بیاں ہوا
خون جگر کا رنگ سخن سے عیاں ہوا

رو کر کہا خموش کھڑے کیوں ہو میری جاں — میں جانتی ہوں جس لیے آئے ہو تم یہاں
سب کی خوشی یہی ہے تو صحرا کو ہو رواں — لیکن میں اپنے منہ سے نہ ہرگز کہوں گی ہاں
کس طرح بن میں آنکھوں کے تارے کو بھیج دوں
جوگی بنا کے راج دلارے کو بھیج دوں

دنیا کا ہو گیا ہے یہ کیسا لہو سپید اندھا کیے ہوئے ہے زر و مال کی امید
انجام کیا ہو کوئی نہیں جانتا یہ بھید سوچے بشر تو جسم ہو لرزاں مثال بید
لکھی ہے کیا حیات ابد ان کے واسطے
پھیلا رہے ہیں جال یہ کس دن کے واسطے

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت و حشم تم میرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت و تاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

کن کن ریاضتوں سے گزارے ہیں ماہ و سال دیکھی تمہاری شکل جب اے میرے نونہال
پورا ہوا جو بیاہ کا ارمان تھا کمال آفت یہ آئی مجھ پہ ہوئے جب سفید بال
چھٹتی ہوں ان سے جوگ لیا جن کے واسطے
کیا سب کیا تھا میں نے اسی دن کے واسطے

ایسے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ تمنا اجڑ گیا

سرزد ہوئے تھے مجھ سے خدا جانے کیا گناہ منجدھار میں جو یوں مری کشتی ہوئی تباہ
آتی نظر نہیں کوئی امن و اماں کی راہ اب یاں سے کوچ ہو تو عدم میں ملے پناہ
تقصیر میری خالق عالم بحل کرے
آسان مجھ غریب کی مشکل اجل کرے

سن کر زباں سے ماں کی یہ فریاد درد خیز اس خستہ جاں کے دل پہ چلی غم کی تیغ تیز
عالم یہ تھا قریب کہ آنکھیں ہوں اشک ریز لیکن ہزار ضبط سے رونے سے کی گریز
سوچا یہی کہ جان سے بیکس گزر نہ جائے
ناشاد ہم کو دیکھ کے ماں اور مر نہ جائے

پھر عرض کی یہ مادر ناشاد کے حضور
مایوس کیوں ہیں آپ الم کا ہے کیوں وفور
صدمہ یہ شاق عالم پیری میں ہے ضرور
لیکن نہ دل سے کیجیے صبر و قرار دور
شاید خزاں سے شکل عیاں ہو بہار کی
کچھ مصلحت اسی میں ہو پروردگار کی

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور و شر
ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سر بسر
اسباب ظاہری میں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اسے ہے کوئی جانتا نہیں

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار
تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوز دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اجڑ گئے

ماں باپ منہ ہی دیکھتے تھے جن کا ہر گھڑی
قائم تھیں جن کے دم سے امیدیں بڑی بڑی
دامن پہ جن کے گرد بھی اڑ کر نہیں پڑی
ماری نہ جن کو خواب میں بھی پھول کی چھڑی
محروم جب وہ گل ہوئے رنگ حیات سے
ان کو جلا کے خاک کیا اپنے ہات سے

کہتے تھے لوگ دیکھ کے ماں باپ کا ملال
ان بے کسوں کی جان کا بچنا ہے اب محال
ہے کبریا کی شان گزرتے ہی ماہ و سال
خود دل سے درد ہجر کا مٹتا گیا خیال
ہاں کچھ دنوں تو نوحہ و ماتم ہوا کیا
آخر کو رو کے بیٹھ رہے اور کیا کیا

Scanned by CamScanner

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار   کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انساں گناہ گار   یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار
انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امر رضا میں جو خم رہے

اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام   بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام   قائم امید ہی سے ہے دنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج و بلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں کسی کو خبر نہیں

اکثر ریاض کرتے ہیں پھولوں پہ باغباں   ہے دن کی دھوپ رات کی شبنم انہیں گراں
لیکن جو رنگ باغ بدلتا ہے ناگہاں   وہ گل ہزار پردوں میں جاتے ہیں رائگاں
رکھتے ہیں جو عزیز انہیں اپنی جاں کی طرح
ملتے ہیں دست یاس وہ برگ خزاں کی طرح

لیکن جو پھول کھلتے ہیں صحرا میں بے شمار   موقوف کچھ ریاض پہ ان کی نہیں بہار
دیکھو یہ قدرت چمن آرائے روزگار   وہ ابر و باد و برف میں رہتے ہیں برقرار
ہوتا ہے ان پہ فضل جو رب کریم کا
موج سموم بنتی ہے جھونکا نسیم کا

اپنی نگاہ ہے کرم کارساز پر   صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر   رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامان دشت دامن مادر سے کم نہیں

ماں کا جواب

یہ گفتگو ذرا نہ ہوئی ماں پہ کارگر   ہنس کر وفورِ یاس سے لڑکے پہ کی نظر
چہرے پہ یوں ہنسی کا نمایاں ہوا اثر   جس طرح چاندنی کا ہو شمشان میں گذر
پنہاں جو بیکسی تھی وہ چہرے پہ چھا گئی
جو دل کی مُردنی تھی نگاہوں میں آ گئی

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستان — لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان — بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گمان
اِس درد کا شریک تمہارا جگر نہیں
کچھ مامتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں

آخر ہے عمر، ہے یہ مرا وقتِ واپسیں — کیا اعتبار آج ہوں دنیا میں کل نہیں
لیکن وہ دن بھی آئے گا اس دل کو ہے یقیں — سوچو گے جب کہ روتی تھی کیوں مادرِ حزیں
اولاد جب کبھی تمہیں صورت دکھائے گی
فریاد اس غریب کی تب یاد آئے گی

اِن آنسوؤں کی قدر تمہیں کچھ ابھی نہیں — باتوں سے جو بجھے یہ وہ دل لگی نہیں
لیکن تمہیں ہو رنج یہ میری خوشی نہیں — جاؤ سدھارو خوش رہو میں روکتی نہیں
دنیا میں بے حیائی سے زندہ رہوں گی میں
پالا ہے میں نے تم کو تو دکھ بھی سہوں گی میں

نشتر تھے رام کے لیے یہ حرفِ آرزو — دل ہل گیا سرکنے لگا جسم سے لہو
سمجھے جو ماں کے دین کو ایمان و آبرو — سننی پڑے اُسے یہ خجالت کی گفتگو
کچھ بھی جواب بن نہ پڑا فکر و غور سے
قدموں پہ ماں کے گر پڑے آنسو کے طور سے

طوفان آنسوؤں کا زباں سے ہوا نہ بند — رک رک کے اس طرح ہوا گویا وہ دردمند
پہنچی ہے مجھ سے آپ کے دل کو اگر گزند — مرنا مجھے قبول ہے جینا نہیں پسند
جو بے وفا ہے مادرِ ناشاد کے لیے
دوزخ یہ زندگی ہے اُس اولاد کے لیے

ہے دور اس غلام سے خود رائی کا خیال — ایسا گمان بھی ہو یہ میری نہیں مجال
گر سو برس بھی عمر کو میری نہ ہو زوال — جو دَین آپ کا ہے ادا ہو یہ ہے محال
جاتا کہیں نہ چھوڑ کے قدموں کو آپ کے
مجبور کر دیا مجھے وعدہ نے باپ کے

آرام زندگی کا دکھاتا ہے سبز باغ   لیکن بہارِ عیش کا مجھ کو نہیں دماغ
کہتے ہیں جس کو دھرم وہ دنیا کا ہے چراغ   ہٹ جاؤں اس روش سے تو کل میں لگے کا داغ
بے آبرو یہ بنس نہ ہو یہ ہراس ہے
جس گود میں پلا ہوں مجھے اس کا پاس ہے

بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں   کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہوں گا میں
کیوں کر زبانِ غیر کے طعنے سہوں گا میں   دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کہوں گا میں
لڑکے نے بے حیائی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا باپ کا کہنا نہیں کیا

تاثیر کا طلسم تھا معصوم کا خطاب   خود ماں کے دل کو چوٹ لگی سن کے یہ جواب
غم کی گھٹا سے ہٹ گئی تاریکیِ عتاب   چھاتی بھر آئی ضبط کی باقی رہی نہ تاب
سرکا کے پاؤں گود میں سر کو اٹھا لیا
سینے سے اپنے لختِ جگر کو لگا لیا

دونوں کے دل بھر آئے ہوا اور ہی سماں   گنگ و جمن کی طرح سے آنسو ہوئے رواں
ہر آنکھ کو نصیب یہ اشکِ وفا کہاں   ان آنسوؤں کا مول اگر ہے تو نقدِ جاں
ہوتی ہے اِن کی قدر فقط دل کے راج میں
ایسا گہر نہ تھا کوئی دسرت کے تاج میں

خاک ہند

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے   دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے
تیرے جبیں سے نور حسن ازل عیاں ہے   اللہ رے زیب و زینت کیا اوج عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پر ضیا کی
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیا کی

اس خاک دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری   چین و عرب میں جن سے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری   چشم و چراغ عالم تھی سر زمیں ہماری
شمع ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہر دانش اس وادی کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سوربیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے اب تک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں اب تک ان کا لہو رواں ہے
اب تک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوس گوش اب تک کیفیت اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ اب تک
شوکت سے بہہ رہا ہے دریائے گنگ اب تک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں
کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں
پستی سی آ گئی ہے پر دل کے حوصلوں میں
گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن وہی ہے خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستان ہمارا
علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش وطرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

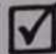
اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے
بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے
اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے دکھا دے
حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک
رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہم کو نور سحر وطن کا آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو

عروس حب وطن

آ اے عروسِ حبِ وطن! میرے بریں تو آنکھیں تری تلاش میں ہیں محو جستجو
آ اے نگار؛ تجھ کو گلے سے لگاؤں میں آ مجھ سے ہم کنار ہوا اے شوخ خوب رو!
وہ دن خدا کرے کہ مناؤں شب وصال گردن ہو تیری اور میرے دستِ آرزو
زانو ہو تیرا اور سرِ شوریدہ ہو مرا میرا مشامِ جاں ہو، تری زلف مشک بو
تیری شراب عشق کا آنکھوں میں ہو سرور خلوت میں ہو ذکرِ مے و شیشۂ و سبو
لپٹوں جو بے خودی میں میں تجھ سے شب وصال بانہیں ترے گلے میں ہوں، لب پر یہ گفتگو
ٹوٹیں وہ پانو، جن کو نہ تیری تلاش ہو پھوٹے وہ آنکھ، جس کو نہ ہو تیری جستجو
وہ گھر ہو بے چراغ، جہاں تیری ضو نہ ہو وہ دل ہو داغ، جس میں نہ ہو تیری آرزو
دنیا و آخرت میں نہ انجام ہو بہ خیر تیرے سوا جو غیر کی ہو مجھ کو جستجو
جوروں پہ میں مروں تو جہنم نصیب ہو کافر ہوں میں، جو مجھ کو بتوں کی ہو آرزو
ناقوس اور اذاں میں نہیں قید کفر و دیں اس کے لیے، کہ جس کا پرستش کدہ ہے تو
گنگا نہائے شیخ اگر تیرا اذن ہو تیرا اشارہ ہو تو برہمن کرے وضو
تیرا طریقِ عشق ہی ایمان ہے مرا تیرے فدائیوں میں ہوں اے شوخ خوب رو
جلوہ نہ ہو کسی بتِ رعنا کا سامنے
وہ دن خدا کرے کہ ہو آنکھوں میں تو ہی تو



ترجمان حقیقت

علامہ اقبال

(1877ء-1938ء)

- نام شیخ محمد اقبال تھا اور تخلص اقبال۔
- اقبال 9/نومبر جمعہ کے دن 1877ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔
- اقبال کا انتقال 21/اپریل 1938ء کو لاہور میں ہوا۔
- مزارِ اقبال حضوری باغ کے قریب شاہی مسجد کے جنوب مشرقی مینار کے سایہ میں واقع ہے۔
- اقبال کے والد کا نام شیخ نور محمد، والدہ کا نام امام بی بی اور دادا کا نام شیخ رفیق تھا۔
- اقبال کا تعلق کشمیری پنڈتوں سے تھا۔
- اقبال کے جد اعلیٰ بابا صالح تھے جنہوں نے سترہویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کیا تھا۔
- اقبال نے ابوعبداللہ مولانا غلام حسن کے مکتب ''عمر شاہ'' اور مولانا میر حسن کی خواہش پر ان کے مکتب حسام الدین میں ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔
- اقبال نے اسکاچ مشن اسکول سیال کوٹ میں 1883ء میں داخلہ لیا تھا۔
- اقبال نے میٹرک کا امتحان 1893ء میں درجۂ اول سے پاس کیا تھا۔
- 1893ء میں 3/مئی کو اقبال کی پہلی شادی گجرات (پنجاب) کے سول سرجن خاں بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی تھی جس سے آفتاب اقبال اور معراج بیگم پیدا ہوئے۔
- اقبال نے 1895ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان سکینڈ ڈویژن سے پاس کیا تھا۔
- اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے 1897ء میں سکینڈ ڈویژن سے پاس کیا تھا۔ اور عربی اور انگریزی میں اول آنے کی وجہ سے دو طلائی تمغے حاصل کیے تھے۔
- اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے (فلسفہ) تیسرے درجے میں 1899ء میں پاس کیا تھا اور یہیں اقبال کو فلسفے کے پروفیسر، پروفیسر آرنلڈ سے شاگردی کا موقع ملا تھا۔ اور انھیں سے سب سے زیادہ استفادہ کیا تھا۔
- پروفیسر آرنلڈ کی ہی یاد میں اقبال نے نظم نالۂ فراق لکھی تھی۔
- اقبال چھ ماہ تک اورینٹل کالج لاہور میں عربک ریڈر رہے پھر 1904ء تک گورنمنٹ کالج لاہور

میں انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے اور وہیں یورپ جانے سے پہلے تک یعنی 1905 تک فلسفہ بھی پڑھایا۔

- اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے یورپ 1905ء میں گئے تھے اور ٹرنٹی کالج کیمبرج میں داخلہ لیا تھا۔
- اقبال نے ''Devolepment of Mata Physics in Persia'' (انگریزی میں مقالہ) یعنی ''ایران میں مابعد الطبعیات کا ارتقا'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے میونخ یونیورٹی (جرمنی) میں 1907ء میں داخلہ لیا تھا۔ جس پر انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔
- اقبال نے بیرسٹری کی ڈگری لنکران سے 1908ء میں حاصل کی تھی۔ اسی سال اقبال کا مقالہ انگریزی میں شائع ہوا تھا۔
- اقبال نے دوسری شادی سردار بیگم سے 1910ء میں کی تھی جن سے جاوید اقبال اور منیرہ بانو پیدا ہوئے۔
- اقبال نے تیسری شادی 1913ء میں مختار بیگم سے کی تھی۔
- اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں 1931ء میں شریک ہوئے تھے۔
- اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں 1932ء میں شریک ہوئے تھے۔
- اقبال نے اعلیٰ حضرت نادر شاہ افغانستان کی دعوت پر سید سلیمان ندوی، سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا سفر 1933ء میں کیا تھا۔
- اقبال انجمن حمایت اسلام کے صدر 1934ء میں منتخب ہوئے تھے۔
- اقبال انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے رکن 1910ء میں منتخب ہوئے تھے۔
- اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے جس سالانہ جلسے میں نظم ''نغمۂ سرمدی'' پڑھی وہ جلسے میں آخری شرکت تھی۔
- اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا لیکن اقبال کی نظموں کی تعداد غزلوں سے زیادہ ہے۔
- اقبال نے سب سے پہلے ارشد گرگانوی پھر اس کے بعد نواب مرزا داغ سے اصلاح لی تھی۔
- ارشد گرگانوی نے اقبال کے شہرۂ آفاق بننے کی پیشین گوئی کی تھی۔
- اقبال نے داغ سے بذریعۂ ڈاک اصلاح لی اور ان سے اوروں کی طرح غائبانہ تلمذ رکھا۔
- داغ اقبال کے استاد ہونے پر فخر کرتے تھے۔
- ''ہمالہ'' اقبال کی پہلی مطبوعہ نظم ہے جو مخزن لاہور کے پہلے شمارے میں ''کوہستان ہمالہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور بانگ درا میں ''ہمالہ'' کے عنوان سے شامل کی گئی ہے۔
- اس سے قبل اقبال نے ''فلاح قوم'' (انجمن کشمیری مسلمان کے مشاعرے میں 1896ء میں)

نالہ یتیم (انجمن حمایت اسلام کے پندرہویں سالانہ جلسے میں 1900ء میں) اور ’’دردِ دل یا یتیم کا خطاب ہلال عید سے‘‘ (انجمن حمایت اسلام کے سولہویں سالانہ جلسے میں 1901ء میں) پڑھی تھی۔

- اقبال نے یورپ میں قیام کے دوران 1907ء میں نظم ’’طلبہ علی گڑھ کے نام‘‘، لکھی۔ جس میں اقبال نے پہلی مرتبہ قوم کے نوجوانوں کو مخاطب کیا۔ اور اسی نظم سے اقبال کے فلسفے کی بنیاد پڑی۔
- یورپ کے قیام کے دوران اقبال کے خیالات میں جو تبدیلی آئی اس کا احساس نظم ’’عبدالقادر کے نام‘‘ میں ہوتا ہے۔ یہ نظم انہوں نے 1908ء میں اپنے دوست سر عبدالقادر کے نام لکھی تھی۔
- حالی نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں تصویر درد کے شعر کو پسند کر کے اقبال کو دس روپے کا نوٹ دیا تھا۔
- بانگ درا کا دیباچہ عبدالقادر مدیر مخزن نے تحریر کیا ہے۔
- اقبال نے شاعری ترک کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا مگر شیخ عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ کے کہنے پر اس ارادے سے باز آگئے تھے۔
- اقبال کے فلسفہ خودی پر فارسی شاعر مولانا روم کے اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔
- جاوید نامہ میں اقبال نے رومی کے ساتھ افلاک کی سیر کی ہے۔
- اقبال نے انگریزی حکومت سے ’’سر‘‘ کا خطاب اس شرط پر قبول کیا تھا کہ پہلے ان کے استاد میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے۔ اس طرح میر حسن کو ’’شمس العلما‘‘ کا خطاب ملا تھا۔
- اقبال کا مرد مومن نطشے کے سپرمین سے مشابہت رکھتا ہے۔
- ہندوستان میں کلکتہ یونیورسٹی نے پہلی بار ’’اقبال چیئر‘‘ قائم کی تھی۔
- اقبال نے سر راس مسعود کی دعوت پر 1935ء میں بھوپال کا سفر کیا تھا۔ اور نواب بھوپال نے راس مسعود کی تجویز پر اقبال کے لیے وظیفہ مقرر کیا تھا۔
- اقبال کے یہاں خودی، جہد مسلسل اور تصور زمان و مکان کا فلسفہ بے حد اہم ہے۔
- اقبال نے اپنے کلام میں صنعت تلمیح کا استعمال کثرت سے کیا ہے۔
- اقبال کے کلام میں ’’شاہین‘‘، فقر و استغنا کا استعارہ ہے۔
- ہندوپاک میں اقبال کی صد سالہ تقریبات 1977ء میں منعقد ہوئی تھیں۔
- اردو غزل کی روایت میں اقبال کی غزل نئے تجربے کا حکم رکھتی ہے۔
- اقبال کی نظمیں عموماً پیغام سے مملو (بھری ہوئی) ہوتی ہیں۔

اعزازات وخطابات

- انجمن حمایت اسلام کے سترہویں جلسے میں صدر جلسہ میاں نظام الدین نے اقبال کو "ملک الشعرا" کا خطاب 23 رفروری 1901ء میں دیا تھا۔
- انگریزی گورنمنٹ نے اقبال کو 1923ء میں "سر" کا خطاب عطا کیا تھا۔
- اقبال نے 24 رجنوری 1923ء میں مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر کے نام لکھے خط میں "سر" کے خطاب سے متعلق لکھا ہے کہ "سرکار نے میرے خطاب کے متعلق جو کچھ سنا ہے صحیح ہے۔ یہ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔"
- شاعر مشرق
- علامہ اقبال کو میونخ یونیورسٹی (جرمنی) نے پی ایچ ڈی کی ڈگری (1908ء) میں۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری 1929ء میں، پنجاب یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری 1933ء میں، ڈھاکہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری 1936ء میں، الٰہ آباد یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری 1937ء میں اور عثمانیہ یونیورسٹی نے ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری 1938ء میں عطا کی تھی۔

اقبال سے متعلق مختلف آرا و خیالات

- اقبال کی نظموں کا شباب اقبال کی غزلوں کی شراب میں ڈوبا ہوا ہے۔ (رشید احمد صدیقی)
- حالی ماضی کے، اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے شاعر ہیں۔ (رشید احمد صدیقی)
- اکبر مبصر، حالی معلم اور اقبال مجاہد ہیں۔ (رشید احمد صدیقی)
- اقبال نے غزل کی بزمیہ کو رزمیہ کے درجہ تک پہنچا دیا۔ انہوں نے غزل کو محفل سماع اور بزم ماتم سے نکال کر مجاہدوں کی صف اور دانشوروں کے حلقے میں پہنچا دیا۔

(رشید احمد صدیقی)

- اقبال اور جوش میں وہی فرق ہے جو ایک مفکر اور ڈھنڈورچی میں ہوتا ہے۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

- اقبال غالب کے معنوی فرزند ہیں۔ (مالک رام)
- اقبال کے روپ میں غالب نے دوبارہ جنم لیا۔ (عبدالقادر)
- عبدالماجد دریابادی نے اقبال کو "امام العصر" کہا ہے۔

- میر آزاد بلگرامی نے اقبال کو "حسان الہند" کہا ہے۔
- این میری شمل نے اقبال کو جرمنی کا "معنوی فرزند" قرار دیا ہے۔
- اختر حسین رائے پوری نے اقبال کو فاشسٹ شاعر کہا ہے۔
- یہ (اقبال) مجھ کو ٹیگور اور شیکسپیئر سے کئی فٹ اونچا نظر آتا ہے۔ (خواجہ حسن نظامی)
- نذیر احمد نے علامہ اقبال کے متعلق لکھا ہے کہ میں نے انیس و دبیر کے کئی مرثیے سنے ہیں لیکن دل سوز نظم کبھی نہیں سنی۔
- اقبال انسانیت کو فطرت کا محبوب ترین جوہر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں فطرت ہستی خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہے۔ ان کا فلسفۂ حیات زندگی اور موت دونوں کا ایک بلند تصور رکھتا ہے۔ (آل احمد سرور)

اقبال کی داخل نصاب نظمیں

لالۂ صحرا

- لالۂ صحرا بال جبریل میں شامل ہے۔
- لالۂ صحرا ایک علامتی نظم ہے۔
- لالۂ صحرا کائنات کی وسعتوں میں انسان کی تنہائی اور کارفرمائی کی علامت ہے۔

یہ گنبدِ مینائی، یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی

بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی

خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی!

تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبۂ پیدائی، اک لذتِ یکتائی!

غواص محبت کا اللہ نگہباں ہو
ہر قطرۂ دریا میں دریا کی ہے گہرائی

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

ہے گرمیِ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

اے بادِ بیابانی! مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی، سرمستی و رعنائی

شعاعِ امید

- شعاعِ امید ضربِ کلیم میں شامل ہے۔
- شعاعِ امید تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں کرنوں سے سورج کا خطاب ہے۔ دوسرے حصے میں کرنوں پر خطاب کا اثر دکھایا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں شعاعِ آفتاب کہتی ہے کہ وہ اس وقت تک چمکتی رہے گی جب تک پورا مشرق اور سارا عالم روشن نہ ہو جائے۔

(1)

سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز، کبھی صبح کبھی شام
مدت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہری ایام
نے ریت کے ذروں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(2)

آفاق کے ہر گوشے سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے، مغرب میں اجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذتِ نظارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب! نہ کر ہم کو فراموش

(3)

اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ، صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزۂ دُرناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحر پر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بت خانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر!

ساقی نامہ

- ساقی نامہ بھی بال جبرئیل میں شامل ہے۔
- ساقی نامہ بال جبرئیل کی سب سے مشہور و مقبول نظم ہے جو مثنوی سحرالبیان کے طرز اور اسی کی بحر میں لکھی گئی ہے۔

ہوا خیمہ زن کاروان بہار
ارم بن گیا دامن کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہید ازل لالہ خونیں کفن
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی
اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی
رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ
ذرا دیکھ اے ساقی لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصل گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات
وہ مے جس سے ہے مستی کائنات
وہ مے جس میں ہے سوز و ساز ازل
وہ مے جس سے کھلتا ہے راز ازل
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
ہوا اس طرح فاش راز فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ باز فرنگ
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بے زار ہے
گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
دل طور سینا و فاران دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش
مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش
تمدن تصوف شریعت کلام
بتان عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی | یہ امت روایات میں کھو گئی
لبھاتا ہے دل کو کلام خطیب | مگر لذت شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا | لغت کے بکھیڑوں میں الجھا ہوا
وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد | محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا | یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شراب کہن پھر پلا ساقیا | وہی جام گردش میں لا ساقیا
مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا | مری خاک جگنو بنا کر اڑا
خرد کو غلامی سے آزاد کر | جوانوں کو پیروں کا استاد کر
ہری شاخ ملت ترے نم سے ہے | نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے | دل مرتضیٰ سوز صدیق دے
جگر سے وہی تیر پھر پار کر | تمنا کو سینوں میں بیدار کر
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر | زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے | مرا عشق میری نظر بخش دے
مری ناؤ گرداب سے پار کر | یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بتا مجھ کو اسرار مرگ و حیات | کہ تیری نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں | مرے دل کی پوشیدہ بیتابیاں
مرے نالۂ نیم شب کا نیاز | مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری آرزوئیں مری | امیدیں مری جستجوئیں مری
مری فطرت آئینۂ روزگار | غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل مری رزم گاہ حیات | گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات
یہی کچھ ہے ساقی متاع فقیر | اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

دما دم رواں ہے یم زندگی | ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود — کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل — خوش آئی اسے محنت آب و گل
یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی — عناصر کے پھندوں سے بے زار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
یہ عالم یہ بت خانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور — کہیں اس کے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جرہ ہے شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریب نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروان وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوق پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے — تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہان مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاق دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کوہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے
سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات — ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس — ازل سے ابد تک رم یک نفس

زمانہ کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دما دم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں
یہ بے رنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب

وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

خودی فال محمود سے درگزر
خودی پر نگہ رکھ ایازی نہ کر

وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت

یہ عالم یہ بتخانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاک داں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخئ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصد گردش روزگار ‌ ‌ کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار
تو ہے فاتح عالم خوب و زشت ‌ ‌ تجھے کیا بتاؤں تری سر نوشت
حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ ‌ ‌ حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس ‌ ‌ مگر تاب گفتار رکھتی ہے بس
اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

ذوق وشوق

(ان اشعار میں سے اکثر فلسطین میں لکھے گئے)

- دریغ آمد زآں ہمہ بوبوستاں
تہی دست رفتم سوئے دوستاں
اس فارسی شعر سے اقبال نے نظم ذوق وشوق کا آغاز کیا ہے۔
- ذوق وشوق بھی بال جبریئل میں شامل ہے۔
- ذوق وشوق کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے ہیں۔

"دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں ‌ ‌ تہی دست رفتن سوئے دوستاں"

قلب ونظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں ‌ ‌ چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں!
حسن ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود ‌ ‌ دل کے لیے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں!
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب! ‌ ‌ کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں!
گرد سے پاک ہے ہوا برگ نخیل دھل گئے ‌ ‌ ریگ نواح کاظمہ نرم ہے مثل پرنیاں
آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر ‌ ‌ کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی ‌ ‌ اہل فراق کے لیے عیش دوام ہے یہی
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیے مئے حیات ‌ ‌ کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات!
کیا نہیں اور غزنوی کارگہ حیات میں ‌ ‌ بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہل حرم کے سومنات!
ذکر عرب کے سوز میں، فکر عجم کے ساز میں ‌ ‌ نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق!
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق!

آیۂ کائنات کا معنیٔ دیر یاب تو!
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو!

جلوتیان مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
جلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو!

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!

باد صبا کی موج سے نشو و نمائے خار و خس!
میرے نفس کی موج سے نشو و نمائے آرزو!

خون دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو!

''فرصت کشمکش میں ایں دل بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تابدار را''

لوح بھی تو، قلم بھی تو، تیرا وجود الکتاب!
گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرۂ ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب!

شوکت سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود!
فقر جنیدؒ و بایزیدؒ تیرا جمال بے نقاب!

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!

تیری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل، غیاب و جستجو! عشق، حضور و اضطراب!

تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے!
طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے!

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیل بے رطب!

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا!
عشق تمام مصطفیٰ! عقل تمام بولہب!

گاہ بحیلہ می برد، گاہ بزور می کشد
عشق کی ابتدا عجب عشق کی انتہا عجب!

عالم سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگ آرزو! ہجر میں لذت طلب!

عین وصال میں مجھے حوصلہ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب!

گرمیٔ آرزو فراق! شورش ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرے کی آبرو فراق!

لینن (خدا کے حضور میں)

- لینن خدا کے حضور میں بھی بال جبریل میں شامل ہے۔
- یہ نظم اقبال کے فلسفۂ حیات، مطالعۂ تاریخ اور تجزیہ سیاست کی ترجمان ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا تری آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے یا کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات

محرم نہیں فطرت کے سرود ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات

ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالق اعصار و نگارندۂ آنات

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات

جب تک میں جیا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات

گفتار کے اسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات

مشرق کے خداوند سفیدان فرنگی
مغرب کے خداوند درخشندہ فلزات

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگ مفاجات

یہ علم یہ حکمت یہ تدبر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

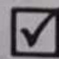
آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات

مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر روز مکافات



شاعر انقلاب

جوش ملیح آبادی

(1896ء-1982ء)

- نام شبیر حسن خان تھا اور ابتدائی تخلص شبیر جو بعد میں جوش ہو گیا۔
- جوش کے والد نے ان کا نام شبیر احمد خاں رکھا تھا لیکن جوش نے 1907 میں اپنا نام تبدیل کر کے شبیر حسن خاں رکھ لیا تھا۔
- جوش 5 دسمبر 1896 میں ملیح آباد کے محلہ مرزا گنج میں صبح چار بجے پیدا ہوئے۔
- جوش کا انتقال 22 فروری 1982 میں اسلام آباد (پاکستان) میں ہوا۔
- جوش کے والد کا نام بشیر احمد خان تھا اور والدہ کا نام بسم اللہ بیگم۔
- جوش کے دادا محمد احمد خان احمد صاحب دیوان شاعر تھے ان کا دیوان 'مخزن آلام' ہے۔
- جوش کے پردادا، فقیر محمد خان گویا ناسخ کے شاگرد تھے۔
- گویا کا مجموعہ کلام 'دیوان گویا' ہے۔ گویا نے 'انوار سہیلی کا ایک ملخص ترجمہ اردو نثر میں 'دبستان حکمت' کے نام سے پیش کیا ہے۔
- جوش کی تعلیم سیتا پور، لکھنؤ، علی گڑھ اور آگرہ میں ہوئی۔
- جوش کے درسی استاد قدرت اللہ بیگ، نیاز علی خان، ماسٹر طاہر، ماسٹر گومتی پرشاد اور امراؤ جان ادا کے مصنف مرزا محمد ہادی رسوا تھے۔
- جوش نے شانتی نکیتن میں داخلہ 1918 میں لیا تھا جہاں جوش کی ملاقات ٹیگور سے ہوئی تھی۔ (چھ ماہ قیام)
- جوش نے نو سال کی عمر میں شاعری شروع کی اور پہلا شعر کہا کہ:

  شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
  یہ میرا فنِ خاندانی ہے

- جوش نے شاعری کی ابتدا غزلوں سے کی تھی۔
- جوش نے اپنے والد بشیر احمد خان کے مشورے پر 13-1912 میں مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی کی شاعری میں شاگردی اختیار کی تھی۔

- جوش کے معنوی اساتذہ: حافظ، نظیری، خیام، انیس، نظیر اکبرآبادی، غالب، اقبال، ٹیگور
- جوش نے 1914 میں سلیم پانی پتی کے کہنے پر نظم گوئی شروع کی اور اپنی پہلی نظم 'ہلال محرم' لکھی۔
- جوش کے والد نے محمد مقیم خان کی بیٹی اشرف جہاں سے جوش کا نکاح 1907 میں کیا تھا۔
- جوش حصول ملازمت کی غرض سے اقبال، عبدالماجد دریابادی، اکبرالہ آبادی، سلیمان ندوی کے سفارشی خطوط کے ساتھ 1924 میں حیدرآباد گئے تھے اور دس سال قیام کیا تھا۔
- جوش دارالترجمہ حیدرآباد میں ناظر ادب کے عہدے پر 1925 میں فائز ہوئے تھے۔
- جوش نے حیدرآباد 1934 میں چھوڑا تھا۔
- جوش یکم جنوری 1957 میں ترک سکونت کرکے پاکستان چلے گئے تھے۔
- جوش نے گاندھی جی کو 'ہند کے شاہ شہیداں' کہا ہے اوران کی شان میں ایک نظم بھی لکھی ہے۔
- جوش نے 1936 میں دہلی سے ماہنامہ 'کلیم' جاری کیا تھا۔
- جوش سرکاری رسالہ 'آجکل' کے مدیر 1948 سے 1955 تک رہے۔
- جوش نے اپنی سرپرستی میں دہلی سے ماہنامہ 'شعلہ و شبنم' 1905 میں جاری کیا تھا جس کے مدیران کے بیٹے سجاد حیدر اور بھانجے اظہار ملیح آبادی تھے۔
- جوش نے پاکستان چلے جانے کے بعد ترقی اردو بورڈ کے رسالے 'اردو نامہ' کی بھی ادارت فرمائی تھی۔

اعزازات والقابات

- جوش کو حکومت ہند نے 'پدم بھوشن' کے اعزاز سے 1954 میں نوازا تھا۔
- مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنے اخبار 'ہند' کلکتہ میں 1938 میں پہلی مرتبہ جوش کو 'شاعر انقلاب' لکھا تھا۔
- منشی دیانرائن نگم نے اپنے رسالہ 'زمانہ' کانپور میں 1935 میں جوش کو شاعر اعظم لکھا تھا۔
- جوش کے استاد عزیز لکھنوی نے جوش کو 'مصور جذبات' 1920 میں کہا تھا۔
- دیگر القاب: شاعر شباب، مصور شباب، شاعر رومان، الفاظ کے جادوگر، لفظوں کا بادشاہ، قبلۂ رندان جہاں، شاعر فطرت، شاعر جمالیات

جوش کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- جوش نے مناظر فطرت پر جس کثرت سے نظمیں لکھیں ہیں اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملے گی۔ (خلیل الرحمٰن اعظمی)

- جوش کی موت اردو نظم کے انقلابی دور کا خاتمہ ہے۔(فراق)
- جوش کے مرنے کی خبر سننے کے لیے میں کیوں زندہ رہ گیا۔ جوش کے بعد میں زندہ رہ کر کیا کیا کروں گا۔(فراق)

جوش ملیح آبادی کی داخل نصاب نظمیں

کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب — کھیتیاں میدان خاموشی غروب آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ — دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیر لب ارض و سما میں باہمی گفت و شنود — مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ — سبزۂ افسردہ پر خواب آفریں ہلکا سا رنگ

خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا — شام کی خنکی سے گویا دن کی گرمی کا گلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا — تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا
خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان — بام گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور — چرخ پر بادل زمیں پر تتلیاں سر پر طیور
پارہ پارہ ابر سرخی سرخیوں میں کچھ دھواں — بھولی بھٹکی سی زمیں کھویا ہوا سا آسماں
پتیاں مخمور کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشت کار — ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار — کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی — جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ — جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرور شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں — کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر بغل میں پھاوڑا تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

کون ہے؟ ظلمت شکن قندیل بزم آب وگل
قصر گلشن کا دریچہ سینہ گیتی کا دل

خوش نما شہروں کا بانی راز فطرت کا سراغ
خاندان تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شام زیر ارض کو صبح درخشاں کا پیام

ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذروں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا

جس کے چھو جاتے ہی مثل نازنین مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک

جس کی تابش میں درخشانی ہلال عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن امید کی

طفل باراں تاجدار خاک امیر بوستاں
ماہر آئین قدرت ناظم بزم جہاں

ناظر گل پاسبان رنگ و بو گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ

وارث اسرار فطرت فاتح امید و بیم
محرم آثار باراں واقف طبع نسیم

صبح کا فرزند خورشید زر افشاں کا علم
محنت پیہم کا پیماں سخت کوشی کی قسم

جلوۂ قدرت کا شاہد حسن فطرت کا گواہ
ماہ کا دل مہر عالم تاب کا نور نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاج صبح و شام

خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب

قلب آہن جس کے نقش پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم تیز کرنوں کا رفیق

خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہ آفتاب

لہر کھاتا ہے رگ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیل رنگ و بو

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبض خاک پر

جس کی جانکاہی سے ٹپکاتی ہے امرت نبض تاک
جس کے دم سے لالہ وگل بن کے اتراتی ہے خاک

ساز دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ
مانگتا ہے بھیک تابانی کی جس سے روئے شاہ

خون جس کا دوڑتا ہے نبض استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں

جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمین

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں

اس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر جس میں آ جاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیر غم کھاتے ہوئے دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکئ حرماں سے راہ فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منہ اترا ہوا

سیم و زر نان و نمک آب و غذا کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار جن کے آگے خنجر چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات کیا چبا ڈالے گی او کمبخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم اے حامئ امن و اماں گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
ادعائے پیروی دین و ایماں اور تو دیکھ اپنی کہنیاں جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں
کتنے طوفان تیری کشتی کے لیے بے تاب ہیں

جنگل کی شہزادی

پیوست ہے جو دل میں، وہ تیر کھینچتا ہوں اک ریل کے سفر کی تصویر کھینچتا ہوں
گاڑی میں گنگناتا مسرور جا رہا تھا اجمیر کی طرف سے جے پور جا رہا تھا
تیزی سے جنگلوں میں یوں ریل جا رہی تھی لیلیٰ ستار اپنا گویا بجا رہی تھی
خورشید چھپ رہا تھا رنگیں پہاڑیوں میں طاؤس پر سمیٹے بیٹھے تھے جھاڑیوں میں
کچھ دور پر تھا پانی، موجیں رکی ہوئی تھیں تالاب کے کنارے شاخیں جھکی ہوئی تھیں
لہروں میں کوئی جیسے دل کو ڈبو رہا تھا میں سو رہا ہوں، ایسا محسوس ہو رہا تھا
اک موجِ کیف پرور دل سے گزر رہی تھی ہر چیز دلبری سے یوں رقص کر رہی تھی

تھیں رخصتی کرن سے سب وادیاں سنہری ناگاہ چلتے چلتے جنگل میں ریل ٹھہری
کانٹوں پہ خوبصورت اک بانسری پڑی ہے دیکھا کہ ایک لڑکی میدان میں کھڑی ہے

زاہد فریب، گل رخ، کافر، دراز مژگاں
سیمیں بدن، پری رخ، نوخیز، حشر ساماں

خوش چشم، خوبصورت، خوش وضع، ماہ پیکر
نازک بدن، شکر لب، شیریں ادا، فسوں گر

کافر ادا، شگفتہ، گل پیرہن، سمن بُو
سروِ چمن، سہی قد، رنگیں جمال، خوش رو

گیسو کمند، مہ وش، کافور فام، قاتل
نظارہ سوز، دلکش، سرمست، شمعِ محفل

یہ بَن، یہ گل، یہ چشمے، مجھ سے قریب ہوتے
شاعر کے زیرِ فرماں یہ سب رقیب ہوتے

کیوں، میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے؟
اے زمزموں کی دیوی اتنی خموش کیوں ہے؟

بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے
ہاں دے لبوں کو جنبش، اے سرمدی ترانے

یوں چپ ہے، مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے
یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے

سننا تھا یہ کہ ظالم اِس طرح مسکرائی
فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دُہائی

عشوہ، جبیں پہ لے کر دل کی امنگ آیا
چہرے پہ خون دوڑا، آنکھوں میں رنگ آیا

شرما کے آنکھ اٹھائی، زلفوں پہ ہات پھیرا
اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا

چمکا دیا حیا نے ہر نقشِ دلبری کو
دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو

سُن کر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں
اُس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہوئی زبانیں

شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہات پھیرا
دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا

کچھ جسم کو چرایا، کچھ سانس کو سنبھالا
کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا

تاریک کر کے، میری آنکھوں میں اک زمانہ
جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ

ہونے لگی روانہ، ارماں نے سر جھکایا
دل کی مثال کانپا رہ رہ کے بن کا سایا

بے ہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی
اتنے میں رات لے کر قندیلِ ماہ نکلی

مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی
پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

ابرو ہلال، مے گوں، جاں بخش، روح پرور
نسریں بدن، پری رخ، سیمیں عذار، دلبر

آہو نگاہ، نورس، گلگوں، بہشت سیما
یاقوت لب، صدف گوں، شیریں، بلند بالا

غارت گرِ تحمل، دل سوز، دشمنِ جاں
پروردۂ مناظر، دوشیزۂ بیاباں

گلشن فروغ، کمسن، مخمور، ماہ پارا
''دلبر کہ در کفِ اُو موم است سنگِ خارا''

ہر بات ایک افسوں ہر سانس ایک جادو
قدسی فریب مژگاں، یزداں شکار گیسو

صحرا کی زیب و زینت، فطرت کی نورِ دیدہ
برسات کے ملائم تاروں کی آفریدہ

چہرے پہ رنگِ تمکیں، آنکھوں میں بے قراری
ایمائے سینہ کوبی، فرمانِ بادہ خواری
لوہا تپانے والی جلووں کی ضوفشانی
سکّے بٹھانے والی اٹھتی ہوئی جوانی
ڈوبے ہوئے سب اعضا حُسنِ مناسبت میں
پالی ہوئی گلوں کے آغوشِ تربیت میں
حُسنِ ازل ہے غلطاں شاداب پنکھڑی میں
یا جان پڑ گئی ہے جنگل کی تازگی میں
حوریں ہزار دل سے قربان ہو گئی ہیں
رنگینیاں سمٹ کر 'انسان' ہو گئی ہیں
چینِ ستمگری سے ناآشنا جبیں ہے
میں کون ہوں؟ یہ اُس کو معلوم ہی نہیں ہے
ہر چیز پر نگاہیں حیرت سے ڈالتی ہے
رہ رہ کے اڑنے والی چادر سنبھالتی ہے
آنچل سنبھالنے میں یوں بل سے کھا رہی ہے
گویا ٹھہر ٹھہر کر انگڑائی آ رہی ہے
کچھ دیر تک تو میں نے اُس کو بغور دیکھا
غش کھا رہی تھی عقبیٰ، چکرا رہی تھی دنیا
گاڑی سے پھر اتر کر اُس کے قریب آیا
طوفانِ بے خودی میں پھر یہ زباں سے نکلا
اے درسِ آدمیت، اے شاعری کی جنت
اے صانعِ ازل کی نازک ترین صنعت
اے روحِ صنفِ نازک، اے شمعِ بزمِ عالم
اے صبحِ روئے خنداں، اے شامِ زلفِ برہم
اے تُو کہ تیری نازک ہستی میں کام آئی
قدرت کی انتہائی تخئیلِ دلربائی
چشم و چراغ صحرا، اے نوردشت و وادی
رنگیں جمال دیوی، جنگل کی شاہزادی
بستی میں تُو جو آئے، اک حشر سا بپا ہو
آبادیوں میں ہلچل، شہروں میں غلغلہ ہو
رندانِ بادہ کش کے ہاتوں سے جام چھوٹیں
تسبیحِ شیخ الجھے، توبہ کے عزم ٹوٹیں
نظروں سے اتّقا کے رسم و رواج اتریں
زہّاد کے عمامے، شاہوں کے تاج اتریں
آنکھیں ہوں اشک افشاں، نالے شرر فشاں ہوں
کیا کیا نہ شاعروں کے ملبوس دھجیاں ہوں
شہروں کے مہ وشوں پر اک آسمان ٹوٹے
پروردۂ تمدن عشووں کی نبض چھوٹے

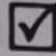
اس سادگی کے آگے نکلیں دلوں سے آہیں
جھک جائیں دلبروں کی خود ساختہ نگاہیں
تیری ادا کے آگے شرما کے منہ چھپائیں
ناپے ہوئے کرشمے، تولی ہوئی ادائیں
تیری نظر کی رَو سے ہو جائیں خستہ و گم
مشق و مزاولت کے پالے ہوئے تبسم
امن و اماں کے رخ کو بے آب و رنگ کر دے
دنیا کو حسن تیرا میدانِ جنگ کر دے
کتنی ہی قسمتوں کے بدلے فلک نوشتے
خوں اور دوستی کے کٹ جائیں کتنے رشتے
تصنیف ہوں ہزاروں چبھتے ہوئے فسانے
اِن انکھڑیوں کی زد پر کانپیں شراب خانے

تیرے پجاریوں میں میرا بھی نام ہوتا — اے کاش جنگلوں میں میرا قیام ہوتا
یہ بن، یہ گل، یہ چشمے، مجھ سے قریب ہوتے — شاعر کے زیرِ فرماں یہ سب رقیب ہوتے
کیوں، میری گفتگو سے حیرت فروش کیوں ہے؟ — اے زمزموں کی دیوی اتنی خموش کیوں ہے؟
بجنے لگیں وفا کی محفل میں شادیانے — ہاں دے لبوں کو جنبش، اے سرمدی ترانے
یوں چپ ہے، مجھ سے گویا کچھ کام ہی نہیں ہے — یہ وہ ادا ہے جس کا کچھ نام ہی نہیں ہے
سنتا تھا یہ کہ ظالم اِس طرح مسکرائی — فریاد کی نظر نے، ارماں نے دی دُہائی
عشوہ، جبیں پہ لے کر دل کی امنگ آیا — چہرے پہ خون دوڑا، آنکھوں میں رنگ آیا
شرما کے آنکھ اٹھائی، زلفوں پہ ہات پھیرا — اتنے میں رفتہ رفتہ چھانے لگا اندھیرا
چکا دیا حیا نے ہر نقشِ دلبری کو — دانتوں میں یوں دبایا چاندی کی آرسی کو
سُن کر مری مچلتی آنکھوں کی داستانیں — اُس کی نگاہ میں بھی غلطاں ہوئی زبانیں
شرما کے پھر دوبارہ زلفوں پہ ہات پھیرا — دیکھا تو چھا چکا تھا میدان پر اندھیرا
کچھ جسم کو چُرایا، کچھ سانس کو سنبھالا — کاندھے پہ نرم آنچل انگڑائی لے کے ڈالا
تاریک کر کے، میری آنکھوں میں اک زمانہ — جنگل سے سر جھکا کر ہونے لگی روانہ
ہونے لگی روانہ، ارماں نے سر جھکایا — دل کی مثال کانپا رہ رہ کے بن کا سایا
بے ہوش ہو چلا میں، سینے سے آہ نکلی — اتنے میں رات لے کر قندیلِ ماہ نکلی
مڑ کر جو میں نے دیکھا، امید مر چکی تھی — پٹری چمک رہی تھی، گاڑی گزر چکی تھی

شکستِ زنداں کا خواب

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں

کیا ان کو خبر تھی زیر و زبر رکھتے تھے جو روح ملت کو
ابلیں گے زمیں سے مار سیہ برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں دوڑو کہ وہ ٹوٹی زنجیریں



میرا جی

(1912-1949ء)

- نام محمد ثناء اللہ ثانی ڈار تھا اور تخلص پہلے 'ساحری' اور پھر 'میرا جی' ہزلیہ شاعری میں تخلص 'لندھور' آیا ہے۔
- میرا جی 25 مئی 1912 میں پیدا ہوئے۔
- میرا جی کا انتقال 3 نومبر 1949 بمبئی میں ہوا۔
- میرا جی کے والد کا نام منشی محمد مہتاب الدین تھا۔
- میرا جی کے والدہ کا نام زینب بیگم عرف سردار بیگم تھا۔
- میرا جی میٹرک پاس نہ کر سکے تھے۔
- میرا جی نے 'ادبی دنیا' لاہور میں 'بسنت سہائے' کے نام سے سیاسی مضامین لکھے تھے۔
- میرا جی نے میرا سین کو خطوط 'بشیر چند' کے نام سے لکھے تھے۔
- میرا جی نے کچھ خطوط 'وشونندن' اور 'میرا جی المعروف بندے حسن' کے نام سے بھی لکھے تھے۔
- میرا جی کو 'ادبی گاندھی' کا لقب ن م راشد نے دیا تھا۔
- میرا جی ادبی دنیا لاہور کے نائب مدیر 1938 سے 1941 تک رہے۔
- میرا جی نے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں 1942 سے 1945 تک کام کیا۔
- میرا جی نے باتیں کے عنوان سے ماہ نامہ 'ساقی' دہلی میں ادبی کالم لکھے۔
- میرا جی کی پوری شاعری کو ترقی پسندوں نے جنسی غلاظت کا ڈھیر قرار دیا ہے۔
- میرا جی نئی شاعری کے بانی تسلیم کیے جاتے ہیں۔
- میرا جی کا تعلق حلقۂ ارباب ذوق سے تھا۔

میرا جی کی داخل نصاب نظمیں

کلرک کا نغمہ محبت

سب رات مری سپنوں میں گزر جاتی ہے اور میں سوتا ہوں
پھر صبح کی دیوی آتی ہے،
اپنے بستر سے اٹھتا ہوں منہ دھوتا ہوں،

لایا تھا کل جو ڈبل روٹی
اس میں سے آدھی کھائی تھی

باقی جو بچی وہ میرا آج کا ناشتہ ہے!

دنیا کے رنگ انوکھے ہیں
جو میرے سامنے رہتا ہے اس کے گھر میں گھر والی ہے،
اور دائیں پہلو میں اک منزل کا ہے مکاں وہ خالی ہے،
اور بائیں جانب اک عیاش ہے جس کے ہاں اک داشتہ ہے؛
اور ان سب میں اک میں بھی ہوں لیکن بس تو ہی نہیں
ہیں اور تو سب آرام مجھے اک گیسوؤں کی خوشبو ہی نہیں؛
فارغ ہوتا ہوں ناشتے سے اور اپنے گھر سے نکلتا ہوں
دفتر کی راہ پر چلتا ہوں،
رستے میں شہر کی رونق ہے اک تانگہ ہے دو کاریں ہیں،
بچے مکتب کو جاتے ہیں اور تانگوں کی کیا بات کہوں؟
کاریں تو چھلتی بجلی ہیں تانگوں کے تیروں کو کیسے سہوں؛
یہ مانا ان میں شریفوں کے گھر کی دھن دولت ہے مایا ہے،
کچھ شوخ بھی ہیں معصوم بھی ہیں،
لیکن رستے پر پیدل مجھ سے بدقسمت مغموم بھی ہیں،
تانگوں پر برق تبسم ہے،

باتوں کا میٹھا ترنم ہے،
اکساتا ہے دھیان یہ رہ رہ کر قدرت کے دل میں ترحم ہے؟
ہر چیز تو ہے موجود یہاں اک تو ہی نہیں اک تو ہی نہیں،
اور میری آنکھوں میں رونے کی ہمت ہی نہیں آنسو ہی نہیں!

جوں توں رستہ کٹ جاتا ہے اور بندی خانہ آتا ہے،

چل کام میں اپنے دل کو لگا یوں کوئی مجھے سمجھاتا ہے،
میں دھیرے دھیرے دفتر میں اپنے دل کو لے جاتا ہوں
نادان ہے دل مورکھ بچہ — اک اور طرح دے جاتا ہوں،
پھر کام کا دریا بہتا ہے اور ہوش مجھے کب رہتا ہے،

جب آدھا دن ڈھل جاتا ہے تو گھر سے افسر آتا ہے
اور اپنے کمرے میں مجھ کو چپراسی سے بلواتا ہے
یوں کہتا ہے ووں کہتا ہے لیکن بے کار ہی رہتا ہے۔
میں اُس کی ایسی باتوں سے تھک جاتا ہوں تھک جاتا ہوں،
پل بھر کے لیے اپنے کمرے کو فائل لینے آتا ہوں،
اور دل میں آگ سلگتی ہے میں بھی جو کوئی افسر ہوتا
اس شہر کی دھول اور گلیوں سے کچھ دور مرا پھر گھر ہوتا۔
اور تو ہوتی!
لیکن میں تو اک منشی ہوں تو اونچے گھر کی رانی ہے
یہ میری پریم کہانی ہے اور دھرتی سے بھی پرانی ہے! (1941)

جاتری

ایک آیا، گیا، دوسرا آئے گا، دیر سے دیکھتا ہوں یوں ہی رات اس کی گزر جائے گی
میں کھڑا ہوں یہاں کس لیے مجھ کو کیا کام ہے، یاد آتا نہیں، یاد بھی ٹمٹماتا

ہوا اک دیا بن گئی، جس کی رکتی ہوئی اور جھجکتی ہوئی ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے
مگر میرے کانوں نے کیسے اسے سن لیا — ایک آندھی چلی، چل کے مٹ

بھی گئی، آج تک میرے کانوں میں موجود ہے سائیں سائیں مچلتی ہوئی اور

ابلتی ہوئی پھیلتی پھیلتی ،— دیر سے میں کھڑا ہوں یہاں ، ایک آیا ، گیا ،
دوسرا آئے گا ، رات اس کی گزر جائے گی ، ایک ہنگامہ برپا ہے دیکھیں جدھر ،
آ رہے ہیں کئی لوگ چلتے ہوئے اور ٹہلتے ہوئے اور رُکتے ہوئے پھر سے
بڑھتے ہوئے اور لپکتے ہوئے ، آ رہے جا رہے ہیں اِدھر سے ادھر اور اُدھر سے
اِدھر — جیسے دل میں مرے دھیان کی لہر سے ایک طوفان ہے ویسے آنکھیں
مری دیکھتی ہی چلی جا رہی ہیں کہ اک ٹمٹماتے دیئے کی کرن زندگی کو پھسلتے
ہوئے اور گرتے ہوئے ڈھب سے ظاہر کیے جا رہی ہے ، مجھے دھیان
آتا ہے اب تیرگی اک اجالا بنی ہے ۔ مگر اس اجالے سے رِستی چلی جا رہی
ہیں وہ امرت کی بوندیں جنہیں میں ہتھیلی پہ اپنی سنبھالے رہا ہوں ، ہتھیلی

مگر ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی تھی لپک سے اجالا ہوا ، لو گری ، پھر اندھیرا سا
چھانے لگا ، بیٹھتا بیٹھتا بیٹھ کر ایک ہی پل میں اٹھتا ہوا ، جیسے آندھی کے
تیکھے تھپیڑوں سے دروازے کے طاق کھلتے رہیں ، بند ہوتے رہیں ،
— پھڑ پھڑاتے ہوئے طائرِ زخم خوردہ کی مانند میں دیکھتا ہی رہا ایک آیا ،
گیا ،— دوسرا آئے گا ، سوچ آئی مجھے پاؤں بڑھنے سے انکار کرتے
گئے ، میں کھڑا ہی رہا ، دل میں اک بوند نے یہ کہا رات یوں ہی گزر جائے گی
دل کی اک بوند کو آنکھ میں لے کے میں دیکھتا ہی رہا ، پھڑ پھڑاتے ہوئے طائر
زخم خوردہ کی مانند دروازے کے طاق اک بار جب مل گئے مجھ کو آہستہ آہستہ
احساس ہونے لگا — اب یہ زخمی پرندہ نہ تڑپے گا لیکن مرے دل کو ہر وقت
تڑپائے گا ، میں ہتھیلی پہ اپنی سنبھالے رہوں گا وہ امرت کی بوندیں جنہیں آنکھ

سے میری رِسنا تھا ، لیکن مری زندگی ٹمٹماتا ہوا اک دیا بن گئی جس کی رُکتی ہوئی
اور جھجکتی ہوئی ہر کرن بے صدا قہقہہ ہے کہ اس تیرگی میں کوئی بات ایسی نہیں
جس کو پہلے اندھیرے میں دیکھا ہو میں نے ، سفر یہ اجالے اندھیرے کا چلتا

رہا ہے تو چلتا رہے گا یہی رسم ہے راہ کی ایک آیا ، گیا ، دوسرا

آئے گا، رات ایسے گزر جائے گی، ٹمٹماتے ستارے بتاتے تھے، رستے کی
ندی بہی جارہی ہے بہے جا، اس الجھن سے ایسے نکل جا، کوئی سیدھا منزل پہ جاتا
تھا لیکن کئی قافلے بھول جاتے تھے انجم کے دور یگانہ کے مبہم اشارے، مگر وہ
بھی چلتے ہوئے اور بڑھتے ہوئے شام سے پہلے ہی دیکھ لیتے تھے مقصود کا بند
دروازہ کھلنے لگا ہے، مگر میں کھڑا ہوں یہاں مجھ کو کیا کام ہے، میرا دروازہ
کھلتا نہیں ہے، مجھے پھیلے صحرا کی سوئی ہوئی ریگ کا ذرّہ ذرّہ یہی کہہ رہا ہے
کہ ایسے خرابے میں سوکھی ہتھیلی ہے اک ایسا تلوا کے جس کو کسی خار کی نوک چبھنے پہ بھی

کہہ نہیں سکتی مجھ کو کوئی بوند اپنے لہو کی پلا دو مگر میں کھڑا ہوں یہاں کس لیے:
کام کوئی نہیں ہے تو میں بھی ان آتے ہوئے اور جاتے ہوئے ایک دو، تین
—لاکھوں بگولوں میں مل کر یوں ہی چلتے چلتے کہیں ڈوب جاتا کہ جیسے یہاں
بہتی لہروں میں کشتی ہر ایک موج کو تھام لیتی ہے اپنی ہتھیلی کے پھیلے کنول
میں، مجھے دھیان آتا نہیں ہے کہ اس راہ میں تو ہر اک جانے والے کے بس
میں ہے منزل، میں چل دوں، چلوں— آیئے آیئے، آپ کیوں اس جگہ
ایسے چپ چاپ تنہا کھڑے ہیں، اگر آپ کہیے تو ہم اک اچھوتی سی ٹہنی سے
دو پھول— بس بس، مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میں اک
دوست کا راستہ دیکھتا ہوں؛— مگر وہ چلا بھی گیا ہے مجھے پھر بھی
تسکین آتی نہیں ہے کہ میں ایک صحرا کا باشندہ معلوم ہونے لگا ہوں خود
اپنی نظر میں، مجھے اب کوئی بند دروازہ کھلتا نظر آئے۔ یہ بات ممکن نہیں ہے

میں اک اور آندھی کا مشتاق ہوں جو مجھے اپنے پردے میں یکسر چھپالے،
مجھے اب یہ محسوس ہونے لگا ہے سہانا سماں جتنا بس میں تھا میرے
وہ سب ایک بہتا سا جھونکا بنا ہے جسے ہاتھ میرے نہیں روک سکتے
کہ میری ہتھیلی میں امرت کی بوندیں تو باقی نہیں ہیں، فقط ایک پھیلا ہوا،

خشک، بے برگ، بے رنگ صحرا ہے جس میں یہ ممکن نہیں میں کہوں
ایک آیا گیا دوسرا آئے گا رات میری گزر جائے گی (1941)

سمندر کا بلاوا

یہ سرگوشیاں کہہ رہی ہیں اب آؤ کہ برسوں سے تم کو بلاتے بلاتے مرے
دل پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
کبھی ایک پل کو کبھی ایک عرصہ صدائیں سنی ہیں مگر یہ انوکھی ندا آ رہی ہے
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ آئندہ شاید تھکے گا
''مرے پیارے بچے''— ''مجھے تم سے کتنی محبت ہے''— ''دیکھو اگر
یوں کیا تو

برا مجھ سے بڑھ کر نہ کوئی بھی ہوگا— ''خدایا، خدایا!''
کبھی ایک سسکی کبھی اک تبسم کبھی صرف تیوری
مگر یہ صدائیں تو آتی رہی ہیں
انہی سے حیات دو روزہ ابد سے ملی ہے
مگر یہ انوکھی ندا جس پہ گہری تھکن چھا رہی ہے
یہ ہر اک صدا کو مٹانے کی دھمکی دیئے جا رہی ہے

اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری
فقط کان سنتے چلے جا رہے ہیں
یہ اک گلستاں ہے— ہوا لہلہاتی ہے کلیاں چٹکتی ہیں،
غنچے مہکتے ہیں اور پھول کھلتے ہیں کھل کھل کے مُرجھا کے
گرتے ہیں، اک فرش مخمل بناتے ہیں جس پر
مری آرزوؤں کی پریاں عجب آن سے یوں رواں ہیں

کہ جیسے گلستاں ہی اک آئینہ ہے،
اسی آئینے سے ہر اک شکل نکھری سنور کر مٹی اور مٹ ہی گئی پھر نہ ابھری
یہ پربت ہے— خاموش، ساکن،
کبھی کوئی چشمہ ابلتے ہوئے پوچھتا ہے کہ اس کی چٹانوں کے اس پار کیا ہے؟

مگر مجھ کو پربت کا دامن ہی کافی ہے دامن میں وادی ہے، وادی میں ندی
ہے ندی میں بہتی ہوئی ناؤ ہی آئینہ ہے،
اسی آئینے میں ہر اک شکل نکھری مگر ایک پل میں جو مٹنے لگی ہے تو
پھر نہ ابھری

یہ صحرا ہے — پھیلا ہوا خشک، بے برگ صحرا
بگولے یہاں تند بھوتوں کا عکس مجسم بنے ہیں

مگر میں تو دور — ایک پیڑوں کے جھرمٹ پہ اپنی نگاہیں جمائے ہوئے ہوں
نہ اب کوئی صحرا، نہ پربت نہ کوئی گلستاں
اب آنکھوں میں جنبش نہ چہرے پہ کوئی تبسم نہ تیوری
فقط ایک انوکھی صدا کہہ رہی ہے کہ تم کو بلاتے بلاتے مرے دل پہ
گہری تھکن چھا رہی ہے،
بلاتے بلاتے تو کوئی نہ اب تک تھکا ہے نہ شاید تھکے گا
تو پھر یہ ندا آئینہ ہے فقط میں تھکا ہوں

نہ صحرا نہ پربت نہ کوئی گلستاں فقط اب سمندر بلاتا ہے مجھ کو
کہ ہر شے سمندر سے آئی سمندر میں جا کر ملے گی۔ (تین رنگ)



فیض احمد فیض

(1911-1984ء)

- نام فیض احمد تھا اور تخلص فیض
- فیض کی پیدائش 13 فروری 1911 میں قصبہ قادر ضلع سیال کوٹ (پاکستان) میں ہوئی۔
- فیض کا انتقال منگل 20 نومبر 1984 میں لاہور کے ایک ہوسپٹل میں ہوا۔
- فیض کے والد کا نام سلطان محمد خان تھا جن کا شمار سیال کوٹ کے مشہور بیرسٹروں میں ہوتا تھا۔
- فیض نے 1927 میں مشن ہائی اسکول سے فرسٹ ڈویژن میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔
- فیض نے 1931 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے آنرز عربی میں کیا۔
- فیض کالج کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگے تھے۔ کالج میگزین 'راوی' میں فیض کی متعدد نظمیں بھی شائع ہوئیں جن میں سے بعض ان کے پہلے مجموعہ کلام 'نقش فریادی' میں شامل ہیں۔
- فیض کا تقرر بحیثیت لیکچرار امرتسر کے ایم اے او کالج میں 1935 میں ہوا۔
- فیض نے ماہ نامہ 'ادب لطیف' کی ادارت 1938 میں سنبھالی۔
- فیض لاہور کے ہیلی کالج میں انگریزی کے استاد 1940 میں ہوئے۔
- فیض نے ایم اے انگریزی میں کیا تھا۔
- فیض نے ایک انگریز خاتون ایلیس جارج کو مسلمان بنا کر کلثوم نام رکھا اور 1941 میں ان سے نکاح کیا۔
- فیض کا نکاح شیخ عبداللہ نے پڑھایا۔
- فیض کا تقرر فوج میں کیپٹن کے عہدے پر 1941 میں ہوا۔
- فیض 1943 میں میجر اور 1944 میں کرنل کے عہدے پر فائز ہوئے۔
- فیض نے 1947 میں فوج سے استعفیٰ دے کر 'پاکستان ٹائمز' اور 'امروز' کی ادارت سنبھالی۔
- 9 مارچ 1951 میں لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی سازش میں فیض کو گرفتار کیا گیا۔
- فیض یکم اپریل 1955 میں قید سے رہا ہوئے۔
- فیض کو دوبارہ 1958 میں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔
- اسی زمانے میں ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی پہلی کانفرنس تاشقند میں ہوئی جس میں فیض نے ترقی پسند تحریک کے لیڈر کی حیثیت سے شرکت کی۔

- فیض کو بین الاقوامی لینن انعام سے 1926 میں نوازا گیا۔
- فیض نے انگلستان، روس، الجریا، مصر، لبنان اور ہنگری کا سفر 1964 میں کیا۔
- فیض افروایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے نمائندہ اخبار 'لوٹس' کے مدیر 1972 میں مقرر ہوئے۔
- فیض پر راولپنڈی سازش کا مقدمہ چلا تھا۔

فیض کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- فیض کی شاعری رومان اور انقلاب کا حسین سنگم ہے۔ (ن۔م۔راشد)
- نقش فریادی کی روشنی میں فیض کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ن۔م۔ راشد نے کہا تھا کہ "فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں صرف احساسات کا شاعر ہے۔"
- فیض احمد فیض ترقی پسندوں کے میر تقی میر تھے۔ (مجروح سلطانپوری)
- عہد حاضر کے شاعروں میں فیض تنہا شاعر ہے جو اپنے تصورات سے خالص حسن نما ایک دلکش بہشت پیدا کرنا چاہتا ہے، لیکن جس نے حسن اور رومان کے سنہری پردوں کے اس پار حقیقت کی ایک جھلک بھی دیکھ لی ہے۔ (ن م راشد)
- فیض کی شاعری میں انگریزی ادب کے ایک خوشگوار اثر، جدید انسان کے ذہن، اور ایشیائی تہذیب کے قابل قدر عناصر کی ایک قوس قزح جلوہ گر ہے۔ (آل احمد سرور)
- فیض کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کے خیالات کی سنجیدگی، شخصیت کا توازن اور شعری اعتدال ہے۔ (جمیل جالبی)
- فیض نے ایک نیا مدرسۂ شاعری قائم کیا۔ انھوں نے جس بصیرت افروز احساس، خلوص و فنکارانہ چابک دستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز تھی اور قابل قدر تھی۔ (فراق)
- ن۔م۔راشد نے فیض کے مجموعۂ کلام نقشِ فریادی کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔ یہ ایک شاعر کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پر کھڑا ہے۔

فیض کی داخل نصاب نظمیں

تنہائی

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

صبحِ آزادی

(اگست 1947)

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل
جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیار حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصال منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذاب ہجر حرام

جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں

کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے

جا بہ جا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ



اختر الایمان

(1915-1996ء)

- نام محمد اختر الایمان تھا اور تخلص انجم (1941 تک)
- اختر الایمان 1915 میں نجیب آباد ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔
- اختر الایمان کا انتقال 9 مارچ 1996 میں ممبئی میں ہوا۔
- اختر الایمان نے 1937 میں فتح پوری سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔
- اختر الایمان نے اینگلو عربک کالج (ذاکر حسین کالج) سے گریجویشن 1942 میں پاس کیا تھا۔
- کالج میگزین میں ایک یک بابی ڈراما، 7 افسانے اور 11 نظمیں تین مختلف ناموں محمد اختر ایمان انجم، محمد اختر الایمان اور صرف اختر الایمان سے شائع ہوئیں۔
- اختر الایمان نے گریجویشن کے بعد 1942 میں ساغر نظامی کی خواہش پر چار ماہ 'ماہنامہ ایشیا' میرٹھ کی ادارت کی تھی۔
- اختر الایمان کی دو شادیاں ہوئی تھیں پہلی شادی والدہ نے سلیمن سے 1939 میں کرادی تھی اور طلاق کے بعد دوسری شادی 1947 میں سلطانہ سے ہوئی تھی۔
- اختر الایمان بھورے بالوں والے اشفاق کی شاعری سن کر شاعری کی طرف متوجہ ہوئے اور غزل گوئی سے اپنے شاعری کی ابتدا کی۔
- نظم معریٰ کی ہیئت میں سب سے زیادہ اور کامیاب نظمیں اختر الایمان نے لکھی ہیں۔
- اختر الایمان ایک علامتی شاعر ہیں۔
- نظم 'ایک لڑکا' میں اختر الایمان نے اپنے اس کشمکش کا اظہار کیا ہے جس میں وہ بچپن سے مبتلا رہے ہیں۔
- اختر الایمان کی نظموں کا موضوع احساس ہے۔ وہ ہر بات کو احساس کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔
- اختر الایمان کا کہنا ہے کہ ''یہی میری دین ہے لٹریچر میں کہ میں نے ٹوٹے ہوئے آدمی کی شاعری کی ہے اور اسی لیے میں اپنی شاعری کو نام دیتا ہوں انسان کی روح کا کرب''۔
- اختر الایمان نے اپنی نظم ''قلوپطرہ'' کو دوسری جنگ عظیم کا پس منظر بتایا ہے۔
- اختر الایمان کو غزل کا باغی کہا جاتا ہے۔

- اختر الایمان کی خودنوشت سوانح عمری 'اس آباد خرابے میں' کے عنوان سے 'سوغات' میں قسط وار شائع ہوئی تھی۔
- بمبئی میں پچاس سالہ قیام کے دوران لگ بھگ سو فلموں کے منظرنامے اور مکالمے لکھے۔

اعزازات وانعامات

(1) اختر الایمان کو 'یادیں' کی اشاعت پر ساہتیہ اکادمی کا انعام 1962ء میں ملا تھا۔

(2) اختر الایمان کو 'بنت لمحات' پر یوپی اردو اکادمی کا انعام ملا تھا۔

(3) اختر الایمان کو 'نیا آہنگ' پر مہاراشٹر اردو اکادمی کا انعام ملا تھا۔

(4) اختر الایمان کو 'سروساماں' پر مدھیہ پردیش گورنمنٹ نے 'اقبال سمان' سے نوازا تھا۔

(5) اختر الایمان کو 'سروساماں' پر غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی اور اردو اکادمی، دہلی نے بھی انعامات دیے۔

(6) اختر الایمان کو میر تقی میر ایوارڈ 1988ء میں ملا۔

اختر الایمان کے متعلق مختلف آراوخیالات

- اختر الایمان کی موت سے جدید شاعری کے قبیلے کا آخری سردار اٹھ گیا۔

(رسالہ سوغات کے مدیر محمود ایاز)

- اختر الایمان کے پہلے مجموعے ''گرداب'' پر فراق نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''نئے شاعروں میں سب سے گھائل آواز اختر الایمان کی ہے''۔
- اختر الایمان کے پہلے مجموعے 'گرداب' کو فراق نے پڑھ کر کہا تھا کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر ناگ پھنی نگل گیا ہے۔

اختر الایمان کی داخل نصاب نظمیں

ایک لڑکا

دیارِ شرق کی آبادیوں کے اونچے ٹیلوں پر
کبھی آموں کے باغوں میں کبھی کھیتوں کی مینڈوں پر
کبھی جھیلوں کے پانی میں کبھی بستی کی گلیوں میں
کبھی کچھ نیم عریاں کم سنوں کی رنگ رلیوں میں
سحر دم جھٹپٹے کے وقت راتوں کے اندھیرے میں
کبھی میلوں میں ناٹک ٹولیوں میں ان کے ڈیرے میں

تعاقب میں کبھی گم تتلیوں کے سونی راہوں میں
کبھی ننھے پرندوں کی نہفتہ خواب گاہوں میں
برہنہ پاؤں جلتی ریت یخ بستہ ہواؤں میں
گریزاں بستیوں سے مدرسوں سے خانقاہوں میں
کبھی ہم سن حسینوں میں بہت خوش کام و دل رفتہ
کبھی پیچاں بگولہ ساں کبھی جیوں چشم خوں بستہ
ہوا میں تیرتا خوابوں میں بادل کی طرح اڑتا
پرندوں کی طرح شاخوں میں چھپ کر جھولتا مڑتا

مجھے اک لڑکا آوارہ منش آزاد سیلانی
مجھے اک لڑکا جیسے تند چشموں کا رواں پانی
نظر آتا ہے یوں لگتا ہے جیسے یہ بلائے جاں
مرا ہم زاد ہے ہر گام پر ہر موڑ پر جولاں
اسے ہم راہ پاتا ہوں یہ سائے کی طرح میرا
تعاقب کر رہا ہے جیسے میں مفرور ملزم ہوں
یہ مجھ سے پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

خدائے عز و جل کی نعمتوں کا معترف ہوں میں
مجھے اقرار ہے اس نے زمیں کو ایسے پھیلایا
کہ جیسے بستر کم خواب ہو دیبا و مخمل ہو
مجھے اقرار ہے یہ خیمۂ افلاک کا سایہ
اسی کی بخششیں ہیں اس نے سورج چاند تاروں کو
فضاؤں میں سنوارا اک حد فاصل مقرر کی
چٹانیں چیر کر دریا نکالے خاک اسفل سے
مری تخلیق کی مجھ کو جہاں کی پاسبانی دی
سمندر موتیوں مونگوں سے کانیں لعل و گوہر سے
ہوائیں مست کن خوشبوؤں سے معمور کر دی ہیں

وہ حاکم قادر مطلق ہے یکتا اور دانا ہے
اندھیرے کو اجالے سے جدا کرتا ہے خود کو میں
اگر پہچانتا ہوں اس کی رحمت اور سخاوت ہے
اسی نے خسروی دی ہے لئیموں کو مجھے نکبت
اسی نے یاوہ گویوں کو مرا خازن بنایا ہے

تونگر ہرزہ کاروں کو کیا دریوزہ گر مجھ کو
مگر جب جب کسی کے سامنے دامن پسارا ہے
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

معیشت دوسروں کے ہاتھ میں ہے میرے قبضہ میں
جز اک ذہن رسا کچھ بھی نہیں پھر بھی مگر مجھ کو
خروش عمر کے اتمام تک اک بار اٹھانا ہے
عناصر منتشر ہو جانے نبضیں ڈوب جانے تک
نوائے صبح ہو یا نالۂ شب کچھ بھی گانا ہے
ظفر مندوں کے آگے رزق کی تحصیل کی خاطر
کبھی اپنا ہی نغمہ ان کا کہہ کر مسکرانا ہے
وہ خامہ سوزی شب بیداریوں کا جو نتیجہ ہو
اسے اک کھوٹے سکے کی طرح سب کو دکھانا ہے
کبھی جب سوچتا ہوں اپنے بارے میں تو کہتا ہوں
کہ تو اک آبلہ ہے جس کو آخر پھوٹ جانا ہے
غرض گرداں ہوں بادِ صبح گاہی کی طرح لیکن
سحر کی آرزو میں شب کا دامن تھامتا ہوں جب
یہ لڑکا پوچھتا ہے اختر الایمان تم ہی ہو

یہ لڑکا پوچھتا ہے جب تو میں جھلا کے کہتا ہوں
وہ آشفتہ مزاج اندوہ پرور اضطراب آسا
جسے تم پوچھتے رہتے ہو کب کا مر چکا ظالم

اسے خود اپنے ہاتھوں سے کفن دے کر فریبوں کا

اس کی آرزوؤں کی لحد میں پھینک آیا ہوں
میں اس لڑکے سے کہتا ہوں وہ شعلہ مر چکا جس نے
کبھی چاہا تھا اک خاشاک عالم پھونک ڈالے گا
یہ لڑکا مسکراتا ہے یہ آہستہ سے کہتا ہے
یہ کذب وافترا ہے جھوٹ ہے دیکھو میں زندہ ہوں

پگڈنڈی

ایک حسینہ درماندہ سی، بے بس، تنہا دیکھ رہی ہے
جیسے یونہی بڑھتے بڑھتے رنگِ افق پر جا جھولے گی
جیسے یونہی افتاں خیزاں جا کر تاروں کو چھولے گی

راہ کے پیچ وخم میں کوئی راہی الجھا، دیکھ رہی ہے

انگڑائی لیتی بَل کھاتی، ویرانوں سے آبادی سے
ٹکراتی، کتراتی، مڑتی، خشکی پر گرداب بناتی
اٹھلاتی، شرماتی، ڈرتی، مستقبل کے خواب دکھاتی
سایوں میں ستاتی، مڑتی، بڑھ جاتی ہے آزادی سے

راہی کی آنکھوں میں ڈھلتی، گرتی اور سنبھل جاتی ہے
ٹھنڈی چھاؤں میں تاروں کی سیمیں خواب کا دھارا بنتی
دن کی روشن قندیلوں میں میداں میں آوارا بنتی
ندیوں سے چشموں سے ملتی کوسوں دور نکل جاتی ہے

پھولوں کے اجسام کچلتی ذروں کے فانوس جگاتی
درماندہ اشجار کے نیچے شاخوں کا واویلا سنتی
ہر نووارد کے رستے میں نادیدہ اک جال سا بنتی
بڑھ جاتی ہے 'منزل' کہہ کر کلیاں زیرِ خاک سلاتی!

غم دیدہ پسماندہ راہی تاریکی میں کھو جاتے ہیں
پاؤں راہ کے رخساروں پر دھندلے نقش بنا دیتے ہیں
آنے والے اور مسافر پہلے نقش مٹا دیتے ہیں
وقت کی گرد میں دبتے دبتے ایک فسانہ ہو جاتے ہیں
راہ کے پیچ وخم میں اپنا دامن کوئی کھینچ رہا ہے

فردا کا پر پیچ دھندلکا ماضی کی گھنگھور سیاہی
یہ خاموشی، یہ سناٹا اس پر اپنی کور نگاہی
ایک سفر ہے تنہا راہی، جو سہنا تھا خوب سہا ہے

ایک حسینہ درماندہ سی بے بس تنہا دیکھ رہی ہے
جیون کی پگڈنڈی یونہی تاریکی میں بل کھاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
راہ کے پیچ وخم میں کوئی راہی الجھا دیکھ رہی ہے

یہ سورج یہ چاند ستارے روشن کر سکتے ہیں؟
تاریکی آغازِ سحر ہے، تاریکی انجام نہیں ہے؟
آنے والوں کی راہوں میں کوئی نور آشام نہیں؟
ہم سے اتنا بن پڑتا ہے جی سکتے ہیں مر سکتے ہیں!

بازآمد-ایک منتاج

تتلیاں ناچتی ہیں
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہے جو
کان میں کہنی ہے خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات

دھوپ میں تیزی نہیں

ایسے آتا ہے ہر اک جھونکا ہوا کا جیسے
دستِ شفقت ہے بڑی عمر کی محبوبہ کا
اور مرے شانوں کو اس طرح ہلا جاتا ہے
جیسے میں نیند میں ہوں

عورتیں چرخے لیے بیٹھی ہیں
کچھ کپاس اوٹتی ہیں
کچھ سلائی کے کسی کام میں مصروف ہیں یوں

جیسے یہ کام ہے دراصل ہر اک شے کی اساس
ایک سے ایک چہل کرتی ہے
کوئی کہتی ہے مری چوڑیاں کھنکیں تو کھنکھاری مری ساس
کوئی کہتی ہے بھری چاندنی آتی نہیں راس

رات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
بات کی بات سناتی ہے کوئی ہنس ہنس کر
لذتِ وصل ہے آزار، کوئی کہتی ہے
میں تو بن جاتی ہوں بیمار، کوئی کہتی ہے
میں بھی گھس آتا ہوں اس شیش محل میں، دیکھو
سب ہنسی روک کے کہتی ہیں نکالو اس کو

اک پرندہ کسی اک پیڑ کی ٹہنی پہ چہکتا ہے کہیں
ایک گاتا ہوا یوں جاتا ہے دھرتی سے فلک کی جانب
پوری قوت سے کوئی گیند اچھالے جیسے
اک پھدکتا ہے سرِ شاخ پہ جس طرح کوئی
آمدِ فصلِ بہاری کی خوشی میں ناچے
گوندنی بوجھ سے اپنے ہی جھکی پڑتی ہے
نازنیں جیسے ہے کوئی یہ بھری محفل میں

اور کل ہاتھ ہوئے ہیں پیلے
کوئلیں کوکتی ہیں
جامنیں پکی ہیں، آموں پہ بہار آئی ہے
ارغنوں بجتا ہے یکجائی کا

نیم کے پیڑوں میں جھولے ہیں جدھر دیکھو ادھر
ساونی گاتی ہیں سب لڑکیاں آواز ملا کر ہر سو
اور اس آواز سے گونج اٹھی ہے بستی ساری
میں کبھی ایک کبھی دوسرے جھولے کے قریں جاتا ہوں
ایک ہی کم ہے، وہی چہرہ نہیں
آخرش پوچھ ہی لیتا ہوں کسی سے بڑھ کر
کیوں حبیبہ نہیں آئی اب تک؟
کھلکھلا پڑتی ہیں سب لڑکیاں سن کر یہ نام
لو یہ سپنے میں ہیں، اک کہتی ہے
باؤلی سپنا نہیں، شہر سے آئے ہیں ابھی
دوسری ٹوکتی ہے
بات سے بات نکل چلتی ہے
ٹھاٹ کی آئی تھی بارات، چنبیلی نے کہا
بینڈ باجا بھی تھا، دیپا بولی
اور دلہن پہ ہوا کتنا بکھیر
کچھ نہ کچھ کہتی رہیں سب ہی مگر میں نے صرف
اتنا پوچھا وہ ندی بہتی ہے اب بھی، کہ نہیں
جس سے وابستہ ہیں ہم اور یہ بستی ساری؟
کیوں نہیں بہتی، چنبیلی نے کہا
اور وہ برگد کا گھنا پیڑ کنارے اس کے؟
وہ بھی قائم ہے ابھی تک یونہی

وعدہ کر کے جو حبیبہ نہیں آتی تھی کبھی
آنکھیں دھوتا تھا ندی میں جا کر

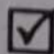
اور برگد کی گھنی چھاؤں میں سو جاتا تھا

ماہ و سال آتے، چلے جاتے ہیں
فصل پک جاتی ہے، کٹ جاتی ہے
کوئی روتا نہیں اس موقع پر
حلقہ در حلقہ نہ آہن کو تپا کر ڈھالیں
کوئی زنجیر نہ ہو!
زیست در زیست کا یہ سلسلہ باقی نہ رہے!

بھیڑ ہے بچوں کی چھوٹی سی گلی میں دیکھو
ایک نے گیند جو پھینکی تو لگی آ کے مجھے
میں نے جا پکڑا اسے، دیکھی ہوئی صورت تھی
کس کا ہے میں نے کسی سے پوچھا؟
یہ حبیبہ کا ہے، رمضانی قصائی بولا
بھولی صورت پہ ہنسی آ گئی اس کی مجھ کو
وہ بھی ہنسنے لگا، ہم دونوں یونہی ہنستے رہے!
دیر تک ہنستے رہے!

تتلیاں ناچتی ہیں
پھول سے پھول پہ یوں جاتی ہیں
جیسے اک بات ہے جو
کان میں کہنی ہے خاموشی سے
اور ہر پھول ہنسا پڑتا ہے سن کر یہ بات!

(27 مئی 1962)



اشتراکیت کا امام

مخدوم محی الدین

(1908-1969ء)

- نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین خذری تھا اور تخلص مخدوم
- مخدوم حیدرآباد دکن کے ایک گاؤں میں 1908 میں پیدا ہوئے۔
- مخدوم کا انتقال 25 اگست 1969 میں دلی میں ہوا اور تدفین حضرت شاہ خاموش کے قبرستان حیدرآباد میں ہوئی۔
- مخدوم کے والد کا نام غوث محی الدین تھا۔ مخدوم چار برس ہی کے تھے کہ ان کے والد فوت ہو گئے۔
- مخدوم کے چچا بشیر الدین نے ان کی پرورش کی تھی۔
- مخدوم کے دادا مخدوم الدین حیدرآباد کی مکہ مسجد میں مشہور قاری تھے۔
- مخدوم کے اجداد میں سے ایک صاحب رشید الدین، شہنشاہ اورنگ زیب کی فوج کے ساتھ اعظم گڑھ سے نقل وطن کر کے حیدرآباد میں ہمیشہ کے لیے سکونت پذیر ہو گئے تھے۔
- مخدوم نے سنگار یڈی ہائی اسکول سے میٹرک 1929 میں پاس کیا تھا۔
- مخدوم نے بی اے 1934 میں اور ایم اے 1936 میں کیا تھا۔
- مخدوم کی شادی ان کی چچازاد بہن رابعہ بیگم سے 1933 میں ہوئی تھی۔
- مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری 1940 میں چنے گئے تھے۔
- مخدوم کی رہ نمائی میں حیدرآباد انجمن ترقی پسند مصنفین کی باقاعدہ تشکیل 1943 میں عمل میں آئی تھی۔
- مخدوم نے کل ہند کانفرنس کا اہتمام 1945 میں کیا تھا۔
- مخدوم 1952 کے عام انتخابات میں اسمبلی اور پارلیمنٹ دونوں کے لیے امیدوار تھے۔ لیکن الیکشن ہار گئے تھے۔
- مخدوم مجلس قانون ساز آندھرا پردیش میں اپوزیشن لیڈر 1956 میں منتخب ہوئے تھے۔
- مخدوم تلنگانہ تحریک کے ہیرو تھے، دوسرے کمیونسٹ قائدین کی طرح انھیں بھی 1951 میں گرفتار کیا گیا تھا۔

- مخدوم نے شاعری کی ابتدا جامعہ عثمانیہ میں بی۔اے کے طالب علمی کے زمانے میں 1923 میں کی تھی۔
- مخدوم کی پہلی نظم 'پیلا دوشالہ' ہے اور پہلی مطبوعہ نظم 'طور' ہے جو رسالہ 'ایوان' (مدیر مجنوں گورکھپوری) میں 1933 میں شائع ہوئی تھی۔
- مخدوم نے شاعری میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی تھی۔
- مخدوم ترقی پسند تحریک کے نمائندہ شاعروں میں سے تھے۔
- مخدوم نے قحط بنگال پر 'بنگال'، اور تلنگانہ تحریک پر تلنگانہ نظم لکھی ہے۔

مخدوم کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- مخدوم کی پہلی سیاسی نظم 'جنگ' ہے جسے سبط حسن نے فاشزم کے خلاف اردو کی پہلی صدائے احتجاج قرار دیا ہے۔
- مخدوم ان شعرا میں سے ہیں جو فن کی ایک سطح پر آ کر ٹھہر نہیں جاتے بلکہ وہ ترقی کرتے رہتے ہیں۔(آل احمد سرور)

مخدوم محی الدین کی داخل نصاب نظمیں

چاند تاروں کا بن

(آزادی سے پہلے، بعد اور آگے)

موم کی طرح جلتے رہے ہم شہیدوں کے تن
رات بھر جھلملاتی رہی شمع صبح وطن
رات بھر جگمگاتا رہا چاند تاروں کا بن
تشنگی تھی مگر

تشنگی میں بھی سرشار تھے
پیاسی آنکھوں کے خالی کٹورے لیے
منتظر مرد و زن
مستیاں ختم، مدہوشیاں ختم تھیں، ختم تھا بانکپن

رات کے جگمگاتے دہکتے بدن

صبح دم ایک دیوارِ غم بن گئے
خارزارِ الم بن گئے

رات کی شہ رگوں کا اچھلتا لہو
جوئے خوں بن گیا
کچھ اماماںِ صد مکر و فن
ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی
ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں
اک کمیں گاہ سے
پھینک کر اپنی نوکِ زباں

خونِ نورِ سحر پی گئے
رات کی تلچھٹیں ہیں اندھیرا ابھی ہے
صبح کا کچھ، اجالا بھی ہے
ہمدمو!
ہاتھ میں ہاتھ دو
سوئے منزل چلو
منزلیں پیار کی
منزلیں دار کی
کوئے دلدار کی منزلیں
دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو

حویلی

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج لے رہی ہے نزع کے عالم میں مردوں سے خراج
اک مسلسل گرد میں ڈوبے ہوئے سب بام و در جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر

مار و کژدم کے ٹھکانے جس کی دیواروں کے چاک ۔۔۔ اف یہ رخنے کس قدر تاریک کتنے ہول ناک
جن میں رہتے ہیں مہاجن جن میں بستے ہیں امیر ۔۔۔ جن میں کاشی کے برہمن جن میں کعبے کے فقیر
رہزنوں کا قصر شوری قاتلوں کی خواب گاہ ۔۔۔ کھلکھلاتے ہیں جرائم جگمگاتے ہیں گناہ
جس جگہ کتا ہے سر انصاف کا ایمان کا ۔۔۔ روز و شب نیلام ہوتا ہے جہاں انسان کا
زیست کو درسِ اجل دیتی ہے جس کی بارگاہ ۔۔۔ قہقہہ بن کر نکلتی ہے جہاں ہر ایک آہ
سیم و زر کا دیوتا جس جا کبھی سوتا نہیں ۔۔۔ زندگی کا بھول کر جس جا گزر ہوتا نہیں
ہنس رہا ہے زندگی پر اس طرح ماضی کا حال ۔۔۔ خندہ زن ہو جس طرح عصمت پہ قحبہ کا جمال
ایک جانب ہیں وہیں ان بے نواؤں کے گروہ ۔۔۔ ہاں انہیں بے نان و بے پوشش گداؤں کے گروہ
جن کے دل کچلے ہوئے جن کی تمنا پائمال ۔۔۔ جھانکتا ہے جن کی آنکھوں سے جہنم کا جلال
اے خدائے دو جہاں اے وہ جو ہر اک دل میں ہے ۔۔۔ دیکھ تیرے ہاتھ کا شہکار کس منزل میں ہے
جانتا ہوں موت کا ہم ساز و ہم دم کون ہے ۔۔۔ کون ہے پروردگار بزم ماتم کون ہے
کوڑھ کے دھبے چھپا سکتا نہیں ملبوس دیں ۔۔۔ بھوک کے شعلے بجھا سکتا نہیں روح الامیں
اے جواں سال جہاں جان جہان زندگی ۔۔۔ ساربان زندگی روح روان زندگی!

جس کے خون گرم سے بزم چراغاں زندگی ۔۔۔ جس کے فردوسی تنفس سے گلستاں زندگی
بجلیاں جس کی کنیزیں زلزلے جس کے صفیر ۔۔۔ جس کا دل خیبر شکن جس کی نظر ارجن کا تیر
ہاں وہ نغمہ چھیڑ جس سے مسکرائے زندگی ۔۔۔ تو بجائے ساز الفت اور گائے زندگی

آ انہیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں
آ انہیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں

انقلاب

(آنے والے نئے نظام عالم کے پیش رس کی تمنا میں)

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجوم شوق سر رہ گزار کب سے ہے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

نہ تابنا کیِ رخ ہے نہ کاکلوں کا ہجوم
ہے ذرہ ذرہ پریشاں کلی کلی مغموم
ہے کل جہاں متعفن ہوائیں سب مسموم
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

رخِ حیات پہ کاکل کی برہمی ہی نہیں
نگارِ دہر میں اندازِ مریمی ہی نہیں
مسیح و خضر کی کہنے کو کچھ کمی ہی نہیں
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حیات بخش ترانے اسیر ہیں کب سے
گلوئے زہرہ میں پیوست تیر ہیں کب سے ہے
قفس میں بند ترے ہم صفیر ہیں کب سے
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

حرم کے دوش پہ عقبیٰ کا دام ہے اب تک
سروں میں دین کا سودائے خام ہے اب تک
توہمات کا آدم غلام ہے اب تک
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

ابھی دماغ پہ قبائے سیم و زر ہے سوار
ابھی رکی ہی نہیں تیشہ زن کے خون کی دھار
شمیم عدل سے مہکیں یہ کوچہ و بازار
گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے



ن،م راشد

(1910-1975ء)

- نام نذر محمد راشد، قلمی نام ن۔م۔راشد اور تخلص گلاب تھا۔
- نذر محمد راشد 9 نومبر 1910 میں قصبہ اکال گڑھ ضلع گوجرانوالہ پنجاب میں پیدا ہوئے۔
- نذر محمد راشد کا انتقال 9 اکتوبر 1975 میں لندن میں ہوا۔
- راشد نے 1926 میں میٹرک، 1928 میں انٹرمیڈیٹ، 1930 میں بی اے، 1932 میں ایم اے، پاس کیا تھا۔
- راشد نے کم عمری ہی میں شاعری شروع کردی تھی اور گلاب تخلص اختیار کیا تھا۔
- راشد کو لوگوں نے انفرادیت پرست، غیر سماجی، جنس زدہ، ذہنی مریض، فراری شکست خوردہ ذہنیت کا مالک کہا ہے۔
- راشد کی شاعری پر عریانی اور فحاشی کا الزام بھی لگایا گیا ہے۔
- رسالہ 'شعر و حکمت' حیدرآباد دکن نے 1971 میں ن،م، راشد نمبر نکالا تھا۔
- ن۔م۔راشد نے اپنے کلام میں فارسی الفاظ اور تراکیب کا زیادہ استعمال کیا ہے۔

ن م راشد کی داخل نصاب نظم

حسن کوزہ گر

(1)

جہاں زاد نیچے گلی میں ترے در کے آگے
یہ میں سوختہ سر حسن کوزہ گر ہوں!
تجھے صبح بازار میں بوڑھے عطار یوسف
کی دکان پر میں نے دیکھا
تو تیری نگاہوں میں وہ تابناکی
تھی میں جس کی حسرت میں نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں
جہاں زاد نو سال دیوانہ پھرتا رہا ہوں!

یہ وہ دور تھا جس میں میں نے

کبھی اپنے رنجور کوزوں کی جانب
پلٹ کر نہ دیکھا—
وہ کوزے مرے دستِ چابک کے پتلے
گِل و رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں
وہ سرگوشیوں میں یہ کہتے
"حسن کوزہ گر اب کہاں ہے؟
وہ ہم سے خود اپنے عمل سے
خداوند بن کر خداؤں کے مانند ہے روئے گرداں!"
جہاں زاد نو سال کا دور یوں مجھ پہ گزرا
کہ جیسے کسی شہرِ مدفون پر وقت گزرے
تغاروں میں مٹی
کبھی جس کی خوشبو سے وارفتہ ہوتا تھا میں
سنگ بستہ پڑی تھی
صراحی و مینا و جام و سبو اور فانوس و گلداں
مری ہیچ مایہ معیشت کے اظہارِ فن کے سہارے
شکستہ پڑے تھے۔
میں خود میں حسن کوزہ گر پابہ گِل خاک بر سر برہنہ
سرِ چاک، ژولیدہ مو سر بہ زانو
کسی غمزدہ دیوتا کی طرح واہمہ کے
گِل و لا سے خوابوں کے سیال کوزے بناتا رہا تھا
جہاں زاد نو سال پہلے
تو ناداں تھی لیکن تجھے یہ خبر تھی
کہ میں نے حسن کوزہ گر نے

تری قاف کی سی افق تاب آنکھوں
میں دیکھی ہے وہ تابناکی
کہ جس سے مرے جسم و جاں ابر و مہتاب کا
رہگزر بن گئے تھے
جہاں زاد بغداد کی خواب گوں رات
وہ رود دجلہ کا ساحل
وہ کشتی وہ ملاح کی بند آنکھیں
کسی خستہ جاں رنج بر کوزہ گر کے لیے
ایک ہی رات وہ کہربا تھی
کہ جس سے ابھی تک ہے پیوست اس کا وجود—
اس کی جاں اس کا پیکر
مگر ایک ہی رات کا ذوق دریا کی وہ لہر نکلا
حسن کوزہ گر جس میں ڈوبا تو ابھرا نہیں ہے!
جہاں زاد اس دور میں روز ہر روز
وہ سوختہ بخت آکر
مجھے دیکھتی چاک پر پا بہ گل سر بہ زانو
تو شانوں سے مجھ کو ہلاتی—
(وہی چاک جو سال ہا سال جینے کا تنہا سہارا رہا تھا!)
وہ شانوں سے مجھ کو ہلاتی
"حسن کوزہ گر ہوش میں آ
حسن اپنے ویران گھر پر نظر کر
یہ بچوں کے تنّور کیونکر بھریں گے
حسن، اے محبت کے مارے

محبت امیروں کی بازی،
حسن اپنے دیوار و در پر نظر کر"

مرے کان میں یہ نوائے حزیں یوں تھی جیسے
کسی ڈوبتے شخص کو زیرِ گرداب کوئی پکارے!
وہ اشکوں کے انبار پھولوں کے انبار تھے ہاں
مگر میں حسن کوزہ گر شہر اوہام کے ان
خرابوں کا مجذوب تھا جن
میں کوئی صدا کوئی جنبش
کسی مرغِ پرّاں کا سایہ
کسی زندگی کا نشاں تک نہیں تھا!

جہاں زاد، میں آج تیری گلی میں
یہاں رات کی سرد گوں تیرگی میں
ترے در کے آگے کھڑا ہوں
سر و مو پریشاں
دریچے سے وہ قاف کی سی طلسمی نگاہیں
مجھے آج پھر جھانکتی ہیں
زمانہ، جہاں زاد وہ چاک ہے جس پہ مینا و جام و سبو
اور فانوس و گلداں
کے مانند بنتے بگڑتے ہیں انساں
میں انساں ہوں لیکن
یہ نو سال جو غم کے قالب میں گزرے!
حسن کوزہ گر آج اک تودۂ خاک ہے جس

میں نم کا اثر تک نہیں ہے
جہاں زاد بازار میں صبح عطار یوسف
کی دکان پر تیری آنکھیں
پھر اک بار کچھ کہہ گئی ہیں

ان آنکھوں کی تابندہ شوخی
سے اُٹھی ہے پھر تو دۂ خاک میں نم کی ہلکی سی لرزش
یہی شاید اس خاک کو گِل بنا دے!

تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو بن جاؤں میں پھر
وہی کوزہ گر جس کے کوزے
تھے ہر کاخ و کو اور ہر شہر و قریہ کی نازش
تھے جن سے امیر و گدا کے مساکن درخشاں
تمنا کی وسعت کی کس کو خبر ہے جہاں زاد لیکن
تو چاہے تو میں پھر پلٹ جاؤں ان اپنے مہجور کوزوں کی جانب
گِل و لا کے سوکھے تغاروں کی جانب
معیشت کے اظہار فن کے سہاروں کی جانب
کہ میں اس گِل و لا سے اُس رنگ و روغن
سے پھر وہ شرارے نکالوں کہ جن سے
دلوں کے خرابے ہوں روشن!

حسن کوزہ گر

(2)

اے جہاں زاد،

نشاط اُس شبِ بے راہ روی کی
میں کہاں تک بھولوں؟
زورِ مے تھا کہ مرے ہاتھ کی لرزش تھی
کہ اس رات کوئی جام گرا ٹوٹ گیا—

تجھے حیرت نہ ہوئی!
کہ ترے گھر کے دریچوں کے کئی شیشوں پر

اس سے پہلے کی بھی درزیں تھیں بہت—
تجھے حیرت نہ ہوئی!

اے جہاں زاد،
میں کوزوں کی طرف اپنے تغاروں کی طرف

اب جو بغداد سے لوٹا ہوں
تو میں سوچتا ہوں—

سوچتا ہوں: تو مرے سامنے آئینہ رہی
سرِ بازار دریچے میں سرِ بسترِ سنجاب کبھی
تو مرے سامنے آئینہ رہی،
جس میں کچھ بھی نظر آیا نہ مجھے
اپنی ہی صورت کے سوا
اپنی تنہائی جانکاہ کی دہشت کے سوا!
لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور وہ آئینہ مرے ہاتھ میں ہے
اس میں کچھ بھی نظر آتا نہیں
اب ایک ہی صورت کے سوا!

لکھ رہا ہوں تجھے خط
اور مجھے لکھنا بھی کہاں آتا ہے؟
لوحِ آئینہ پہ اشکوں کی پھواروں ہی سے
خط کیوں نہ لکھوں؟
اے جہاں زاد،

نشاط اس شبِ بے راہ روی کی
مجھے پھر لائے گی؟
وقت کیا چیز ہے تو جانتی ہے؟
وقت اِک ایسا پتنگا ہے

جو دیواروں پہ آئینوں پہ
پیانوں پہ شیشوں پہ
مرے جام و سبو میرے تغاروں پہ
سدا رینگتا ہے
رینگتے وقت کے مانند کبھی
لوٹ کے آئے گا حسن کوزہ گر سوختہ جاں بھی شاید!
اب جو لوٹا ہوں جہاں زاد
تو میں سوچتا ہوں!
شاید اس جھونپڑے کی چھت پہ یہ مکڑی مری محرومی کی۔۔۔
جسے تنتی چلی جاتی ہے وہ جالا تو نہیں ہوں میں بھی؟
یہ سیہ جھونپڑا میں جس میں پڑا سوچتا ہوں
میرے افلاس کے روندے ہوئے اجداد کی
بس ایک نشانی ہے یہی
اُن کے فن ان کی معیشت کی کہانی ہے یہی

میں جو لوٹا ہوں تو وہ سوختہ بخت
آ کے مجھے دیکھتی ہے
دیر تک دیکھتی رہ جاتی ہے
میرے اس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں۔۔۔
کھیل اک سادہ محبت کا
شب و روز کے اس بڑھتے ہوئے کھوکھلے پن میں جو کبھی
کھیلتے ہیں
کبھی رو لیتے ہیں مل کر کبھی گا لیتے ہیں
اور مل کر کبھی ہنس لیتے ہیں،
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں۔۔۔
حرف سرحد ہیں جہاں زاد معانی سرحد

عشق سرحد ہے جوانی سرحد
دل کے جینے کے بہانے کے سوا اور نہیں
درد محرومی کی،
تنہائی کی سرحد بھی کہیں ہے کہ نہیں؟
میرے اس جھونپڑے میں
کتنی ہی خوشبوئیں ہیں
جو مرے گرد سدا رینگتی ہیں
اسی اک رات کی خوشبو کی طرح رینگتی ہیں
در و دیوار سے لپٹی ہوئی اس گرد کی خوشبو بھی ہے
میرے افلاس کی تنہائی کی
یادوں کی تمناؤں کی خوشبوئیں بھی
پھر بھی اس جھونپڑے میں کچھ بھی نہیں—

یہ مرا جھونپڑا تاریک ہے گندہ ہے پراگندہ ہے
ہاں کبھی دور درختوں سے پرندوں کی صدا آتی ہے
کبھی انجیروں کے زیتونوں کے باغوں کی مہک آتی ہے
تو میں جی اٹھتا ہوں
تو میں کہتا ہوں کہ لو آج نہا کر نکلا!
ورنہ اس گھر میں کوئی سیج نہیں عطر نہیں ہے
کوئی پنکھا بھی نہیں،
تجھے جس عشق کی خُو ہے
مجھے اس عشق کا یارا بھی نہیں!
تو ہنسے گی اے جہاں زاد عجب بات
کہ جذبات کا حاتم بھی میں
اور اشیا کا پرستار بھی میں
اور ثروت جو نہیں اس کا طلب گار بھی میں!

تو جو ہنستی رہی اس رات تذبذب پہ مرے
میری دو رنگی پہ پھر سے ہنس دے!
عشق سے کس نے مگر پایا ہے کچھ اپنے سوا؟
اے جہاں زاد،
ہے ہر عشق سوال ایسا کہ عاشق کے سوا
اس کا نہیں کوئی جواب
یہی کافی ہے کہ باطن کی صدا گونج اٹھے!
اے جہاں زاد
مرے گوشۂ باطن کی صدا ہی تھی
مرے فن کی ٹھٹھرتی ہوئی صدیوں

کے کنارے گونجی
تیری آنکھوں کے سمندر کا کنارا ہی تھا
صدیوں کا کنارا نکلا
یہ سمندر جو مری ذات کا آئینہ ہے
یہ سمندر جو مرے کوزوں کے بگڑے ہوئے
بنتے ہوئے سیماؤں کا آئینہ ہے
یہ سمندر جو ہر اک فن کا
ہر اک فن کے پرستار کا
آئینہ ہے

حسن کوزہ گر

(3)

جہاں زاد،
وہ حلب کی کارواں سرا کا حوض، رات وہ سکوت
جس میں ایک دوسرے سے ہم کنار تیرتے رہے

محیط جس طرح ہو دائرے کے گرد حلقہ زن
تمام رات تیرتے رہے تھے ہم
ہم ایک دوسرے کے جسم و جاں سے لگ کے
تیرتے رہے تھے ایک شادکام خوف سے
کہ جیسے پانی آنسوؤں میں تیرتا رہے
ہم ایک دوسرے سے مطمئن زوال عمر کے خلاف
تیرتے رہے
تو کہہ اٹھی: "حسن یہاں بھی کھینچ لائی
جاں کی تشنگی تجھے!"
(لو اپنی جاں کی تشنگی کو یاد کر رہا تھا میں
کہ میرا حلق آنسوؤں کی بے بہا سخاوتوں
سے شادکام ہو گیا!)
مگر یہ وہم دل میں تیرنے لگا کہ ہو نہ ہو
مرا بدن کہیں حلب کے حوض ہی میں رہ گیا—
نہیں، مجھے دوئی کا واہمہ نہیں
کہ اب بھی ربط جسم و جاں کا اعتبار ہے مجھے
یہی وہ اعتبار تھا
کہ جس نے مجھ کو آپ میں سمو دیا—
میں سب سے پہلے 'آپ' ہوں
اگر ہمیں ہوں— تو ہو اور میں ہوں— پھر بھی میں
ہر ایک شے سے پہلے آپ ہوں!
اگر میں زندہ ہوں تو کیسے آپ سے دغا کروں؟
کہ تیرے جیسی عورتیں، جہاں زاد،
ایسی الجھنیں ہیں
جن کو آج تک کوئی نہیں 'سلجھ' سکا

جو میں کہوں کہ میں 'سلجھ' سکا تو سر بسر
فریب اپنے آپ سے!
کہ عورتوں کی ساخت ہے وہ طنز اپنے آپ پر
جواب جس کا ہم نہیں—
(لبیب کون ہے؟ تمام رات جس کا ذکر
تیرے لب پہ تھا—

وہ کون تیرے گیسوؤں کو کھینچتا رہا
لبوں کو نوچتا رہا
جو میں کبھی نہ کر سکا
نہیں یہ سچ ہے— میں ہوں یا لبیب ہو
رقیب ہو تو کس لیے تری خود آگہی کی بے ریا نشاط ناب کا
جو صد نوا و یک نوا خرام صبح کی طرح
لبیب ہر نوائے سازگار کی نفی سہی!)
مگر ہمارا رابطہ وصال آب و گل نہیں، نہ تھا کبھی
وجودِ آدمی سے آب و گل سدا بروں رہے
نہ ہر وصالِ آب و گل سے کوئی جام یا سبو ہی بن سکا
جو اِن کا ایک واہمہ ہی بن سکے تو بن سکے!

جہاں زاد،
ایک تو اور ایک وہ اور ایک میں
یہ تین زاویے کسی مثلثِ قدیم کے
ہمیشہ گھومتے رہے
کہ جیسے میرا چاک گھومتا رہا
مگر نہ اپنے آپ کا کوئی سراغ پا سکے—
مثلثِ قدیم کو میں توڑ دوں، جو تو کہے، مگر نہیں

جو سحر مجھ پہ چاک کا وہی ہے اس مثلث قدیم کا
نگاہیں میرے چاک کی جو مجھ کو دیکھتی ہیں
گھومتے ہوئے
سبو و جام پر ترا بدن ترا ہی رنگ تیری ناز کی

برس پڑی
وہ کیمیا گری ترے جمال کی برس پڑی
میں سیل نور اندروں سے ڈھل گیا!
مرے دروں کی خلق یوں گلی گلی نکل پڑی
کہ جیسے صبح کی اذاں سنائی دی!
تمام کوزے بنتے بنتے، تو ہی بن کے رہ گئے
نشاط اس وصال رہ گزر کی ناگہاں مجھے نگل گئی—
یہی پیالہ و صراحی و سبو کا مرحلہ ہے وہ
کہ جب خمیر آب و گل سے وہ جدا ہوئے
تو ان کو سمت راہ نو کی کامرانیاں ملیں
میں اک غریب کوزہ گر
یہ انتہائے معرفت
یہ ہر پیالہ و صراحی و سبو کی انتہائے معرفت
مجھے ہو اس کی کیا خبر؟)
جہاں زاد،
انتظار آج بھی مجھے ہے کیوں وہی مگر

جو نو برس کے دور نا سزا میں تھا؟
اب انتظار آنسوؤں کے دجلہ کا
نہ گمرہی کی رات کا
شب گنہی کی لذتوں کا اتنا ذکر کر چکا

وہ خود گناہ بن گئیں!)
حلب کی کارواں سرا کے حوض کا، نہ موت کا
نہ اپنی اس شکست خوردہ ذات کا

اک انتظار بے زماں کا تار ہے بندھا ہوا!
کبھی جو چند ثانیے زمان بے زماں میں آ کے رک گئے
تو وقت کا یہ بار میرے سر سے بھی اتر گیا
تمام رفتہ و گزشتہ صورتوں، تمام حادثوں
کے ست قافلے
مرے دروں میں جاگ اٹھے
مرے دروں میں اک جہان بازیافتہ کی ریل پیل جاگ اٹھی
بہشت جیسے جاگ اٹھے خدا کے لاشعور میں!
میں جاگ اٹھا غنودگی کی ریت پر پڑا ہوا
غنودگی کی ریت پر پڑے ہوئے وہ کوزے جو
—مرے وجود سے بروں—
تمام ریزہ ریزہ ہو کے رہ گئے تھے
میرے اپنے آپ سے فراق میں
وہ پھر سے ایک کل بنے (کسی نوائے سازگار کی طرح)
وہ پھر سے ایک رقص بے زماں بنے

وہ رویت ازل بنے!

حسن کوزہ گر

(4)

جہاں زاد کیسے ہزاروں برس بعد
اک شہر مدفون کی ہر گلی میں

مرے جام و مینا و گل داں کے ریزے ملے ہیں
کہ جیسے وہ اس شہر برباد کا حافظہ ہوں

حسن نام کا اک جواں کوزہ گر — اک نئے شہر میں —
اپنے کوزے بناتا ہوا عشق کرتا ہوا
اپنے ماضی کے تاروں میں ہم سے پرویا گیا ہے
ہمیں میں کہ جیسے ہمیں ہوں سمویا گیا ہے
کہ ہم تم وہ بارش کے قطرے تھے جو رات بھر سے
(ہزاروں برس رینگتی رات بھر)
اک دریچے کے شیشوں پہ گرتے ہوئے سانپ لہریں
بناتے رہے ہیں،
اور اب اس جگہ وقت کی صبح ہونے سے پہلے
یہ ہم اور یہ نوجواں کوزہ گر
ایک رویا میں پھر سے پروئے گئے ہیں

جہاں زاد —
یہ کیسا کہنہ پرستوں کا انبوہ
کوزوں کی لاشوں میں اترا ہے

دیکھو

یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں
کبھی جام و مینا کی لم تک نہ پہنچیں
یہی آج اس رنگ و روغن کی مخلوق بے جاں
کو پھر سے الٹنے پلٹنے لگے ہیں
یہ ان کے تلے غم کی چنگاریاں پا سکیں گے
جو تاریخ کو کھا گئی تھیں
وہ طوفان وہ آندھیاں پا سکیں گے

جو ہر چیخ کو کھا گئی تھیں

انھیں کیا خبر کس دھنک سے مرے رنگ آئے —
(مرے اور اس نوجواں کوزہ گر کے؟)
انھیں کیا خبر کون سی تتلیوں کے پروں سے
انھیں کیا خبر کون سے حسن سے
کون سی ذات سے کس خدوخال سے
میں نے کوزوں کے چہرے اتارے؟
یہ سب لوگ اپنے اسیروں میں ہیں
زمانہ، جہاں زاد، افسوں زدہ برج ہے
اور یہ لوگ اس کے اسیروں میں ہیں —
جواں کوزہ گر ہنس رہا ہے!
یہ معصوم وحشی کہ اپنے ہی قامت سے ژولیدہ دامن
ہیں جویا کسی عظمت نارسا کے —
انھیں کیا خبر کیسا آسیب مبرم مرے غار سینے پہ تھا

جس نے مجھ سے اور اس کوزہ گر سے کہا
"اے حسن کوزہ گر جاگ
درد رسالت کا روز بشارت ترے جام و مینا
کی تشنہ لبی تک پہنچنے لگا ہے!"
یہی وہ ندا جس کے پیچھے حسن نام کا
یہ جواں کوزہ گر بھی
پیاپے رواں ہے زماں سے زماں تک،
خزاں سے خزاں تک!
جہاں زاد میں نے — حسن کوزہ گر نے —
بیاباں بیاباں یہ درد رسالت سہا ہے

ہزاروں برس بعد یہ لوگ
ریزوں کو چنتے ہوئے

جان سکتے ہیں کیسے
کہ میرے گل و خاک کے رنگ و روغن

ترے نازک اعضا کے رنگوں سے مل کر
ابد کی صدا بن گئے تھے

میں اپنے مساموں سے ہر پور سے
تیری بانہوں کی پہنائیاں
جذب کرتا رہا تھا
کہ ہر آنے والے کی آنکھوں کے معبد پہ جا کر چڑھاؤں
یہ ریزوں کی تہذیب پالیں تو پالیں
حسن کوزہ گر کو کہاں لا سکیں گے

یہ اس کے پسینے کے قطرے کہاں گن سکیں گے
یہ فن کی تجلی کا سایہ کہاں پا سکیں گے
جو بڑھتا گیا ہے زماں سے زماں تک
خزاں سے خزاں تک
جو ہر نوجواں کوزہ گر کی نئی ذات میں
اور بڑھتا چلا جا رہا ہے!
وہ فن کی تجلی کا سایہ کہ جس کی بدولت
ہمہ عشق ہیں ہم
ہمہ کوزہ گر ہم
ہمہ تن خبر ہم
خدا کی طرح اپنے فن کے خدا سر بسر ہم!

(آرزوئیں کبھی پایاب تو سرِیاب کبھی،
تیرنے لگتے ہیں بے ہوشی کی آنکھوں میں کئی چہرے
جو دیکھے بھی نہ ہوں
کبھی دیکھے ہوں کسی نے تو سراغ ان کا
کہاں سے پائے؟
کس سے ایفا ہوئے اندوہ کے آداب کبھی
آرزوئیں کبھی پایاب تو سرِیاب کبھی!)
یہ کوزوں کے لاشے جوان کے لیے ہیں
کسی داستان فنا کے وغیرہ وغیرہ—
ہماری اذاں ہیں ہماری طلب کا نشاں ہیں
یہ اپنے سکوت اجل میں بھی یہ کہہ رہے ہیں

''وہ آنکھیں ہمیں ہیں جو اندر کھلی ہیں
تمھیں دیکھتی ہیں ہر اک درد کو بھانپتی ہیں
ہر اک حسن کے راز کو جانتی ہیں
کہ ہم ایک سنسان حجرے کی اس رات کی آرزو ہیں
جہاں ایک چہرہ، درختوں کی شاخوں کے مانند
اِک اور چہرے پہ جھک کر ہر انسان کے سینے میں
اک برگِ گل رکھ گیا تھا
اُسی شب کا دُزدیدہ بوسہ ہمیں ہیں!''



ساحرلدھیانوی

- ساحر کا نام چودھری عبدالحئی تھا اور ساحر تخلص
- ساحرلدھیانوی کی پیدائش 8 مارچ 1921ء کو لدھیانہ میں ہوئی تھی۔
- ساحرلدھیانوی کا انتقال 25 اکتوبر 1980ء کو ہوا تھا۔
- ساحر کے والد کا نام چودھری فضل محمد ذیل تھا جو لدھیانہ شہر کے ایک علاقے لوڈھوال کے جاگیردار تھے اور والدہ کا نام سردار بیگم جوان کی والد کی گیارہویں بی بی تھیں۔
- ساحرلدھیانوی نے ابتدائی تعلیم مالوہ خالصہ اسکول لدھیانہ میں حاصل کی تھی اور اسکول کے استاد مولانا فیاض ہریانوی تھے۔
- ساحرلدھیانوی نے مالوہ خالصہ کالج سے میٹرک کا امتحان 1937ء میں پاس کیا تھا۔
- ساحرلدھیانوی نے شعر گوئی کا آغاز نظم گوئی سے کیا تھا۔
- ساحرلدھیانوی نے اپنی پہلی نظم لکھ کر اپنے استاد فیاض ہریانوی کو دکھائی تھی۔
- ساحرلدھیانوی نے اپنے تخلص کے لیے لفظ 'ساحر' اقبال کے لکھے ہوئے مرثیے 'مرثیہ' داغ' کے اس شعر سے اخذ کیا تھا:

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

- ساحرلدھیانوی اپنی شعری زندگی کے ابتدائی دور میں ساحر' اے۔ ایچ۔ ساحر' کے نام سے لکھتے تھے۔
- ساحرلدھیانوی کو گورنمنٹ کالج لدھیانہ اور دیال سنگھ کالج لاہور سے نکالا گیا تھا۔
- ساحر کو مہاراشٹر حکومت نے Special executive magistrate 1974ء میں مقرر کیا تھا۔
- ساحرلدھیانوی کی معشوقائیں: مہندر چودھری، بریندر کور، امریتا پریتم اور سدھا ملہوترہ تھیں۔
- ساحر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے تھے جس کی وجہ سے ان کی کئی نظمیں ضبط ہوئی تھیں ان نظموں میں سے ایک شعلہ نوائی ہے۔
- ساحر کی شاعری میں عورتوں کے تقدس کی پامالی کا شدید احساس ملتا ہے۔
- ساحرلدھیانوی کے دوستوں میں کامریڈ مدن لال، حافظ لدھیانوی، حمید اختر، احمد ریاض، شورش کاشمیری، گویا متل، دیویندر ستیارتھی اور حفیظ ہوشیارپوری وغیرہ تھے۔

- ساحر لدھیانوی نے ادب لطیف، سویرا، شاہ کار، شاہ راہ، پریت لڑی وغیرہ کی ادارت کی تھی۔
- ساحر لدھیانوی صف اول کے نغمہ نگار تھے۔
- نغمہ نگاروں میں سب سے پہلے ساحر کا مجموعۂ کلام اور متعدد فلمی نغموں کا انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔
- ساحر لدھیانوی خواجہ احمد عباس کی طرح فلم رائٹرز ایسوسی ایشن کے صدر، رہ چکے ہیں۔
- ساحر نے تیسری عالمی جنگ کے وقت 'عالمی امن تحریک' کی حمایت میں امنِ عالم کے موضوع پر 1900ء میں 184 مصرعوں پر مشتمل شاہکار طویل ڈرامائی نظم پرچھائیاں لکھی تھی۔

ساحر کے کارنامے

- تلخیاں (پہلا مجموعۂ کلام)، آؤ کہ کوئی خواب بنیں (مجموعۂ کلام)
- اہم نظمیں: پرچھائیاں، تاج محل، چکلے، گریز، کبھی کبھی، کسی کو اداس دیکھ کر، اے شریف انسانو! (ہند پاک جنگ کے وقت)

اعزازات وانعامات

- ساحر لدھیانوی کو حکومت ہند نے پدم شری کا اعزازی خطاب 1971ء کو عطا کیا تھا۔
- ساحر لدھیانوی کو مہاراشٹر حکومت نے Justice of thepeace، اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ اور اردو اکادمی ایوارڈ سے 1972ء میں نوازا تھا۔
- ساحر لدھیانوی کو 'آؤ کہ کوئی خواب بنیں' کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کی سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ 1973ء میں ملا تھا۔

ساحر لدھیانوی کے متعلق مختلف آرا و خیالات

- اس (ساحر لدھیانوی) کی شاعری کا آغاز انقلاب کے نعرہ سے ہوا۔ اس کی ابتدائی شاعری میں، شاعری کم تھی اور نعرہ بازی زیادہ۔ (حافظ لدھیانوی)
- وہ (ساحر) پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی فلمی شاعری میں ایک خالص ادبی معیار قائم رکھا بلکہ شاعروں کا رتبہ بھی فلم انڈسٹری میں بڑھایا (خواجہ احمد عباس)
- دنیا کی نصف سے زائد آبادی نے امنِ عالم کے محضر پر اپنی مہر ثبت کی ہے۔ ساحر نے یہ خوبصورت نظم (پرچھائیاں) لکھ کر اپنے دستخط کیے ہیں۔ (علی سردار جعفری)

ساحر لدھیانوی کی داخل نصاب نظمیں

چکلے

یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
یہ پُر پیچ گلیاں یہ بے خواب بازار
یہ گمنام راہی یہ سکّوں کی جھنکار
یہ عصمت کے سودے یہ سودوں پہ تکرار
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
تعفّن سے پر نیم روشن یہ گلیاں
یہ مسلی ہوئی ادھ کھلی زرد کلیاں
یہ بکتی ہوئی کھوکھلی رنگ رلیاں
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں
وہ اُجلے دریچوں میں پائل کی چھن چھن
تنفس کی الجھن پہ طبلے کی دھن دھن

یہ بے رُوح کمروں میں کھانسی کی ٹھن ٹھن
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
یہ گونجے ہوئے قہقہے راستوں پر
یہ چاروں طرف بھیڑ سی کھڑکیوں پر

یہ آوازے کھنچتے ہوئے آنچلوں پر
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
یہ پھولوں کے گجرے یہ پیکوں کے چھینٹے
یہ بیباک نظریں یہ گستاخ نقرے
یہ ڈھلکے بدن اور یہ مدقوق چہرے
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
یہ بھوکی نگاہیں حسینوں کی جانب
یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ سینوں کی جانب
لپکتے ہوئے پاؤں زینوں کی جانب
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
یہاں پیر بھی آ چکے ہیں جواں بھی
تنو مند بیٹے بھی ابا میاں بھی
یہ بیوی بھی ہے اور بہن بھی ہے ماں بھی
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
مدد چاہتی ہے یہ حوا کی بیٹی
یشودھا کی ہم جنس رادھا کی بیٹی
پیمبر کی امت زلیخا کی بیٹی
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں ؟
بلاؤ خدایان دیں کو بلاؤ
یہ کوچے یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ
ثناخوان تقدیس مشرق کو لاؤ
ثناخوان تقدیس مشرق کہاں ہیں؟

تاج محل

تاج تیرے لیے اک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادیِ رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے
بزم شاہی میں غریبوں کا گزر کیا معنی ؟
ثبت جس راہ میں ہوں سطوت شاہی کے نشاں
اس پہ الفت بھری روحوں کا سفر کیا معنی
میری محبوب پس پردہ تشہیر وفا
تو نے سطوت کے نشانوں کو تو دیکھا ہوتا
مُردہ شاہوں کے مقابر سے بہلنے والی
اپنے تاریک مکانوں کو تو دیکھا ہوتا
اَن گنت لوگوں نے دنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے

لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی اپنی ہی طرح مفلس تھے
یہ عمارات و مقابر یہ فصیلیں یہ حصار
مطلق الحکم شہنشاہوں کی عظمت کے ستوں

سینۂ دہر کے ناسور ہیں کہنہ ناسور
جذب ہے ان میں ترے اور مرے اجداد کا خوں

میری محبوب انہیں بھی تو محبت ہوگی
جن کی صناعی نے بخشی ہے اسے شکل جمیل
ان کے پیاروں کے مقابر رہے بے نام و نمود
آج تک ان پہ جلائی نہ کسی نے قندیل
یہ چمن زار یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار یہ محراب یہ طاق
اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
میری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

گریز

مرا جنونِ وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسونِ زیبائی
ان آرزوؤں پہ چھائی ہے گردِ مایوسی
جنھوں نے تیرے تبسم میں پرورش پائی
فریب شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
سکون وخواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دِل و دماغ میں وحشت کی کار فرمائی
وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی
سُلا گئی تھیں جنہیں تیری ملتفت نظریں
وہ درد جاگ اٹھے پھر سے لے کے انگڑائی

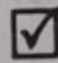
عجیب عالمِ افسردگی ہے رو بہ فروغ
نہ اب نظر کو تقاضا نہ دل تمنائی
تری نظر ترے گیسو تری جبیں ترے لب
مری اداس طبیعت ہے سب سے اکتائی

میں زندگی کے حقائق سے بھاگ آیا تھا
کہ مجھ کو خود میں چھپا لے تری فسوں زائی

مگر یہاں بھی تعاقب کیا حقائق نے
یہاں بھی مل نہ سکی جنت شکیبائی
ہر ایک ہاتھ میں لے کر ہزار آئینے
حیات بند دریچوں سے بھی گزر آئی

مرے ہر ایک طرف ایک شور گونج اٹھا
اور اس میں ڈوب گئی عشرتوں کی شہنائی
کہاں تلک کوئی زندہ حقیقتوں سے بچے
کہاں تلک کرے چھپ چھپ کے نغمہ پیرائی
وہ دیکھ سامنے کے پر شکوہ ایواں سے
کسی کرائے کی لڑکی کی چیخ ٹکرائی
وہ پھر سماج نے دو پیار کرنے والوں کو
سزا کے طور پر بخشی طویل تنہائی
پھر ایک تیرہ و تاریک جھونپڑی کے تلے
سسکتے بچے پہ بیوہ کی آنکھ بھر آئی
وہ پھر بکی کسی مجبور کی جواں بیٹی
وہ پھر جھکا کسی در پر غرور برنائی
وہ پھر کسانوں کے مجمع پہ گن مشینوں سے
حقوق یافتہ طبقے نے آگ برسائی
سکوتِ حلقۂ زنداں سے ایک گونج اٹھی
اور اس کے ساتھ مرے ساتھیوں کی یاد آئی
نہیں نہیں مجھے یوں ملتفت نظر سے نہ دیکھ
نہیں نہیں مجھے اب تاب نغمہ پیرائی

مرا جنون وفا ہے زوال آمادہ
شکست ہو گیا تیرا فسون زیبائی



شفیق فاطمہ شعریٰ

- نام شفیق فاطمہ تھا اور تخلص شِعرٰی۔
- شفیق فاطمہ نے اپنا تخلص قرآن شریف کے اس قطعہ 'اِنَّہٗ ھُوَ رَبُّ الشِّعرٰی' سے اخذ کیا ہے۔ شعریٰ ایک ستارے کا نام ہے جس کی لوگ پوجا کیا کرتے تھے۔
- شعریٰ کی پیدائش 17 رمئی 1930ء کو ناگپور میں ہوئی تھی۔
- شعریٰ کا انتقال 13 راگست 2012 کو حیدرآباد میں ہوا تھا۔
- شعریٰ کے والد کا نام سید شمشاد علی تھا اور والدہ کا ظفرالنسا بیگم جو شاعرہ تھیں۔
- شعریٰ کا آبائی وطن سہارنپور کا ایک گاؤں مادھوپور تھا۔
- شعریٰ کے پردادا سید قاسم شاہ افغانستان سے تلاش معاش کی خاطر ترک وطن کر کے ہندوستان آبسے تھے۔
- شعریٰ نے اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم اپنی والدہ سے، انگریزی کی تعلیم اپنے والد سے اور مراٹھی کی تعلیم اسکول میں حاصل کی تھی۔
- شعریٰ نے بی اے، بی ایڈ اور ایم اے پرائیویٹ طور پر کیا تھا۔
- شعریٰ حافظ قرآن بھی تھیں۔ انھوں نے خود کسی استاد کے بغیر اپنے شوق سے قرآن حفظ کیا تھا۔
- شعریٰ نے گیتا مراٹھی میں پڑھی تھی۔ انھوں نے نظم 'شفیع الامم' میں گیتا کی جانب اشارہ کیا ہے۔
- شعریٰ کی شادی 1965ء میں ہوئی تھی اور وہ اس کے بعد حیدرآباد گئی تھی۔ اس سے پہلے ناگپور اور اورنگ آباد میں۔
- شعریٰ نے آزاد کالج اورنگ آباد میں بطور لیکچرار معلمی کا فریضہ انجام دیا تھا۔
- شعریٰ نے 19 یا 20 سال کی عمر میں اپنی بڑی بہن کے لیے 'نذرانہ' کے عنوان سے نظم لکھ کر اپنی شاعری کی ابتدا کی تھی۔
- شعریٰ نے بچپن میں علامہ اقبال کی 'پیامِ مشرق' کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔
- شعریٰ کی باضابطہ شاعری کا آغاز 1952ء سے مانا جاتا ہے جب ان کی نظم 'فصیل اورنگ باد' رسالہ شاہراہ میں شائع ہوئی تھی۔
- بقول شعریٰ ظلم واستحصال کے ردعمل میں ان کی شاعری وجود میں آئی تھی۔
- شاعری میں شعریٰ کا کوئی مستقل استاد نہیں تھا بلکہ وہ اپنی نظموں کو شائع کرانے سے پہلے کسی بھی

ادیب یا شاعر کو دکھا لیتی تھی۔

- شعریٰ فارسی شعرا میں حافظ سے غایت درجہ متاثر تھی۔
- شعریٰ کی شاعری میں اجنتا اور ایلورہ کی گپھاؤں، ٹیپو سلطان، سیتا، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت یوسف علیہم السلام، شیام اور نند وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔
- شعریٰ نے شعری مجموعے 'آفاق نوا' میں شامل نظم 'فخر کا الاؤ' کو اپنے والد مرحوم کی یاد میں لکھی ہوئی نظم بتایا ہے۔
- شعریٰ نے اپنی نظم 'صدا بصحرا' کو ایک خودنوشت قسم کی نظم بتایا ہے۔

شعریٰ کے کارنامے

- شعریٰ کے چار شعری مجموعے ہیں: (1) گلۂ صفورہ (پہلا شعری مجموعہ) (2) آفاق نوا (3) کرن کرن یادداشت (4) سلسلۂ مکالمات

شعریٰ کی شامل نصاب نظمیں

بازیابی

ذرا سی رنجش بیجا
وہ گرداب بلا جس میں
سفینہ دل کا اب ڈوبا کہ جب ڈوبا

ذرا سا اک ہنکارا بھی ابھرنے کو بہت ہے
اے عزیز مصر

بہت آفت رسیدہ ہم
بہت آفت رسیدہ خاندان والے
دیارِ قحط سے لائے ہیں پونجی بھی بہت کم
تو جھکتا تول، پورا ناپ دے
کھاتہ کھرا لکھ، چھوٹ بھی دے وا جبی سچی
اگر کچھ چھوٹ دینے کی سکت ہے

اے عزیزِ مصر
پھر اس کے بدلے بھر بھر پلہ انواع جزا پا
مالک روزِ جزا سے اور ذخیرہ کر
یہی وہ موڑ تھا، ٹکرا کے ٹوٹا جس سے
صوم خامشی اس کا
تو سچ سچ کہہ دیا اس نے
یہ کذب و افتراء حاشا نہیں
دیکھو میں زندہ ہوں

ذرا سی دیر کو ارض و سما سناٹے میں آ کر
گلے ملتے ہیں
گرد آلود چہرے گرم اشکوں سے بھگوتے ہیں
سنبھلتے ہیں تو پھر چمک زنی کا دور چلتا ہے

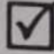
'اسے تو کھا گیا تھا بھیڑیا دشت اجل کا
پھر کہاں سے یہ نکل آیا،
فدا ہوتے ہیں عارض چومتے ہیں
ناگہاں کچھ یاد آتے ہی
بہکنے لگتے ہیں
دیکھو یہ اتنی دیر میں پھوٹا
ہمارے دل سے بڑھ کر دل ترا
پتھر صفت ہے
اے عزیزِ مصر

بازگشت

نغمہ زار درد کی جانب چلے ہم
ایک بھی ذرہ نہ کچلا جائے اس رفتار سے

نغمہ زار درد کی جانب چلے ہم
کنج میں پیڑوں کے سورج جھانکتا تھا
کوہساروں سبزہ زاروں میں جھمکتی روشنی کا جشن تھا
جشن جاری ہی رہے گا تا ابد
جاری رہے
نغمہ زار درد کی جانب چلے ہم
لعل و مرمر سے گندھا قالب
اور اس کے ماورا اس کے قریب
بجلیوں جیسا مصفیٰ اک وجود
چار سو بکھرے ہوئے خاموش سونے آسماں
ہم کہاں ہیں ہم کہاں۔ نغمہ زار درد ہے یہ (ہم کہاں)
اتنا بے آواز جیسے
آتما اپنی شعاعیں
ریشے ریشے سے بدن کے کھینچ لے
آہستگی سے بے گزند
اور دوری بے فغاں ہو جسم کی اور روح کی
کیا سبک رفتار کر دیتی ہے ہم کو بے دلی بے حاصلی
جیسے اک بادل کا ٹکڑا
اپنی چھاگل پھینک دے اونچی فضا میں
پیاسے ذروں کی طرف
پھر ہلکے پھلکے پنکھ پھیلائے، اڑے
ہلکورے لے
اک مٹتی بنتی رنگ کی تحریر سی
سیراب ذرے اس کو دیکھیں
اور پکار اٹھیں
وہ کافوری سا شعلہ، عظمت نارس!

دوام درد ہے وہ سرخ نرل روشنی
(لوسانس کے سرچشمے سوکھے ہر شکایت مٹ گئی)
کیا شکایت سانس کے سرچشمہ سے ان کو رہی
جو سانس لیتے ہیں یہاں؟
موج بے ہنگام خندہ
کیسے پھوٹی میرے لب سے
کوئی شکتی ہم میں ہے؟
جو یوں ہمیں پامال کر ہنس سکے!
یہ ہمیں آغاز ہی سے ختم کرنے پر تلی تھی
چاہے پھر خود ہی مجاور بن سکے انجام کار
احتجاج اس کا جو اک شکتی ہے مجھ میں
کس قدر پر شور ہے
کس قدر پرزور ہے
نغمہ زار درد سے آگے لیے جاتا مجھ کو
ان فضاؤں میں جہاں
بازگشت اک گیت بن جاتی ہے اس کی
جیسے سب ٹیلے چٹانیں اور کہستان
سانس کے چشمے میں شامل ہیں
دھڑکتے ذی نفس اور ہم نوا



Unit-5

اردو داستان اور ڈراما